وقت کے فاصلے



ہال کمرا مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر عمر کے لوگ تھے۔ جوان ' بوڑھے اور ادھیڑ عمر..... مرد ' عورتیں ' لڑکے اور لڑکیاں .... شادی شدہ بھی اور غیر شادی شدہ بھی۔ بچوں کا اس پارٹی میں کوئی کام نہیں تھا۔ موجود لوگوں کے درمیان قدر مشترک چہروں اور آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر تھرکتی مسکراہٹیں تھیں۔ عورتیں اور لڑکیاں جدید فیشن کے زرق برق لباسوں میں تھیں۔ مرد زیادہ تر سوٹ پہنے ہوئے تھے جبکہ لڑکے زیادہ تر جینز اور جیکٹ میں تھے۔ سب ہی خوش نظر آرہے تھے۔

مگر وہاں ایک تفریق بھی واضح نظر آرہی تھی۔ مشہور شعر ہے.... کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں جو باز ہے وہ زندگی کے پرانے کھلاڑیوں اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والوں کو سمجھ لیجئے، تو کبوتر کم عمر اور ناتجربہ کار لوگ قرار پائیں گے۔ اور اگر جنس کو صنف کے معنی میں لیا جائے تو اس شعر کے پہلے مصرعے پر اس طرح کی پارٹیوں میں کبھی عمل نہیں کیا جاتا لیکن دوسرے مصرعے پر پوری طرح عمل ہوتا ہے۔ کبوتر کبوتر کا ساتھ ڈھونڈتے ہیں اور اونچی پرواز کرنے والے شکاری باز ' باز ہی کو تلاش کرتے ہیں البتہ کہیں استثنا بھی ہوتا ہے۔ کوئی باز کبھی کسی کبوتر پر بھی جھپٹ پڑتا ہے مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو اس میں کبوتر کے اداؤں بھرے بلاوے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

بہر حال وہاں دو گروہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں گروہ متعدد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جوانوں نے ایک حصے پر قبضہ جما رکھا تھا، دوسرے حصے پر تجربہ کار افراد قابض تھے۔

مدیحہ کی وہ پہلی نیو ایئر پارٹی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے آج ہی کے دن وہ 18 سال کی ہوئی تھی اور سالگرہ کی پارٹی کے دوران میں ہی ممی نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ اب وہ بھی نیو ایئر پارٹی میں شریک ہو سکتی ہے۔ اس دن سے آج کی شام تک اس نے ایک ایک لمحہ

گن کر کاٹا تھا۔

نیو ایئر پارٹی مدیحہ کے لئے بہت عرصے سے ایک خواب کی طرح تھی جسے وہ کھلی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتی تھی۔ مگر یہ احساس بہر حال ہوتا تھا کہ وہ حقیقت نہیں ہے اور یہ احساس اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔

نیو ایئر اس کے لئے ایک تہوار کی طرح تھا جسے وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے دیکھتی آ رہی تھی۔ جیسے عید اور بقر عید ہوتی ہے۔ چھ بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی۔ ممی اور پاپا نے اولاد کے لئے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ 18 سال کا ہونے سے پہلے ان میں سے کوئی شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور کسی نیو ایئر پارٹی میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ خیر شراب سے تو مدیحہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ اسے بہت برا سمجھتی تھی۔ لیکن نیو ایئر پارٹی کو وہ ترستی تھی۔

ایک ایک کر کے تمام بڑے بہن بھائی نیو ایئر پارٹی میں شرکت کے حق دار بنتے گئے۔ دو سال پہلے ممتاز بھائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ پچھلے دو برسوں کی پہلی راتیں اس نے گھر پر اکیلے گزاری تھیں۔ سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے وہ لاڈلی بھی بہت تھی اس نے بڑا واویلا کیا لیکن اس معاملے میں اس کی ایک نہ چلی۔ پاپا اپنے اصول توڑنے کے بالکل قائل نہیں تھے۔

پچھلے کئی برسوں سے نیو ایئر نائٹ اس کے لئے اداسی لے کر آتی۔ وہ دوسروں کو لباس کا اور بہنوں کو بناؤ سنگھار کا اہتمام کرتے دیکھتی اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی۔ اس رات اس کے لئے بس ایک ہی خوشی ہوتی تھی۔ وہ نسرین کو فون کرتی اور اسے سال نو کی مبارک باد دیتی۔ نسرین سکول کے زمانے سے اس کی سہیلی تھی اور اب کالج میں بھی اس کے ساتھ ہی تھی سچ تو یہ تھا کہ نسرین اس کی واحد سہیلی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ کم آمیز ہو' وہ بہت سوشل تھی۔ ہر ایک سے ہنس کر ملتی تھی مگر گہرے تعلقات کم ہی ہوتے تھے۔

اس وقت وہ بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر جو مل گئی تھی۔ وہ چمکتی آنکھوں سے پارٹی کے شرکاء کو دیکھ رہی تھی۔ انکل نوید جوانوں کی ایک ٹولی میں جا ملے تو مسز رفیق نے فقرہ چست کیا۔ "اوہو.... سینگ کٹا کے بچھڑوں میں شامل ہو رہے ہیں لوگ۔"

انکل نوید نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور بڑی خوش دلی اور متانت سے بولے۔ "جی نہیں۔

چھوٹے سینگوں والا بیل، بچھڑوں کو اپنے مشاہدات اور تجربات سے مستفید فرما رہا ہے۔"

اس پر سب لوگ ہنس دیئے۔

سب لوگ ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں اضطراب بڑھ رہا تھا۔ مدیحہ نے کن انکھیوں سے دیواری گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے میں.... نیا سال شروع ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ سب کی کیفیت کو بغور دیکھتی اور محظوظ ہوتی رہی۔ وہاں موجود ہر شخص کی کوشش یہ تھی کہ خود وقت سے باخبر رہے اور دوسروں کو وقت کا احساس نہ ہونے دے۔ بظاہر سب باتوں میں مصروف تھے لیکن چپکے چپکے گھڑی دیکھے جا رہے تھے۔

"ہائے مدیحہ!" کسی نے بہت قریب سے کہا۔

مدیحہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بوبی تھا.... پاپا کے صنعت کار دوست کا بیٹا۔ نام تو اس کا بابر تھا مگر پیار سے سب اسے بوبی کہتے تھے۔ "ہائے بوبی!" مدیحہ نے خشک رسمی لہجے میں کہا۔ بوبی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی سالگرہ پارٹی میں بھی وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ "کیسے ہو؟"

"ویسا ہی ہوں' جیسے امیدوار ہوتے ہیں۔" بوبی نے لفنگے پن سے کہا۔

مدیحہ کے ساتھ کھڑی فرح نے ہنس کر پوچھا۔ "میونسپل کارپوریشن کا الیکشن لڑ رہے ہو؟"

"یہ تو اس سے بھی سخت مرحلہ لگتا ہے۔" بوبی نے مدیحہ کو تاکتے ہوئے جواب دیا۔

مدیحہ نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر دیواری گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے میں اب صرف ایک منٹ کم تھا۔ اس نے جلدی سے گھڑی سے نظریں ہٹا لیں۔ "اب میں دیکھ لوں گی کہ سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے۔" اس نے سوچا۔

سیکنڈ چپکے چپکے دبے پاؤں گزرتے رہے۔ پھر اس کے باوجود کہ مدیحہ اس کے لئے تیار تھی' اچانک ہی.... ہاں اچانک ہی اندھیرا.... گھپ اندھیرا ہو گیا۔ وہ عجیب ہی اچانک پن تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی ہر طرف سے ہیپی نیو ایئر کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر لمحہ بہ لمحہ آوازیں دبتی گئیں.... سرگوشیوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ لیکن وہ بے لفظ سرگوشیاں تھیں۔ مدیحہ کو وہ اچھی نہیں لگیں.... جیسے وہ گناہ گار سرگوشیاں ہوں۔

وہ اس بارے میں زیادہ نہیں سوچ سکی۔ گھپ اندھیرے میں کسی کا ہاتھ اس کے کندھے پر آ ٹھہرا.... یوں ٹٹولتے ہوئے جیسے کسی اندھے کا ہاتھ ہو۔ پھر اس کی گرفت میں سختی آئی اور وہ متحرک بھی ہو گیا۔

مدیحہ کو وہ لمس بہت گھناؤنا لگا۔ ایک لمحے کو وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت ہوئی۔ پھر اس نے اس ہاتھ کو سختی اور ناگواری سے جھٹک دیا۔ "ہٹاؤ ہاتھ، یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے سرگوشی میں برہمی کا اظہار کیا۔ لیکن بے لفظ سرگوشیوں کے ہجوم میں وہ بے حد مختلف.... بلکہ شاید بدرنگ سرگوشی تھی اور کم از کم اسے وہ بہت بلند آہنگ لگی۔ اسے لگا کہ وہ سرگوشی وہاں موجود ہر شخص کی سماعت تک پہنچی ہو گی۔

مگر ردعمل برعکس ہوا۔ اس کے دو ہاتھ اس کے کندھے پر آ جمے اور اسے ہم آغوشی کی طرف کھینچنے لگے۔ ساتھ ہی بپھری ہوئی سانسوں کی آواز قریب تر آتی گئی۔

اس نے پھر ہاتھوں کو جھٹکا.... پھر سرگوشی کی۔ "میں کہتی ہوں، ہٹ جاؤ"

اس بار سرگوشی میں جواب بھی ملا "او کم آن۔ لیٹ اس ویل کم دی نیو ایئر ود لو۔"

اس کی برداشت جواب دے گئی اس کا ہاتھ بپھری ہوئی سانسوں کی آواز کی سمت پوری قوت سے گھوما۔ اندازہ درست ثابت ہوا۔ چٹاخ کی زوردار آواز نے اعلان کیا کہ دراز دست کا رخسار اس کا ہدف بنا ہے۔

چند لمحے کو وہاں مکمل خاموشی ہو گئی.... خفت آمیز خاموشی۔ گناہ کار سرگوشیاں بھی معدوم ہو گئیں۔ پھر ایک مردانہ آواز ابھری۔ "یہ کس بے وقوف کا نیا سال شروع ہوا ہے۔"

اس پر دبے دبے قہقہے سنائی دیئے۔ "جو بھی ہے اب پورے سال ہی پٹتا رہے گا۔" ایک نسوانی آواز نے کہا۔

"بے چارہ۔"

"گدھا کہیں کا۔"

"شاید غلط فہمی کے نتیجے میں دھماکہ ہوا ہے۔" کسی نے خیال آرائی کی۔

"SOME YOUNG MOTH HAS TOUCHED AN OLD FLAME. I SUPPOSE."

کسی مرد نے تبصرہ کیا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" کوئی اور بولا۔ "کوئی جوان، نادان اور پرجوش پروانہ اندھیرے میں غلطی سے کسی چراغ سحری سے جا ٹکرایا ہے۔"

یہ انگریزی تبصرے کا آزاد ترجمہ تھا۔

"ایڈیٹ کہیں کا۔" کسی خاتون نے کہا۔

"خدا ایسا نیا سال کسی کو نہ دکھائے۔" کوئی مرد بولا۔

"پتا نہیں کون ہو گا؟"

"جو بھی ہو گا، الگ نظر آ جائے گا۔ رخسار کا میڈل تو چھپائے نہیں چھپتا۔"

اس پر پھر قہقہے لگے۔ مدیحہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ دراز دست وہاں سے کھسک گیا ہے۔ گناہ گاروں کے لئے اندھیرا بڑی نعمت ہوتا ہے۔

اسی لمحے روشنی ہو گئی.... اتنی ہی اچانک، جیسے اندھیرا ہوا تھا۔ ایک دم روشنی سے اندھیرا ہو جائے تو وہ گھپ اندھیرا ہوتا ہے، جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اسی طرح اندھیرے کے بعد ایک دم روشنی ہو جائے تو وہ اتنی تیز لگتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہاں بھی یہی ہوا۔ سب پلکیں جھپکاتے رہے لیکن نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یوں لوگوں کو اپنے لباس درست کرنے اور چہروں کے تاثرات تبدیل کرنے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ اس روشنی میں ہر شخص بڑے سلیقے اور تہذیب سے اپنی جگہ کھڑا ملا۔ جیسے اس وقفہ تاریکی میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

فرح نے مدیحہ کو بہت غور سے دیکھا اور معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "تو یہ تم تھیں۔ آواز بہت قریب کی تھی۔"

مدیحہ کو اس کی بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ "نہیں تو.... کوئی اور ہو گا۔" اس نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"خواتین و حضرات!" اسی وقت میزبان نے اناؤنس کیا۔ "حلق تر کرنے کے لئے ڈرنکس حاضر ہیں۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا، جہاں بھرے ہوئے جام رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ملازمین ٹرے ہاتھوں پر رکھے، ڈرنکس سرو کرنے لگے۔ ٹرے میں سینڈوچ بھی تھے۔

"حلق تر کرنے کے لئے کہنا زیادتی ہے مشتاق۔" ایک باوقار شخص نے اعتراض

کیا۔ "ہاں حلق خشک کرنے کے لئے کہو۔"

"اور ڈرنکس نہیں، سوفٹ ڈرنکس کہو۔" ایک خاتون ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولیں۔

میزبان کھسیا گیا لیکن اس نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔ "بہکنے والے کسی خاص مشروب کے محتاج نہیں ہوتے۔ جنہیں بہکنا ہو وہ کوکا کولا پی کر بھی بہک جاتے ہیں۔"

"ضرورت کے تحت بہکنے میں وہ مزہ کہاں جو سچ مچ بہکنے میں ہے۔" کوئی دل جلا بولا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" میزبان نے بے حد عاجزی سے کہا۔ "یہ آمریت کا کمال ہے کہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی میں حسب منشاء آپ کی تواضع نہیں کر سکتا۔"

"ہاں بھئی' ایک فرد واحد نے ہم جیسے لاکھوں کو اس خوشی سے محروم کر دیا۔" ایک مہمان نے دل گیر لہجے میں کہا۔

"خیر.... کوشش کی جائے تو انفرادی طور پر خوشی اب بھی مل جاتی ہے۔" ایک اور مہمان نے دل جوئی کی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے لئے بندوبست کر کے آئے ہو۔" پہلا اعتراض کرنے والا اس مہمان کی طرف مڑا۔ وہ مہمان فخریہ انداز میں مسکرایا۔ اب سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

"ہمیں بھی ایک جام کی دعوت دے دو زبیر!" اس سے فرمائشیں ہونے لگیں مگر لہجوں اور انداز میں سنجیدگی نہیں تھی۔ سب گویا اسے خوش کر رہے تھے مگر کچھ نظریں للچائی ہوئی بھی تھیں۔

مدیحہ نے ایک سینڈوچ لیا' کوکا کولا کا جام سنبھالا اور ہال سے نکل آئی۔ وہاں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ باہر لان میں درخت کے نیچے پڑی ایک بنچ پر جا بیٹھی۔ بھوک کا احساس اچانک ہی ہوا تھا۔ وہ سینڈوچ کے بائٹ کے ساتھ کوکا کولا کے سپ لیتی رہی۔ باہر خنکی تھی مگر سردی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ خاصا گرم سویٹر پہنے ہوئے تھی۔

اچانک اس نے بوبی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہوا اور ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"یہ بنچ میرے نام الاٹ نہیں ہے۔" مدیحہ نے خشک لہجے میں کہا۔ بوبی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ "الاٹ تو تم بھی کسی کے نام نہیں ہو۔"

"گھٹیا بات کی ہے آپ نے۔ میں بچی نہیں' جیتی جاگتی عاقل و بالغ لڑکی ہوں۔" مدیحہ کے لہجے میں کاٹ تھی پھر اچانک ہی وہ بولی۔ "وہ تم ہی تھے ناں؟"

"کون؟" بوبی گڑبڑا گیا مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "وہ تو میں نہیں تھا مگر وہ شاید تم ہی تھیں۔"

مدیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اس کے بائیں رخسار کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بوبی کھسیا گیا "تمہیں دیکھ کر جذبات کی سرخی چہرے پر آگئی ہوگی۔" چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق بوبی نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔

"میں نے تو کچھ نہیں پوچھا آپ سے۔" مدیحہ نے معصومیت سے کہا۔ "ویسے جذبات کی یہ سرخی صرف بائیں جانب ہے۔"

"دل بھی تو لیفٹ سائیڈ پر ہوتا ہے۔" بوبی نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

"مگر داہنے ہاتھ کا رشتہ بائیں رخسار سے ہی ہوتا ہے اور میں لیفٹی نہیں ہوں۔" مدیحہ نے چوٹ کی۔

"تم عجیب لڑکی ہو۔" بوبی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اسی لئے زیادہ اچھی لگتی ہو۔" اس نے کہا پھر ایک طرف چلا گیا۔

مدیحہ نے سکون کی سانس لی۔ اس نے خالی پلیٹ اور گلاس بنچ پر رکھا اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ سچی بات یہ تھی کہ اسے اس پارٹی سے مایوسی ہوئی تھی۔ "تو یہ ہے وہ نیو ایئر پارٹی جس کے لئے میں ترستی تھی۔" اس نے خود کلامی کی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے یہ بات بلند آواز میں کہی ہے۔

"چار سال پہلے پارٹیاں ایسی نہیں ہوتی تھیں۔" کسی نے جواب دیا۔ مدیحہ چونکی اس نے سر گھما کر دیکھا بوبی نہ جانے کب بنچ کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تب جاموں میں سچ مچ کی شراب ہوتی تھی' کوکا کولا نہیں۔" بوبی نے مزید کہا۔ "اس وقت تمہیں مایوسی نہ ہوتی۔ یہ جو کچھ ہے' جنرل ضیاء کی مہربانی ہے۔"

"میں جنرل ضیاء کی شکر گزار ہوں۔" مدیحہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

بوبی بھونچکارہ گیا۔ "کیا مطلب؟"

"میں نے تو یہاں لوگوں کو بغیر شراب کے بہکتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو اور برا حال ہوتا ہوگا۔" مدیحہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت میں اور زیادہ مایوس ہوتی۔" پھر وہ اٹھی اور اندر جانے کے لئے صدر دروازے کی طرف چل دی۔

تو یہ ہے نیا سال۔ اس بار اس نے دل میں سوچا۔ 80ء رخصت ہوا۔ 81ء آگیا۔ مگر کتنی بے ہودگی کے ساتھ شروع ہوا ہے یہ سال۔ اس وقت اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سال اس کی زندگی کے اہم ترین سالوں میں سے ہے۔ اور اس کی زندگی کے دو اہم ترین دنوں میں یہ پہلے ایک دن کا آغاز ہوا ہے۔

دوسرے اہم ترین دن کو بہت بعد میں آنا تھا۔

☆

"لو بیٹے۔ بس ایک گھونٹ اور ہے۔" حمید احمد نے پہلو میں بیٹھے ہوئے بیٹے کے ہونٹوں سے دودھ کا گلاس لگاتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے پی لو۔"

"بس ابو!" وحید ٹھنکنے لگا۔

"پی لو!" حمید احمد نے اصرار کیا۔

وحید نے ایک گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا اور دوسری کرسی پر رکھے کتابوں کے بستے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت باہر سے اسکول کی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اسے سنتے ہی وحید کے انداز میں عجلت آگئی۔ اس نے جلدی سے بستہ کندھے پر لٹکایا اور حمید احمد کے رخسار پر بوسہ دیا۔ "خدا حافظ ابو!"

"خدا حافظ بیٹے!"

وحید کے جانے کے بعد حمید احمد اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ناشتے سے نمٹا ہی تھا کہ اماں چائے لے آئیں۔ "آپ بھی تو ناشتا کرلیں اماں!" اس نے اماں سے کہا۔

"تمہارے جانے کے بعد سکون سے کروں گی۔"

"تو میرے جانے کے بعد گھر میں سکون ہو جاتا ہے؟" حمید نے انہیں چھیڑا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے تو سناٹا برا لگتا ہے۔ اسی سے گھبرا کر تو تمہارے پاس آگئی ہوں۔" اماں نے اداسی سے کہا۔

میں تو یونہی کہہ رہا تھا اماں!" حمید شرمندہ ہوگیا۔ "بس جی چاہتا ہے کہ ناشتہ آپ ہمارے ساتھ ہی کیا کریں۔"

"ممکن نہیں ہے نا بیٹے۔ صبح افراتفری ہوتی ہے۔ ناشتہ لگا کر وحید کی کتابیں بستے میں رکھتی ہوں۔ پھر تمہارے لئے پراٹھا ڈالتی ہوں۔ ایک ساتھ ناشتہ کرنا ممکن نہیں ہے بیٹے!"

"کوئی تکلف تو نہیں کرتیں نا آپ؟" حمید نے پوچھا۔ کہتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہ بھی غیر ضروری ہے۔ اماں کو نو سال ہوگئے تھے اس کے گھر میں۔ وہ تکلف کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اماں کیا جواب دیں گی اور وہ جواب سننا اسے اچھا لگتا تھا۔

"یہ تو میرا اپنا گھر بن گیا ہے بچے! تم نے اتنی عزت دی ہے مجھے۔" اماں نے بہت محبت سے کہا۔ "اولاد کو تو ساری زندگی ترستی رہی میں۔ اللہ نے کرم فرمایا کہ بیٹا اور پوتا ایک ساتھ دے دیا مجھے۔" وہ کہتے کہتے رک گئیں پھر خفگی سے بولیں۔ "ایسی بات نہ کیا کرو۔ دوپہر اور رات کا کھانا تمہارے ساتھ بیٹھ کر ہی کھاتی ہوں میں۔"

"ہاں جانتا ہوں۔" حمید نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ دوپہر کو میرے انتظار میں بھوک برداشت کرتی رہتی ہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" اماں نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر بڑے خلوص سے کہا۔ "مجھ اکیلی کو اس نے یہ خوشی بھی دی کہ کسی کے انتظار میں بھوک برداشت کروں۔"

حمید نے سر جھکا کر اخبار پر نظریں جما دیں۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اماں کی محبت تھی ہی ایسی۔ شکر تو اسے ادا کرنا چاہئے تھا اور وہ ادا کرتا بھی تھا۔

نہ جانے کون سی ایسی نیکی کی تھی اس نے کہ اسے اپنے اور اپنے بچے کے لئے اتنی محبت مل گئی تھی۔

سر جھکا کر وہ سمجھ رہا تھا کہ اماں سے چھپ گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اماں اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حمید نے کہا۔ "کھانے پر یاد آیا اماں! آج دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار مت کیجئے گا۔ وحید کے ساتھ کھا لیجئے گا۔"

"کیوں.... کیا رات کو آؤ گے؟"

"نہیں، لیکن بہت زیادہ دیر بھی ہو سکتی ہے۔ میرا تبادلہ ہوا ہے نا اماں۔ نئے کالج میں آج

میرا پہلا دن ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔"

مگر حمید کو معلوم تھا کہ اماں اس کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گی۔ نو سال میں اب تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ "کھانا ضرور کھا لیجئے گا اماں!" اس نے دہرایا۔

"دیکھوں گی۔ کیا پتہ تم جلدی ہی آ جاؤ اللہ کے حکم سے۔"

"حمید جانتا تھا کہ اصرار سے کچھ ہونے والا نہیں۔ اماں کے دماغ میں جو آئے گا' کریں گی۔ وہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند لمحے بعد اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں موجود نہیں تھیں اس نے انہیں پکارا۔ "اماں.... اماں' یہاں تو آئیں۔"

"ابھی آئی بیٹے!"

حمید کو افسوس ہونے لگا پکارنے پر۔ شاید اماں ناشتہ کر رہی ہوں گی۔ خواہ مخواہ پان کے لئے اماں کا ناشتا خراب کیا۔

مگر چند لمحوں کے بعد اماں نمودار ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں پان کی تھالی تھی جس پر اس کا پان رکھا تھا۔ "کیا بات ہے بیٹے؟" اماں نے تھالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں اماں!" حمید نے گہری سانس لے کر کہا اور پان اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ "پان کے لئے ہی آواز دی تھی آپ کو۔"

"میں تمہارے لئے پان لگانے ہی تو گئی تھی۔" اماں مسکرائیں۔ "بھول کیسے سکتی ہوں۔ دن میں دو ہی تو پان کھاتے ہو تم۔ ایک ناشتے کے بعد، دوسرا رات کے کھانے کے بعد۔ پتہ نہیں کھاتے کیوں ہو۔ عادی تو ہو نہیں میری طرح۔"

حمید مسکرا دیا' یہ پان کہاں ہیں اماں! یہ تو دو لقمے ہیں تمہاری محبت کے۔' اس نے دل میں کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اخبار ایک طرف رکھ کر اٹھا اور کپڑے بدلنے کے لئے چلا گیا کپڑے بدل کر آیا تو اس نے اماں سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اماں!"

"جاؤ۔ اللہ خیر سے گھر لائے...." اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

حمید گھر سے نکل آیا.... اماں کو سوچوں اور یادوں میں گھرا چھوڑ کر۔

☆

بلقیس بیگم جب بھی گزری ہوئی زندگی کو پلٹ کر دیکھتیں تو ان کا رواں رواں رب کا شکر ادا کرنے لگتا۔ کتنا نوازا تھا اللہ نے انہیں۔ جو کچھ دیا' بہترین دیا۔ ہر مشکل سے بچائے رکھا' ہر آزمائش میں سرخرو کیا۔ زندگی میں ہمیشہ عزت عطا کی' ذلت سے بچائے رکھا۔

یہ شکر ان کی شخصیت کا جزو اعظم تھا۔ انہیں اپنی محرومیوں کا کبھی خیال نہیں آتا تھا۔ محرومیوں کے حوالے سے انہوں نے دکھ بھی کبھی نہیں کیا۔ اب دکھ چپکے سے کہیں گہرائی میں دبک کر بیٹھ جائے اور اپنی موجودگی کا احساس بھی نہ ہونے دے تو کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ جس کا دکھ ہو وہ تو اس پر بھی نہیں کھلتا۔

بلقیس بیگم اچھے' شریف اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ محبت کرنے والے ماں باپ اور بہن بھائی ملے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا' ہر نعمت میسر تھی' کبھی کوئی محرومی نہیں دیکھی۔ قرآن پڑھنے کے علاوہ انہیں اتنی تعلیم ضرور ملی کہ اردو وہ اچھی طرح لکھ اور پڑھ سکتی تھیں۔ 20 سال کی ہوئیں تو ان کی شادی ہو گئی۔ اب یہ خوش نصیبی ہی تو ہے کہ شوہر انہیں بہت اچھا ملا۔ صابر علی سچ مچ بہت صبر والے تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے اور ان سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔

شادی کو دو سال ہوئے تھے کہ اللہ نے ایک اور کرم فرمایا اور مسلمانوں کو ایک وطن دے دیا.... پاکستان۔ صابر علی نے سب کچھ چھوڑا اور انہیں لے کر پاکستان چل دیئے۔ سب کچھ اتنی افراتفری میں ہوا کہ آتے وقت گھر والوں سے بھی نہ مل سکیں۔ سسرال دہلی میں تھی اور میکہ میرٹھ میں۔ اور اتنی مہلت نہ تھی کہ وہ میرٹھ جا سکتے لیکن یہ اطمینان تھا کہ پاکستان میں ملاقات ہو جائے گی۔ ابا میاں بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

بلقیس بیگم کو معلوم نہیں تھا کہ پاکستان پہنچنے سے پہلے آگ اور خون کا ایک سمندر بھی پار کرنا ہے۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس نے ان کے وصف شکر گزاری کو اور جلا بخشی۔ انہوں نے جان لیا کہ انسان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

امرتسر اور لاہور کے درمیان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والوں کی اس ٹرین پر بھی حملہ ہو گیا جس میں وہ لوگ سفر کر رہے تھے۔ بلقین بیگم کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ٹرین اچانک روک دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مظلوموں کی چیخ و پکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جلد ہی وہ چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔

صابر علی کی پوری فیملی ساتھ ہی سفر کر رہی تھی۔ چیخوں کی آواز سنتے ہی ڈبے میں ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی۔ صابر علی اضطراب کے عالم میں اٹھے اور انہوں نے بلقیس بیگم پر ایک نگاہ ڈالی وہ نگاہ ایک پوری داستان کہہ رہی تھی۔ بہت بلیغ گفتگو تھی وہ۔ بلقیس بیگم نے اس کا ایک ایک لفظ سمجھ لیا اور ان کی جوابی نگاہ نے صابر علی کے چہرے پر طمانیت کا رنگ دوڑا دیا۔

اسی وقت بلوائیوں نے ان کی بوگی کے دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ ڈبے میں موجود تمام مرد حرکت میں آ گئے۔ وہ مسلح حملہ آوروں سے مقابلے کے لئے ہتھیار ڈھونڈ رہے تھے اور طمنچوں، کرپانوں، تلواروں اور بلموں سے مقابلے کے لئے ان کے پاس تھا کیا ....؟ کوئی ڈنڈا، سبزی کاٹنے والی چھری یا گھریلو استعمال کی کوئی ایسی ہی چیز! بس وہ تو جذبہ ایمانی تھا، جو رب کریم ضرورت کے وقت مسلمانوں کو از خود عطا فرما دیتا ہے۔ یقینی موت کا سامنا کرنے والے ان مردوں کے چہروں پر خوف کی زردی نہیں تھی وہ تو شوقِ شہادت میں تمتما رہے تھے۔

نوجوان عورتیں اور لڑکیاں چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ بوڑھی عورتیں خود کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر رہی تھیں۔ وہ لڑکیوں کو اپنی اوٹ میں چھپا رہی تھیں۔ یہ ان کے لئے بھی جنگ تھی۔ ناموس کی حفاظت کی جنگ!

ڈبے کا دروازہ کتنی مزاحمت کر سکتا تھا۔ وہ کھلنے والا تو نہیں تھا لیکن اس پر مسلسل کلہاڑی کی ضربیں پڑ رہی تھیں۔ ذرا دیر میں اس کے پرخچے اڑ گئے۔ بلقیس بیگم کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ صابر علی وہاں سب سے آگے تھے اور یہ دیکھ کر بلقیس بیگم کا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ پہلا نعرۂ تکبیر صابر علی نے ہی بلند کیا تھا یہی نہیں، ڈبے میں گھسنے والے پر اعتماد اور مغرور بلوائیوں پر اٹھنے والا پہلا ہاتھ بھی انہی کا تھا۔ ان کے پاس ڈنڈا تھا۔ وہ انہوں نے سب سے پہلے اندر گھسنے والے پہلے بلوائی کے سر پر پوری قوت سے مارا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بہت تیز رفتاری سے ہوا۔ بلقیس بیگم نے صابر علی کو .... اور ایک لمحے کے بعد بہت سے مرد مسافروں کو زخم کھا کر گرتے دیکھا۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ انہوں نے دل میں کہا اب آبرو کی خاطر جان دیتے ہوئے میں بالکل نہیں ہچکچاؤں گی۔ جب وہ ہی نہیں رہے تو....

انہیں اپنی ساس پر بے تحاشا پیار آیا جو اپنی جوان بیٹیوں کی فکر چھوڑ کر انہیں اپنی اوٹ میں چھپائے کھڑی تھیں۔

نہتے مسافروں کی وہ مزاحمت بے حد مختصر تھی۔ لمحوں میں ڈبا کراہوں، چیخوں، نعروں اور لاشوں سے بھر گیا۔ طمنچوں کی آوازیں بھی تھیں۔ ایسی ہی ایک آواز کے ساتھ بلقیس بیگم کی ساس ان پر گریں۔ اچانک پن کی وجہ سے بلقیس بیگم سنبھل نہیں سکیں۔ وہ دونوں سیٹوں کے درمیان گریں۔ ان کے اوپر ان کی ساس کا بے جان جسم گرا۔ گرتے ہوئے شاید ان کا سر سیٹ سے ٹکرا گیا تھا۔ درد کی شدید لہر اٹھی انہیں چہرے پر بہتے ہوئے خون کے چپچپے پن کا احساس ہوا۔ پھر ان کا ذہن اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ انہیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ ہوش آیا تو ان سے سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ہوش میں بھی آئی تھیں کیونکہ سر اب بھی بری طرح دکھ رہا تھا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے اوپر اتنا بوجھ کیسا ہے۔ ذرا دیر بعد وہ سمجھیں کہ ان کے اوپر صرف ان کی ساس ہی نہیں ہیں۔ ساس کے اوپر بھی کچھ عورتیں گری تھیں۔ یعنی وہ کئی لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔

وہ کراہتے ہوئے کسی کو پکارنا چاہتی تھیں مگر عین وقت پر انہوں نے کراہ ضبط کر لی بلکہ سانس بھی روک لی۔ کچھ بلوائی تھے جو نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو تلاش کر رہے تھے۔ "اوئے .... نیچے گرا کے دیکھ کوئی رس بھری ہو گی ضرور۔" کسی سکھ کی کرخت آواز سنائی دی۔

"نیچے نہیں گرا سکتا۔" دوسرے نے کہا لہجے میں بے بسی تھی۔ "او یہ تو سیٹوں کے بیچ میں پھنس گئی ہیں۔ ہلتی بھی نہیں ہیں۔"

"اور سب توں نیچے کوئی بڑھیا ہے.... مردہ۔" تیسری آواز بہت قریب سے آئی۔

بلقیس بیگم دہل کر رہ گئیں۔ ڈھونڈتی ہوئی نگاہیں ان کی ساس تک پہنچ گئی تھیں۔ کہیں انہیں بھی نہ دیکھ لیں۔

"اوئے بڑھیا کے نیچے بھی نظر مار۔" پہلے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بلقیس بیگم کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ انہیں ڈر لگا، دل دھڑکنے کی آواز عزت کے لٹیروں تک پہنچ جائے گی مگر اسی وقت کسی نے پکار کر کہا۔ "اوئے بھاؤ.... جلدی کرو، فوجیوں کے ٹرک آ رہے ہیں۔"

"چھڈ یار نکل لو اب۔" پہلی آواز نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی لپک کر دور ہوتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور دھیرے دھیرے سناٹا پھیلتا گیا۔

بلقیس بیگم نے اٹھنے کی کوشش کی.... کرتی رہیں لیکن ہل بھی نہ سکیں یہاں تک کہ ڈبہ مہربان آوازوں، مشتعل لہجوں اور پرجوش فوجیوں سے بھر گیا۔

وہ پاک وطن کے فوجی تھے۔ لاشوں کے انبار تلے سے زندہ سسکتے لوگوں کو انہوں نے نکالا تھا۔ لاشوں کے نیچے دبے ہوئے ان زندہ لوگوں میں بلقیس بیگم ہی نہیں تھی صابر علی بھی تھے مگر بلقیس بیگم کو اس وقت اس بات کا پتا نہیں چلا۔

اگلا مرحلہ پناہ گزینوں کے کیمپ میں رہنے کا تھا۔ وہاں بلقیس بیگم نے بے لوث خدمت کرنے والے دیکھے۔ وہاں کوئی کسی کو حسن و جوانی کے حوالے سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہاں مظلوم بس مظلوم تھا.... بلا کسی تفریق کے۔ وہاں دکھوں کا مداوا کرنے کی، دل جوئی کرنے کی، زخموں پر مرہم رکھنے کی پر خلوص کوشش کی جاتی تھی۔

بلقیس بیگم وہ سب کچھ دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ "واہ.... یہ ہے نا اللہ کی پاک زمین۔" انہوں نے زیر لب کہا۔ "جہاں اللہ کے بندے رہتے ہیں۔ جہاں اس کے احکامات پر عمل ہوگا۔ جہاں اس کے منصف مزاج، متقی بندوں کی حکومت ہوگی۔"

بلقیس بیگم اکیلی تھیں۔ پھر بھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ اس نے ان کے شوہر کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اسی وجہ سے وہ مطمئن اور پرسکون تھیں۔ یہ شکر گزاری نہ ہوتی تو وہ شدت غم سے پاگل ہو جاتیں۔ کہاں تو وہ اپنے بھرے پرے گھر میں رہتی تھیں اور کہاں یہ کیمپ، جہاں ان کے اپنوں میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ بس وہ وہاں ہر روز صبح و شام قرآن پاک کی تلاوت کرتیں، پانچ وقت کی نماز پڑھتیں، جو مل جاتا کھالیتیں اور رات کو نیند نہ آتی تو اللہ کی پاکی کا ذکر کرتیں، تسبیح پڑھتیں۔

پھر ایک دن کیمپ میں صابر علی ان سے آملے۔ وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوئے تھے۔ بلقیس بیگم کو لگا کہ ان کے آنگن میں پھر سے بہار آگئی ہے۔ وہ تو انہیں صبر کر بیٹھی تھیں۔

"آپ کو میرا پتہ کیسے چلا؟" بلقیس بیگم نے ان سے پوچھا۔

"میں تمہارے لئے پریشان رہتا تھا۔ پہلے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں خدانخواستہ...." صابر علی

خاموش ہوگئے۔ بات نامکمل چھوڑ دی۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔ "پھر میں نے فہرستیں چیک کرائیں۔ ان میں تمہارا نام نہیں تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ تم یہاں ہو۔ تب میری پریشانی کی نوعیت تبدیل ہوگئی۔"

"کیا مطلب؟"

"پھر میں یہ سوچتا تھا کہ تم میرے لئے کتنی پریشان ہوگی۔"

"لیکن میں آپ کی طرف سے پریشان نہیں ہوئی۔"

صابر علی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولے۔ "کیوں بھئی؟" ان کے انداز میں شکایت تھی۔

"میں نے ڈبے میں آپ کو زخم کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے ہر لمحے میں اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ آپ کو شہادت نصیب ہوئی۔" بلقیس بیگم نے سادگی سے کہا۔

صابر علی کو بیوی پر فخر ہونے لگا۔ وہ بھی انہی کے انداز میں سوچتی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ "تو اب تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا۔"

"میں اب بھی اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں۔" بلقیس بیگم کے لہجے میں عجیب سی معصومیت تھی۔

"اس پر کہ میں شہادت سے محروم ہوگیا؟ ارے یہ تو افسوس کا مقام ہے۔"

"جی نہیں۔ اس پر کہ اللہ نے آپ کو غازی کا رتبہ عطا فرمایا۔ زندگی بھی بڑی نعمت ہے۔"

صابر علی اس جواب پر بہت خوش ہوئے۔ جو لوگ شکر ادا کرنے والے ہوں، اللہ انہیں بصیرت دے دیتا ہے۔ وہ دیکھ سکتے ہیں اور دیکھ اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہر بات پر اللہ کا شکر واجب ہے.... کسی چیز کے ملنے پر بھی اور نہ ملنے پر بھی۔ کیونکہ اللہ ہمیشہ اپنے بندوں کے لئے بہتری فرماتا ہے۔

"اور باقی لوگوں کا پتہ چلا؟" بلقیس بیگم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ساس کے متعلق تو انہیں خود بھی معلوم تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ سب شہید ہوگئے۔" صابر علی کے لہجے میں ہلکا سا دکھ تھا۔ "اللہ کیسا کریم ہے۔ وہ جو چاہے، جسے چاہے عطا کر دے۔ جس کے پاس جہاد کی طاقت نہ ہو، وہ اسے بھی شہادت عطا کر دیتا ہے، شکر ہے اس کا۔ کریمی ہے اس کی۔"

"مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟" بلقیس بیگم آس کی ڈور چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ "آپ تو ہسپتال میں تھے۔"

"اور ہسپتال سے سیدھا یہاں آرہا ہوں۔" صابر علی نے کہا۔ "مجھے ہسپتال میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری بوگی میں صرف تم اور میں بچے ہیں۔ باقی سب شہید ہو گئے۔"

ان لوگوں نے چند اور دن مہاجروں کے کیمپ میں گزارے۔ پھر وہ کراچی آگئے۔ اللہ کا کرم ان کے ساتھ تھا۔ صابر علی پڑھے لکھے تھے۔ زیر تعمیر ملک اور قوم کو ان جیسوں کی ضرورت تھی۔ انہیں اچھی سرکاری ملازمت مل گئی۔

بلقیس بیگم کو اپنے گھر والوں کی فکر بھی تھی اور ان سے ملنے کی امید بھی۔ مگر ایک ماہ بعد یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ قربانی کے معاملے میں وہ صابر علی سے پیچھے نہیں رہی تھیں۔ ان کے گھر والوں میں سے بھی کوئی نہیں بچا تھا۔

انہوں نے سرد آہ بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسے دیگچی میں ڈال کر گرم کرنے کے لئے چولہے پر رکھ دیا۔

☆

"میں شہریت پڑھاتا نہیں ہوں، سکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" حمید احمد نے اپنے نئے کالج کے پرنسپل سے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ذرا وضاحت کریں۔" وہ حمید احمد سے کافی متاثر نظر آرہے تھے۔

اسی لمحے چپڑاسی نے چائے لا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔ "شکریہ!" حمید احمد نے چپڑاسی سے کہا۔ پھر وہ دوبارہ پرنسپل صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ "بات یہ ہے جناب کہ اس مضمون کی اصل افادیت مطالعے میں نہیں، اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔" انہوں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ "اس مضمون کا مقصد طالب علم کو یہ بتانا ہے کہ معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ لہٰذا ہر فرد اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ فرد معاشرے کی عمارت پر لگی اینٹ کی طرح ہے۔ اینٹ ذرا بھی ٹیڑھی لگے گی تو عمارت میں کمی ضرور آئے گی اور بھدا پن بھی ضرور آئے گا۔ فرد کا کوئی بھی عمل صرف اس تک محدود نہیں رہتا، پورے معاشرے پر اثرانداز ہوتا ہے۔ یہ مضمون بتاتا ہے کہ اچھا شہری کیا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد طالب علم کو اچھا شہری بننے کی تعلیم اور ترغیب دینا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ میرے شاگرد اچھے شہری بنیں۔ صرف اپنے حقوق کی فکر نہ کریں۔ بلکہ اپنے فرائض کو اولیت دیں۔ اگر سب لوگ ایسا کرنے لگیں تو حقوق کا مسئلہ ہی نہ رہے کیونکہ ہر شخص کے حقوق دراصل دوسروں کے فرائض ہوتے ہیں۔"

"بہت دلچسپ تھیوری ہے۔" پرنسپل صاحب نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

"تھیوری نہیں، یہ تو خالص عملی بات ہے۔" حمید احمد نے زور دے کر کہا۔ "مثلاً استاد کی حیثیت سے عزت اور احترام میرا حق ہے لیکن میری عزت کرنا میرے طلبا اور طالبات کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کا خیال رکھیں گے تو میرا یہ حق کبھی مسئلہ بنے گا ہی

نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" پرنسپل صاحب نے کہا۔ "لیکن میرا نظریہ یہ ہے کہ ہمیں نئی نسل کو بہتر.... بلکہ بہترین پاکستانی بنانے پر زور دینا چاہئے۔"

"یہ تو مرحلے ہیں۔ جو اچھا شہری بنے گا' وہ اچھا پاکستانی بھی بنے گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر مرحلوں پر مجھے یاد آیا کہ معاشرے میں پہلی درس گاہ گھر ہوتا ہے۔" پہلے مرحلے میں اچھا بیٹا' اچھا بھائی یا بہن اور اچھا پڑوسی بننا ہوتا ہے اور اس مرحلے پر استاد کا اختیار نہیں۔ گھر میں اچھی تربیت نہ کی جائے تو میں اور آپ کیا کرلیں گے۔"

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" حمید احمد نے پرجوش لہجے میں کہا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ پرنسپل صاحب انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "دیکھیں' پہلی درس گاہ تو ماں کی گود ہوتی ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ خاندانی پس منظر کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرف سے کمزوری کے باوجود ایسے بچے دنیا میں بڑے آدمی بنے ہیں۔ انہوں نے مختلف میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کیسے؟ جناب! تعلیمی اداروں کی افادیت یہی ہے کہ گھر میں تربیت کی کمی کو پورا کیا جائے۔ گھر میں صرف آداب سکھائے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں انہیں علم کی روشنی میں درست ثابت کر کے طالب علم کے اندر اتارا جاتا ہے۔ آزمائش تو گھر کے باہر ہوتی ہے اور گھر کے باہر بے حد وسیع و عریض دنیا ہے' جہاں ترغیبات بھی ہوتی ہیں اور مصلحتیں بھی۔ آدمی اپنا مفاد... چھوڑ دیتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز ہو تو فائدے کو ٹھوکر مار کر نقصان گوارا کرلیتا ہے۔ یہ تعلیمی اداروں کا فیض ہے۔ گھر میں جتنی کمی رہ جائے' اسے پورا کرنا استاد کی ذمہ داری ہے اسی لئے تو استاد کو باپ کا درجہ دیا جاتا ہے اور تعلیمی ادارے کو طالبِ علم کا دوسرا گھر کہا جاتا ہے۔"

"صرف پڑھانے سے کچھ نہیں ہوتا حمید صاحب! استاد جو کچھ پڑھاتا ہے' اس پر عمل کر کے نہ دکھائے تو سب رائیگاں ہو جاتا ہے۔ ماں باپ اور اساتذہ رول ماڈل ہوتے ہیں' آئیڈیل ہوتے ہیں' بچوں کے۔ ان میں نفاق نظر آئے تو زیرِ تعمیر شخصیت میں کجی رہ جاتی ہے۔"

"میں جو پڑھاتا ہوں' اس پر عمل کر کے بھی دکھاتا ہوں۔" حمید احمد نے زور دے کر کہا۔ "میرے تمام طلبا اور طالبات بلا تفریق میرے لئے اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا

ہوں کہ ملک اور قوم کے مستقبل کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہوں۔ ایک ادنیٰ معمار ہوں میں۔ لیکن اپنی جگہ بہت اہم بھی ہوں۔ میں تمام معاشرتی قدروں کا پورا احترام کرتا ہوں۔ اپنے تمام فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں اور میں بشر ہوں جناب! تمام بشری کمزوریاں مجھ میں بھی ہیں لیکن میں ہر وقت اپنے منصب پر نظر رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے اپنے اندر ابھرنے والی' اپنی شخصیت اور کردار میں نظر آنے یا نمودار ہونے والی ہر بشری کمزوری سے پوری طاقت سے لڑتا ہوں۔"

پرنسپل صاحب نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔ "یہ رسمی بات نہیں ہے حمید صاحب۔ مجھے واقعتاً آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کالج کے لئے ہی نہیں' پوری قوم کے لئے قیمتی اثاثہ ہیں۔ اس قوم کو انہی جذبوں کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں پوری توانائی کے ساتھ نئی نسل کو سونپ دیں۔"

"شکریہ انوار صاحب! میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہوں۔"

"روسٹر تو آپ کو مل ہی گیا ہے۔ بس اب آپ اپنی ذمے داری سنبھال لیں۔ گیارہ بجے سیکنڈ ایئر کی پہلی کلاس آپ کو لینی ہے۔"

حمید احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ کو ہر مرحلے پر، ہر معاملے میں میرا مکمل تعاون حاصل رہے گا۔" پرنسپل صاحب مسکرائے۔ "گڈ لک۔"

"تھینک یو سر!"

☆

مدیحہ کالج کے لئے تیار ہو کر چائے پیتے ہوئے ہر روز کی طرح اخبار میں.... آج کا دن کیسا گزرے گا.... کا کالم پڑھ رہی تھی۔ نجوم میں اسے دلچسپی تھی۔ موٹی موٹی باتیں وہ جانتی بھی تھی کہ اس کے لئے برج سنبلہ اور ثور اچھے ہیں۔

دو جملے پڑھنے کے بعد اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کالم ایک بہت بڑا اور اہم اعلان کر رہا تھا۔ "آج آپ کو آپ کے خوابوں کی وہ شہزادی ملے گی جس کا آپ کو برسوں سے انتظار تھا۔ جھجکنا چھوڑ دیئے اور دل کی بات کہنے میں دیر نہ کیجئے۔"

وہ جانتی تھی کہ یہ بات صرف جدی مردوں کے لئے نہیں ہے۔ بات بس یہ ہے کہ اس

معاشرے میں مردوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ انہیں اولیت دی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ تحریر
کے خوابوں کے شہزادے کی نوید دے رہی تھی۔

وہ روز یہ کالم پڑھتی تھی۔ کبھی کبھار پیش گوئی جزوی طور پر درست بھی ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر وہ کچھ ہوتا نہیں تھا جو بتایا جاتا تھا اور اس کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ دنیا میں کروڑوں جدی افراد ہیں۔ چند سو یا چند ہزار افراد کی حد تک پیش گوئی درست ہو سکتی ہے۔ مگر دنیا کے تمام انسانوں کو صرف بارہ بروج میں تقسیم کر کے محدود نہیں کیا جا سکتا اور نہ دنیا میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔

لیکن اس وقت اس کا دل جس انداز میں دھڑکا' جیسے اس کے وجود میں خوشی اور امید کی لہر دوڑی' اس سے اسے یہ گمان ہونے لگا کہ کم از کم آج کی پیش گوئی اس کے لئے ضرور تھی۔ پھر بھی اس نے خود کو جھڑک دیا۔ خوش فہمی مت پالو مدیحہ بیگم' یہ پوری نہ ہو تو مایوسی دے جاتی ہے۔

مگر اندر کی امید بڑی توانا تھی۔ یہ تو دیکھا جائے کہ خوابوں کے شہزادے کا تعلق کس برج سے ہے۔ اس امید نے اسے تمام بروج کا حال پڑھنے پر اکسایا۔ وہ ایک ایک کر کے ہر برج کے متعلق پڑھنے لگی۔

وہ سنبلہ پر پہنچی تو جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ لکھا تھا.... 'سچی محبت آپ کے دل کے دروازے پر دستک دینے والی ہے۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے سنتے ہیں یا نہیں۔ دروازہ کھولتے ہیں یا نہیں۔'

''تو وہ کوئی سنبلہ ہو گا۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''مگر جدی بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''اور زیادہ امکان یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' اس نے خود سے سختی سے کہا۔ پھر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی' ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی خالی کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کالج جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی میں نسرین کے گھر پہنچی۔ دونوں ساتھ ہی کالج جاتی تھیں۔ عام طور پر نسرین اسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں تیار ملتی تھی مگر اس روز وہ موجود نہیں تھی۔ ''آنٹی! نسرین کہاں ہے؟'' اس نے سلام کرنے کے بعد نسرین کی امی سے پوچھا۔

''وہ تو سو رہی ہے۔''

مدیحہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''سو رہی ہے؟''

''میں نے جگایا تو کہنے لگی، سونے دیں۔ آج ایسی کوئی کلاس نہیں کہ جانا ضروری ہو۔'' نسرین کی امی نے کہا۔

مدیحہ سوچ میں پڑ گئی۔ نسرین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مگر ایک بات وہ بھول گئی' آج سوکس کی کلاس تھی.... اور خاص بات یہ تھی کہ پچھلے لیکچرار کا تبادلہ ہو گیا تھا اور آج نئے لیکچرار کو پہلی بار کلاس لینی تھی اس لئے جانا ضروری تھا۔ ''نہیں آنٹی' ایک کلاس ضروری ہے۔'' اس نے نسرین کی امی سے کہا۔ ''اور وہ گیارہ بجے ہے۔''

''تو ابھی تو بہت وقت ہے اس میں۔ جا کر نسرین کو جگا دو۔''

مدیحہ نسرین کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دروازے پر دو تین بار دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں چلی گئی۔ نسرین اپنے بیڈ پر بے سدھ سو رہی تھی۔ اس نے نرمی سے نسرین کو جگانے کی کوشش کی۔

''سونے دیں امی!'' نسرین نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ''صبح ہوتے تو نیند آئی تھی مجھے۔''

''اے' میں امی وامی نہیں' مدیحہ ہوں۔ اٹھ جاؤ' نو بج رہے ہیں۔'' مدیحہ نے بگڑ کر کہا۔

نسرین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''تم! تم کب آئیں؟''

''ابھی آئی ہوں۔ مگر یہ صبح ہوتے نیند آنے کا کیا سبب ہے؟ رات بھر کیا کرتی رہیں؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں....''

''ابھی تم نے ہی بتایا ہے.... مجھے امی سمجھ کر۔'' مدیحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ بھی تمہاری عنایت ہے۔'' نسرین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیوں بھئی؟ میں نے ایسا کیا کر دیا؟'' مدیحہ کو سچ مچ حیرت ہوئی۔

''کل تمہاری نیو ایئر نائٹ تھی اور اس میں تم ہمیشہ آدھی رات کے بعد مجھے فون کرتی ہو۔ سو میں بے وقوف تمہارے فون کا انتظار کرتی رہی....''

مدیحہ کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ واقعی.... برسوں سے اس کا یہ معمول تھا کہ نیو ایئر نائٹ کو وہ نسرین کو فون کر کے سال نو کی مبارک باد دیتی تھی.... یہ پہلا موقع تھا کہ وہ نیو ایئر پارٹی میں شریک ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ اس سہیلی کو بھول گئی تھی جو برسوں سے اس رات کی تنہائی میں اس کی ساتھی رہی تھی۔ اسے خود پر.... اپنی خود غرضی

اور مطلبی پن پر بڑی شدت سے غصہ آیا۔

"سوری میری جان' میں پارٹی میں گئی تھی نا...."

"ہاں۔ پہلی بار محفل ملی تو اپنی تنہائی کی ساتھی کو بھول گئی' مطلبی ہے نا۔"

"سچ.... میں بہت شرمندہ ہوں۔" مدیحہ نے نظریں جھکالیں۔ "مگر تمہیں نئے سال کی اتنی پرواہ کب سے ہو گئی۔ تم تو مانتی ہی نہیں نئے سال کو۔" اب اس کے لہجے میں کھسیاہٹ تھی۔

"اب بھی نہیں مانتی۔ مگر تمہاری فون کال کی عادی ہو گئی تھی۔" نسرین نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "خیر.... چھوڑو اس بات کو۔ مجھے سوتے سے کیوں اٹھایا ہے۔ آج کالج جانا تو ضروری نہیں۔"

"بہت ضروری ہے۔ تمہیں یاد نہیں' آج سوکس کے نئے سر پہلی کلاس لیں گے۔"

نسرین اچھل پڑی۔ "ارے.... یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ کس وقت ہے کلاس؟"

"تم اطمینان سے تیاری کرو۔ کلاس گیارہ بجے ہے' ہم ساڑھے دس بجے چلیں گے۔"

"میں باتھ روم سے ہو آؤں۔" نسرین اٹھی اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

مدیحہ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اسے اخبار کے.... آج کیسا گزرے گا.... کا خیال آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ آج مجھے میرا پرنس چارمنگ مل ہی جائے۔ اس نے سوچا۔ فوراً ہی اسے بوبی کا خیال آ گیا۔ آج کے پہلے لمحے میں تو وہی اسے ملا تھا۔ کون جانے....

اچانک اس کے اندر ایک تند لہر ابھری۔ وہ گھٹیا لڑکا۔ اس نے بے حد نفرت سے سوچا۔ ایسے تو نہیں ہوتے پرنس چارمنگ۔ ایسے آدمی سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ لڑکی کنواری ہی بیٹھی رہے۔

تو پرنس چارمنگ کیسے ہوتے ہیں؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا۔

اس پر نسرین سے بارہا اس کی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سوال کا مختصر سا جواب یہ تھا کہ وہ باوقار مرد ہوتے ہیں۔ چھچھورے لڑکے نہیں۔

"تو کیا لڑکے باوقار نہیں ہو سکتے؟"

"ہو سکتے ہیں لیکن ہوتے نہیں۔ فلمیں دیکھ کر امیتابھ بچن کے سینز کو کاپی کرنے والے.... زندگی کی عام اور حقیقی سچویشن کو فلمی سچویشن بنا دینے والے ہو ہی نہیں سکتے۔

جن کے جذبات سطحی اور ناقابل اعتبار ہوں۔ جن کی سوچ میں گہرائی نہ ہو۔ جن کے پاس مشاہدہ کرنے والی آنکھ نہ ہو اور مشاہدے پر غور کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے والا ذہن نہ ہو۔ جو تجربے اور اس سے ملنے والی دانش سے محروم ہوں۔ جو وقتی ہیجان کے تحت متحرک ہوتے ہوں' وہ پرنس چارمنگ کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"مگر اکثریت ایسے لڑکوں کی ہوتی ہے' پھر ان کا کیا بنے گا؟"

"ان کے لئے ویسی ہی لڑکیوں کی اکثریت بھی تو ہے۔ بس میں ان کے لئے نہیں۔"

"جب انہیں تجربہ' دانش اور گہرائی ملے تو عمر بڑھنے کے ساتھ وہ پرنس چارمنگ بن جائیں گے۔"

"نہیں۔ ان کی اکثریت ویسی ہی رہے گی۔"

"مگر جوان لڑکوں کو تجربہ اور دانش کیسے مل سکتی ہے۔ یہ تو عمر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔"

"سوچ یا تو شروع ہی سے بلند ہوتی ہے یا پست۔ اور مطالعے سے تجربہ بھی ملتا ہے اور دانش بھی۔ آدمی میں تدبر بھی پیدا ہوتا ہے لیکن مطالعے کا شوق بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر نے کتابوں کی ضرورت اور اہمیت کو دبا دیا ہے۔ اب مطالعہ تو وہی کرے گا جس کی سوچ مخصوص انداز کی ہو گی ورنہ تو یونہی وقت ضائع کرتا پھرے گا۔"

"تو مطالعے سے لڑکے بھی پرنس چارمنگ بن سکتے ہیں؟"

"بالکل۔"

"اور تمہیں کوئی ایسا لڑکا مل جائے تو؟"

"مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے کچا پن نہیں' پختگی پسند ہے۔"

"تم اپنے ابو سے بہت محبت...."

مدیحہ کو اس سے انکار نہیں تھا۔ پاپا اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ اسے پاپا سے بہت محبت تھی۔ ابتدا ہی سے وہ ان کا بہت زیادہ قرب چاہتی تھی۔ ان کے ہاتھوں کا لمس' ان سے لپٹنا' ان کی گود میں بیٹھنا، اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اسے کبھی ملا نہیں۔ وہ مالی کی بیٹی کو دیکھتی تھی جو ہر وقت مالی کی گود میں چڑھی رہتی تھی۔ بلکہ وہ ضد کرتی تو مالی مشین سے گھاس کاٹتے وقت بھی اسے اپنے کندھے پر بٹھا لیتا۔ ایسے میں مدیحہ بڑی حسرت سے سوچتی.... کاش میں

مالی کی بیٹی ہوتی۔ پھر پاپا کی محبت موج مارتی تو وہ اصلاح کرتی.... کاش پاپا مالی ہوتے۔ مگر وہ یہ بات کبھی کہہ نہیں پائی۔ وہ پاپا کے قریب جاتی' ان کی گود میں چڑھنے کی کوشش کرتی تو ممی اسے سخت لہجے میں ٹوک دیتیں۔ ''یہ کیا بد تمیزی ہے۔ کپڑے خراب کرنے ہیں۔ طور طریقے درست کرواپنے۔'' وہ شکایتی نظروں سے پاپا کو دیکھتی تو وہ اس سے نظریں چرانے لگتے۔ ان کے چہرے پر بے بسی ہوتی۔ صاف پتہ چلتا کہ وہ اسے لپٹانا چاہتے ہیں لیکن ممی کے ڈر سے ایسا نہیں کر سکتے۔

یادداشت میں محفوظ پاپا کی پہلی دید اب بھی اس کی نظر میں تھی۔ وہ بہت وجیہہ اور خوبرو تھے۔ لمبا قد' چوڑے کندھے' کسرتی جسم' سرخ و سفید رنگت اور خوب صورت چہرہ۔ اس وقت ان کے بال صرف کنپٹیوں پر سفید تھے اور وہ مدیحہ کو بہت اچھے لگتے تھے۔ یہ وہ عرصہ تھا جب وہ ان کی گود میں چڑھنا چاہتی تھی۔ ان سے لپٹ کر سونا چاہتی تھی مگر پھر پاپا دیکھتے ہی دیکھتے بدلتے گئے۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ سر کے تمام بال سفید ہو گئے۔ چہرے پر لکیریں ابھر آئیں اور وہ لمحہ بہ لمحہ متاسف اور اداس ہونے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ پاپا بہت تیزی سے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے ہو گئے۔ وہ مدیحہ کو اپنا زیاں لگتا تھا.... بہت بڑا زیاں!

اس نے پاپا کو ہمیشہ ممی کے سامنے دبتے دیکھا۔ گھر میں تمام فیصلے ممی کرتی تھیں۔ پاپا کو اس نے صرف ایک معاملے میں سخت دیکھا۔ ممتاز بھائی نے 18 سال کا ہونے سے پہلے شراب پی لی تھی۔ پاپا نے انہیں بری طرح لتاڑا۔ ''میرے گھر میں یہ ممکن نہیں ممتاز صدیقی۔''

''او کم آن حامد۔'' ممی نے مداخلت کی۔ ''اب ایسا بھی....''

پاپا ممی کی طرف پلٹے۔ ''ول یو پلیز شٹ اپ۔'' انہوں نے درشتی سے کہا اور پھر ممتاز بھائی کی طرف مڑے۔ ''آج میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ ایسا کیا تو یاد رکھنا کہ اس گھر سے اور اس گھر کے لوگوں سے تمہارا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ بس اب جاؤ اور نشہ اترنے تک کسی کے سامنے بھی نہ آنا۔''

شرمندہ ممتاز بھائی سر جھکائے جانے لگے۔ پاپا نے انہیں پکارا۔ ''اور سنو....''

ممتاز بھائی پلٹے لیکن نظریں جھکائے کھڑے رہے۔

''ڈرنک کرنا اور بات ہے اور شرابی بن جانا اور۔'' پاپا نے کہا۔ ''مجھے شرابی پسند نہیں ہیں۔''

اس وقت مدیحہ 14 سال کی تھی۔ اس لیے پاپا اسے بہت خوب صورت لگے۔ اس لمحے اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ مرد کو کیسا ہونا چاہئے.... اتھارٹی، فیصلے کرنے والا، سخت اور غیر لچکدار۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ بھرم ٹوٹ گیا۔ ممتاز بھائی کے جاتے ہی ممی پاپا پر برسیں اور خوب برسیں۔ کیا کچھ نہیں کہا انہوں نے۔ اور پاپا سر جھکائے سنتے رہے۔ پھر انہوں نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری شہناز' ویری سوری۔ لیکن یہ میرا اصول ہے۔ پلیز.... بچوں کو یہ اصول کبھی نہ توڑنے دینا۔ پلیز شہناز۔'' اور یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بھکاریوں کا سا تھا۔

مدیحہ اس کے بعد کچھ نہ سن سکی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور کمرا بند کر کے دیر تک روتی رہی۔

تو شاید بات یہی تھی کہ وہ اپنے پرنس چارمنگ میں اپنے پاپا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ویسا جیسا اس کی خواہش تھی' جیسا وہ انہیں دیکھ نہیں سکی تھی.... اتھارٹی، فیصلے کرنے والا، مضبوط، اصول پرست اور غیر لچک دار۔ اور یہ تسلیم کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا۔

''اور ایک نجومی نے کہا ہے کہ آج مجھے میرا پرنس چارمنگ مل جائے گا۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''ارے.... تم کیا خود سے باتیں کر رہی ہو''

اس نے چونک کر دیکھا۔ نسرین باتھ روم سے نکل آئی تھی۔

☆

کلاس روم میں خاموشی تھی۔ ہر چہرے پر انتظار کی کیفیت لکھی تھی۔ سب کی نظریں کلاس روم کے دروازے پر جمی تھیں۔ کچھ لوگ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں مدیحہ بھی تھی۔

مدیحہ اور نسرین دوسری قطار کے درمیان ڈیسک پر بیٹھی تھیں۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے انہیں سامنے جگہ نہیں مل سکی تھی۔ مدیحہ کو خیال آیا کہ بارہ گھنٹے میں یہ دوسرا موقع ہے کہ وہ بے تابی سے گھڑی دیکھ رہی ہے۔ پہلی بار کا نتیجہ کچھ خوشگوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ اب دیکھئے' اس بار کیا ہوتا ہے۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بجنے میں ایک منٹ تھا۔ سیکنڈ کی سوئی اوپر کی طرف

حرکت کر رہی تھی۔ وقت پر یہاں کون آتا ہے؟ مدیحہ نے تلخی سے سوچا۔ سکھانے ' تو دینے والے بھی نہیں۔ ہمارے پاس سب سے فالتو چیز وقت ہی ہے' جتنا چاہو ضائع کر دو۔

سیکنڈ کی سوئی نے گیارہ کا ہندسہ پار کیا تو اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ دروازے کا فریم خالی تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے ایک ثانئے کے لئے وہ بھر گیا۔ پھر فریم کو بھر والا کمرے میں داخل ہو گیا۔

پوری کلاس احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سٹ ڈاؤن پلیز۔" آنے والے نے کہا۔

سب بیٹھ گئے۔ مدیحہ کا دل مایوسی سے بھر گیا۔ آنے والا اس کی توقعات پر پورا نہیں ا تھا۔ یہ اس کے بارے میں اس کا پہلا تاثر تھا۔

"شاید' آپ جانتے ہوں' میں آپ کا سوکس کا نیا لیکچرار ہوں۔" آنے والے نے کہا۔

مدیحہ کے تاثر کی جزئیات اس پر روشن ہونے لگیں۔ اس کی مایوسی کی وجہ پچھلے لیک تھے، جن کی جگہ نئے لیکچرار نے لی تھی۔ اور جانے والے سر کافی بوڑھے تھے۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" نئے لیکچرار نے پوچھا۔ اس کی نگاہیں مدیحہ کی طرف ا تھیں۔ "کچھ پوچھنا ہے آپ کو؟"

مدیحہ کو حیرت ہوئی۔ کیا یہ خطاب اس سے ہے، لیکن کیوں؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا شاید سر کسی اور سے مخاطب ہوں۔ مگر ایسا لگتا تو نہیں تھا۔

"جی میں آپ سے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"نہیں سر۔ نہیں تو....." مدیحہ نے گڑبڑا کر کہا۔

"تو پھر کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جایئے نا پلیز۔"

مدیحہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اب تک نہیں بیٹھی ہے۔ خفت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا دھب سے یوں بیٹھی' جیسے اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہ ہو۔

"آج میں پہلی بار آپ کی کلاس لے رہا ہوں۔" نئے سر نے کہا۔ "اور آج میں پڑھاؤں گا نہیں۔ میرا برسوں کا اصول ہے کہ پہلے میں خود کو اپنی کلاس میں متعارف کرا ہوں پھر خود اپنے شاگردوں سے تعارف حاصل کرتا ہوں۔ اس مرحلے کو میں سب ضروری سمجھتا ہوں۔ اب اس کی وجہ بھی بیان کر دوں۔ استاد کا اپنے شاگردوں سے بڑا گہ

اور پہلو دار تعلق ہوتا ہے۔ استاد معلم ہے۔ اس کا کام شاگردوں کو علم اور آگہی دینا ہے۔ اس لحاظ سے وہ محترم ہوا۔ اب یہی کام گھر میں ماں باپ بھی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ اور میرے نزدیک استاد ہی بہترین دوست بھی ہوتا ہے۔ شاگردوں کو استاد کا احترام کرتے ہوئے اس سے بے تکلف بھی ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے مسائل پر استاد سے بات کر سکیں' اس سے مشورہ لے سکیں اور استاد ان کی راہ نمائی کر سکے۔

تو آج اس لمحے سے جب تک بھی میں یہاں ہوں' میں آپ کے لئے یہ سب کچھ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ احترام دیں' جو میرا حق ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے ڈریں یا کوئی بات کرتے ہوئے جھجکیں۔ میرے پاس جو کچھ علم ہے' وہ میں آپ کو دوں گا۔ آپ کا ہر مسئلہ میں سنوں گا' اسے سلجھانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے سلسلے میں آپ کی راہ نمائی اور مدد کروں گا۔ میں آپ کا بہترین دوست ہوں۔"

کلاس روم میں چند لمحے احترام آمیز خاموشی رہی۔ پھر کچھ ملی جلی آوازیں ابھریں "تھینک یو سر۔"

"اب میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام حمید احمد ہے۔ اب سے اٹھارہ سال پہلے میں نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا۔ اب نوجوانوں کی خدمت کرتے مجھے سولہ برس ہو چکے ہیں۔ پڑھانا صرف میرا پروفیشن نہیں ہے۔ اس سے مجھے دلی طمانیت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ میری سب سے بڑی ہابی مطالعہ ہے۔ سیاسیات میرا مضمون ہے۔ میں یہ پڑھاتا بھی ہوں لیکن سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اردو ادب میں دلچسپی لیتا ہوں۔ مطالعہ زیادہ تر اردو ادب کا یا پھر انگلش فکشن کا کرتا ہوں۔ کوئی سوال؟"

"آپ کی کوئی اور ہابی سر؟"

"جسمانی فٹنس کے لئے ٹیبل ٹینس کے تین یا چار گیم ضرور کھیلتا ہوں۔"

"اور فلم نہیں دیکھتے؟" ایک اور لڑکے نے پوچھا۔

"کبھی کبھار فلم دیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔" حمید احمد نے کہا۔ "لیکن کریز نہیں ہے مجھے۔"

"پسندیدہ شاعر؟" یہ سوال ایک لڑکی نے کیا تھا۔

"غالب اور ناصر کاظمی۔"

"عجیب کامبی نیشن ہے۔" مدیحہ کے برابر بیٹھی ہوئی نسرین نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے میر کے ساتھ ناصر کاظمی ہوتے تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔"

حمید احمد مسکرائے۔ "دراصل غالب اور میر دو مختلف اسالیب کے بانی تھے۔ ناصر کاظمی نے میر کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے عہد ساز شاعری کی لیکن غالب کی تقلید کوئی نہیں کر سکا۔ وہ آج بھی یکتا اور غالب ہیں۔"

"میں سمجھ گئی سر۔" نسرین نے کہا۔

"آپ کو غصہ تو نہیں آتا سر؟" کسی نے پوچھا۔

"غصہ تو بشری کمزوری ہے۔ تاہم میں اس سے لڑنے ' اسے زیر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں۔"

کلاس روم میں خاموشی چھاگئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد حمید احمد نے کہا "اب آپ لوگ باری باری اپنا تعارف کرادیں۔ ادھر سے شروع کریں۔" اس نے پہلی قطار میں داہنی جانب بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

☆

سلائیاں چلاتی ہوئی انگلیاں تھک گئیں تو بلقیس بیگم نے ہاتھ روک لیا۔ لیکن ان کا دل چاہ رہا تھا کہ بنتی رہیں۔ وہ اس سویٹر کو آج ہی مکمل کر لینا چاہتی تھیں۔ اسی لگن میں وہ پچھے دو گھنٹے سے سویٹر بنے جارہی تھیں۔ اب سردی گزر جانے کے بعد بیٹے کو سویٹر ملے تو فائدہ؟ سویٹر تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بس تھوڑی سی بنائی باقی تھی۔ پھر دونوں حصوں کو جوڑ دینا تھا۔ سویٹر انہوں نے چھپ کر بنا تھا۔ حمید کو پتہ بھی نہیں تھا۔ اچانک اسے سویٹر ملے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ اور ایسا آج ہی ہو جائے....

انہوں نے پھر سلائیاں اٹھائیں۔ مگر انگلیاں اکڑ چکی تھیں۔ اب بنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ بڑھاپا آگیا۔ انہوں نے آہ بھر کے سوچا۔ ورنہ چھ چھ گھنٹے بنتی رہتی تھیں اور پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر بڑھاپا آتا ہے تو ہڈیاں اور جوڑ سخت اور غیر لچک دار ہونے لگتے ہیں۔

انہوں نے سویٹر ' سلائیوں اور اون کے گولے کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور پاؤں پھیلا لئے ' واہ رے بڑھاپے۔ اب تو کچھ کئے بغیر تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کہاں سب کچھ کر کے بھی نہیں تھکتے تھے۔

انہوں نے سر اٹھا کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ارے ابھی ساڑھے گیارہ بھی نہیں بجے۔ انہوں نے مایوسی سے سوچا۔ یہ وقت اتنا ضدی کیوں ہے۔ آدمی سے اس کی اتنی لڑائی کیوں رہتی ہے۔ جب کسی کا انتظار ہو اور چاہو کہ یہ تیزی سے گزر جائے تو یہ تقریباً رک جاتا ہے اور جب چاہو کہ یہ رک رک کر گزرے تو یہ ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتا ہے۔ لو بتاؤ' ابھی صرف سوا گیارہ بجے ہیں۔ بچہ تو ڈیڑھ بجے آئے گا۔

بلقیس بیگم کے لئے سب سے زیادہ سخت وقت وہ ہوتا تھا جب حمید کالج اور وحید اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ وحید ڈیڑھ بجے اسکول سے واپس آتا تھا۔ یہ ڈیڑھ بجے تک کا وقت کاٹنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ زبردستی کے کام نکال کر خود کو اس میں

الجھاتی تھیں۔ مگر وقت پھر بھی مشکل سے کٹتا تھا۔

توبہ..... کیسا ہے یہ انتظار! بچے اسکول کیوں جاتے ہیں آخر؟ انہوں نے جھنجھلا کر سوچا۔

اسی لمحے اندر کی ایک آواز نے انہیں ڈپٹ دیا۔ کیوں ناشکرا پن کرتی ہے بلقیس! یہ چا گھنٹے کا انتظار! اس کی شکایت کرتی ہے۔ تجھ سے زیادہ انتظار کو کون سمجھے گا۔ تو نے تو مسلس سولہ برس انتظار کیا تھا..... بغیر رکے۔ اور اس کے بعد انتظار بھی نہیں رہا۔ کیونکہ آرز پوری ہونے کا امکان ہی نہیں رہا تھا۔ پھر آٹھ بے کیف برس تو نے گزارے۔ ان میں کہ بھی تو نہیں تھا تنہائی کے سوا۔ اور اس کے بعد اللہ نے بغیر کسی امکان کے تجھے سب کچھ د دیا۔ یاد نہیں ہے 'ناشکری؟

اور بلقیس بیگم لرز کر رہ گئیں۔ انہیں سب کچھ یاد تھا۔

☆

صابر علی کو سرکاری ملازمت کراچی میں ملی۔ رہنے کو کوارٹر بھی مل گیا۔ زندگی مختل انداز میں سہی، لیکن رواں ہو گئی۔ تلاطم سے نجات ملی۔ ذرا سکون آیا تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اجنبی جگہ تھی، اجنبی لوگ تھے۔ ہندوستان میں وہ بھرے گھر رہتی تھیں۔ ایسے میں تنہائی کا احساس تو ہونا ہی تھا۔ پھر بچھڑے ہوئے اپنے بھی یاد آ لگے۔ پہلی بار جانے والوں کا غم، ان کا ماتم کرنے کا موقع ملا۔ وہ غم میں ڈوب سی گئیں۔ ذرا ہلکا ہوا تو تنہائی کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ احساس تو انہیں بعد میں ہوا کہ ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ، اور کہیں لفظ بہ لفظ ایک کہانی ہے..... اور ہر گھر کی کہانی ہے۔ وہاں رہنے والے تمام لوگ ان تمام مراحل گزرے تھے۔ سب کے دکھ درد مشترک تھے۔ سب اپنی زمین جائیداد، اپنا گھر بار چھوڑ آئے تھے۔ سب نے اپنے پیاروں کی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ سب کو کوارٹر ملنے کے اپنے غموں پر غور کرنے کا موقع ملا تھا اور آخر میں تنہائی کا احساس بھی مشترک ہی تھا۔

درد مشترک انسان کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے تو تنہائی لوگوں کو ایک دوسر کے لئے ناگزیر کر دیتی ہے۔ چنانچہ سرکاری کوارٹرز کے اس علاقے میں معاشرہ وجود آنے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ پڑوسیوں میں تعلقات قائم ہوئے، جو کہ خون کے رشتوں سے بھی بڑھ گئے۔ محبتوں کا فروغ ہوا اور تنہائیاں دور ہو گئیں۔

سب کچھ ٹھیک ہوا تو بلقیس بیگم کے دل میں وہ فطری خواہش جاگی، جس کے بغیر عورت مکمل نہیں ہوتی۔ وہ اولاد کی خواہش تھی۔ شادی کے بعد دو سال وہ ہندوستان میں رہی تھیں۔ انہیں اس بات کا خیال ہی نہیں تھا۔ پھر ہجرت کا مرحلہ آیا۔ تمام اپنے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ وہ کیمپ میں رہیں..... اور وہ تو صابر علی کو بھی صبر کر بیٹھی تھیں۔ پھر صابر علی ملے۔ وہ لوگ کراچی چلے آئے۔ یہاں سیٹ ہوتے ہوتے پاکستان کی پہلی سالگرہ کا موقع آ گیا۔ سو اب گھر کی تنہائی اور ویرانی کی وجہ سے انہیں اولاد کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس ہوا کہ تین سال ہو گئے شادی کو۔ مگر ابھی تک.....

مزید ایک سال گزرا تو وہ بے تاب ہو گئیں۔ کیا بات ہے آخر۔ نخل آرزو ہرا کیوں نہیں ہوتا؟ پڑوسنوں کے آزمودہ ٹوٹکوں اور گھریلو چٹکلوں میں ایک سال اور گزر گیا۔ بات دوا اور دعا تک پہنچ گئی۔ تعویذ گنڈے بھی ہوئے۔ منتیں بھی مانی گئیں، مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔

صابر علی بچے نہیں تھے۔ ان کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ وہ سرکاری افسر تھے۔ علاج معالجے کی سہولت انہیں میسر تھی لیکن وہ انہیں اس سلسلے میں کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گئے۔

پھر یہ ہوا کہ بلقیس بیگم کا صبر جواب دینے لگا۔ شادی کو نو سال ہو چکے تھے اور انہیں پاکستان آئے سات سال۔ اتنا وقت کم تو نہیں ہوتا۔ وہ پریشان ہونے لگیں۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ ہے تو علاج ہونا چاہئے۔ مگر وہ جھجکتی تھیں۔ شوہر سے بات کیسے کرتیں۔ اور صابر علی کو تو کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بلقیس بیگم چڑچڑانے لگیں۔ بات بات پر لڑنے لگیں۔ لیکن لڑائی کبھی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ صابر علی بہت صابر تھے۔ مگر ایک دن تشویش بھرے لہجے میں بولے۔ "یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے بلقیس؟ بہت چڑچڑی ہو گئی ہو؟"

"آپ کو کیا؟ آپ کو پرواہ ہی کب ہے؟" بلقیس بیگم نے تنک کر کہا۔ پھر خود ہی روہانسی ہو گئیں۔

صابر علی ان کا جواب سن کر تڑپ گئے۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو بلقیس؟" ان کے لہجے میں شکایت تھی "تم جانتی ہو، میں کتنی پرواہ کرنے والا آدمی تھا اور ہوں۔ اور اب تو میرے پاس پرواہ کرنے کے لئے تمہارے سوا ہے کون۔ تمہاری پرواہ نہیں کروں گا تو کس کی کروں گا۔" یہ کہتے کہتے ان کے لہجے میں دکھ آ گیا۔ "مگر پتہ تو چلے کہ بات کیا ہے؟"

"پرواہ کرتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔"

صابر علی چند لمحے سوچتے رہے' غور کرتے رہے۔ پھر بولے۔ "صحت خراب ہو' جسمانی کمزوری ہو تو آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

"یہی سمجھ لیں۔" بلقیس بیگم نے رکھائی سے کہا۔

"تو کل میرے ساتھ چلنا ہمارے دفتر میں بڑی ڈسپنسری ہے۔ ڈاکٹر بھی اچھے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر بھی ہے۔"

اگلے روز صابر علی انہیں ڈسپنسری لے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے انہیں اطمینان ہوا۔ تنہائی بھی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر سے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے ان کی بات سنی اور تسلی دی۔ پھر دواؤں کا نسخہ ان کی طرف بڑھادیا۔

وہ باہر نکلیں تو صابر علی ان کے منتظر تھے۔ "کہو کیسی رہی ملاقات؟"

بلقیس بیگم مسکرائیں۔ "بہت اچھی۔" انہوں نے کہا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ دل کا بوجھ اتار دینے کے بعد وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔

"تم یہ نسخہ اس کھڑکی پر دو۔ وہاں سے تمہیں دوا ملے گی۔" صابر علی نے کہا۔ "میں ذرا ڈاکٹر سے دواؤں کے استعمال کے بارے میں بات کرلوں۔"

بلقیس بیگم نے پرچہ کمپاؤنڈر کو دیا اور خود بینچ پر بیٹھ گئیں۔ سامنے ہی اس لیڈی ڈاکٹر کا کمرہ تھا' جسے انہوں نے دکھایا تھا۔ ان کے سامنے ہی صابر علی ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ دوا ملنے میں کوئی پندرہ منٹ لگے۔ اور انہیں دوا ملنے کے بھی کوئی دو منٹ بعد صابر علی ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آئے۔

"خاصی دیر لگ گئی۔" انہوں نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں نے سوچا' اچھی طرح سمجھ لوں۔ دوا وقت پر لینے کی اور ٹھیک مقدار میں لینے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔"

بلقیس بیگم دوا لیتی رہیں مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ کئی بار ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ ڈاکٹر ہمیشہ انہیں تسلی دیتی رہی۔ بلقیس بیگم ان طفل تسلیوں سے بھی.... بیزار ہو گئیں۔ آخری بار وہ اس ڈاکٹر کے پاس گئیں تو پھٹ پڑیں۔ "کیا میری قسمت میں اولاد نہیں ہے؟"

"ایسے نہ کہیں۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر بولی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ...." وہ کہتے کہتے رکیں۔ "کہ.... کہ.... مجھ میں کوئی خرابی ہو۔" ان کے اندر کوئی خدشہ پھنکارا۔

"بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں۔" ڈاکٹر نے اطمینان سے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔"

مگر یہ ناممکن تھا۔ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ عورت اولاد سے محروم ہو اور پریشان بھی نہ ہو۔

"میں چیک کر چکی ہوں۔ آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے انہیں مزید اطمینان دلایا۔

اس بات سے وہ اور بے سکون ہو گئیں۔ یہ کیسی محرومی ہے کہ وہ صحت مند اور نارمل ہیں۔ مگر اولاد سے محروم ہیں۔ بہر حال اس کے بعد ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بیمار تو تھیں نہیں کہ ڈاکٹر کے پاس جاتی رہتیں۔

ان کا چڑچڑا پن اور بڑھ گیا۔ ایک دن ان کا ضبط جواب دے گیا۔ جھجک دھری رہ گئی۔ انہوں نے اس سلسلے میں صابر علی سے براہ راست بات کرلی۔ بات بڑے معصوم انداز میں شروع ہوئی تھی۔

"آپ کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا؟" انہوں نے صابر علی نے پوچھا۔

"تم ساتھ ہو تو تنہائی کا احساس کیوں ہو گا۔" صابر علی نے بے ساختہ کہا۔ مگر یہ کہتے کہتے وہ چونکے۔ "اوہ.... اب میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا۔ بے وقوف ہوں' سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ تم تنہائی کا شکار ہو۔"

بلقیس بیگم نے کچھ نہیں کہا۔ بس انہیں دیکھتی رہیں۔

"میں صبح کا گیا شام کو گھر آتا ہوں۔ واقعی ایسی تنہائی تو آدمی کو بیمار کر دیتی ہے۔ مگر اس مسئلے کا حل بہت آسان ہے۔ تم مجھ سے پہلے کہہ دیتیں۔ ویسے میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ یہ بات مجھے خود سوچنی چاہئے تھی۔"

"اس کا کیا حل ہے آپ کے خیال میں؟"

"ایک ملازمہ رکھ لو دن بھر کے لئے۔"

بلقیس بیگم ششدر رہ گئیں۔ "یہ کیسی بات کی ہے آپ نے؟"

"بھئی ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ میری تنخواہ کم تو نہیں ہے۔" صابر علی نے

نہایت اطمینان سے کہا۔ "تم اتنی پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"گھر کا کام ہے ہی کتنا۔ یہ بھی نہیں ہو گا تو وقت گزارنا اور دو بھر ہو جائے گا۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ مسئلہ اور بڑھا رہے ہیں۔"

"کام کی بات نہیں۔ ملازمہ سے دوسراہٹ رہے گی۔"

"اس کے لئے کافی پڑوسی ہیں اللہ کا شکر ہے سب اچھے لوگ ہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"آپ کو گھر میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟"

صابر علی نے ادھر ادھر دیکھا۔ "نہیں تو۔ اللہ کا شکر ہے۔ مجھے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی یہاں۔"

"مجھے بچوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔" بلقیس بیگم نے تند لہجے میں کہا۔

"اوہ۔" صابر علی نے گہری سانس لی۔ "مگر یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ نصیب میں ہوا تو اللہ کے حکم سے اولاد بھی مل جائے گی اور نصیب میں نہیں تو کوئی بات نہیں۔ سب کچھ تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔"

"مرد ہیں نا آپ۔ کتنی آسانی سے کہہ دی اتنی بڑی بات۔" بلقیس بیگم نے چڑ کر کہا۔ "مگر عورت تو اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی، جب تک اپنے اندر چھپا ممتا کا خزانہ بچوں پر نہ لٹا دے۔ میرے لئے یہ محرومی بہت بڑی ہے۔"

"تو یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ جانے کتنے بچے ماں باپ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہم کوئی بچہ گود لے لیں گے۔"

"جی نہیں۔ میں اتنی ظرف والی نہیں۔ اور کسی اور کی اولاد پر اپنا اختیار تو نہیں ہوتا۔"

"کیسے نہیں ہوتا۔ جس بچے کا دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں، وہ تمہیں اپنی ماں ہی سمجھے گا ہمیشہ۔"

"لیکن ہمیں تو اس کے خاندان کے بارے میں بھی نہیں معلوم ہو گا۔ کون ہے.... کیا خون ہے۔ نہیں بھئی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"تو نہ سہی۔ پھر انتظار کرو۔ دعا کرو اللہ سے۔"

"وہ تو کرتی ہوں۔ کرتی رہوں گی۔"

"صابر علی چند لمحے خاموش رہے۔ پھر بولے "میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ ورنہ مجھے بچوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

بلقیس بیگم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے بچے اچھے نہیں لگتے۔"

"کیوں؟ بچوں کے دم سے تو رونق ہے دنیا میں۔"

"رونق!" صابر علی نے چڑ کر کہا "شور شرابا، غل غپاڑا، طوفان بدتمیزی۔ اسے رونق کہتے ہیں؟"

"وہ تربیت اور توجہ کی بات ہے۔ بچوں کو اچھا اٹھایا جائے تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

"اور اس میں وقت لگتا ہے۔ اس کی خاطر بیویاں شوہروں کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔"

بلقیس بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔ "میں ایسی نہیں ہوں۔ میرے لئے سب سے بڑھ کر، سب سے پہلے آپ ہیں۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔" صابر علی کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "اسی لئے ناپسندیدگی کے باوجود مجھے بچوں پر اعتراض نہیں۔ اللہ عطاء فرمائے تو میں اس کا شکر ادا کرتا رہوں گا۔ لیکن جیسے تم بچوں کے لئے تڑپتی ہو، مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں بچوں کی۔"

بلقیس بیگم باقاعدہ رونے لگیں۔

"روتی کیوں ہو۔ ارے تمہاری خاطر.... صرف تمہاری خاطر میں تو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اولاد عطاء فرمائے۔" صابر علی نے ان کے آنسو پونچھ دیئے۔ "اب اللہ کی مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور تم بے صبرا پن نہ کرو۔ میں اسے ناشکرا پن سمجھتا ہوں۔"

اس دن کے بعد بلقیس بیگم نے اپنی تڑپ کو دبا لیا۔ وہ کوشش کرتی تھیں کہ اس کا اظہار نہ ہو۔ اور اب وہ صابر علی کو بہت غور سے دیکھتی تھیں۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ واقعی بچوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ پڑوس کے بچے گھر میں آتے تو ان کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ وہ منہ پھیر کر بیزاری سے مطالعے یا کسی اور کام میں مصروف ہو جاتے۔ بچے شور مچاتے تو پہلے وہ برداشت کرتے پھر انہیں بری طرح جھڑک دیتے۔ بچے بھی سمجھ گئے انہوں نے ان کی موجودگی میں آنا کم کرتے کرتے بالکل ہی ختم کر دیا۔ لیکن جب وہ گھر میں نہ ہوتے تو گھر بچوں سے بھرا

رہتا۔

اب صورت حال یہ ہوئی کہ گھر بچوں سے بھرا رہتا۔ بلقیس بیگم ان کی خوب خا مدارات کرتیں۔ مگر اداس بیٹھ کر اس بچے کے بارے میں سوچتیں' جس نے ان کی گود ا تک نہیں بھری تھی۔ ان کا اپنا بچہ۔ وہ بچوں کو دیکھتیں اور سوچتیں کہ ان کا بچہ کیسا ہو۔ ا جب وہ اس نظر سے دیکھتیں تو انہیں کوئی بچہ نہ بھاتا۔ کسی کا رنگ کالا ہوتا تو کسی کی ناک چ اور پھیلی ہوتی۔ کسی کی آنکھیں چھوٹی لگتیں تو کسی کی پیشانی تنگ لگتی۔ وہ بیٹھ کر سوچتیں ک انہیں کیسا بچہ چاہئے۔ مگر کوئی بچہ ان کی خواہش کا عکس نہیں تھا۔ تب وہ مختلف بچوں ک پارٹ لے کر تصور میں انہیں جوڑتیں۔ ہاشم کی آنکھیں بہت پیاری ہیں۔ رضیہ کے ہون بہت خوب صورت ہیں۔ اقبال کی پیشانی بلند اور خوبصورت ہے اور ناک عاصم کی بہت اچھ ہے۔ یوں وہ خاکہ بناتیں' اس میں نقوش بھرتیں اور اللہ سے کہتیں۔ ''اللہ پاک آپ ک خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اور آپ کتنا ہی دے دیں' کمی ہوتی بھی نہیں۔ مجھے اولا دے دیں..... ایک بیٹا..... یا بیٹی۔ ایسا دے دیں۔'' وہ تصور میں موجود مکمل خاکے کو آ بڑھاتیں۔ ''بس ایسا دے دیں۔''

ایک دن ایک عورت بیر بیچتی ہوئی آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیروں کی پوٹلی سی تھ اور دوسرے میں بچہ' جسے اس نے کندھے سے ٹکایا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بلقیس بیگم کے آنگن میں بچے بھرے ہوئے تھے۔

''بیر لے لو..... جھربیری کے بیر۔'' عورت آواز لگا رہی تھی۔

''خالہ' بیر دلاؤ نا۔'' اقبال ضد کرنے لگا۔

''ہاں خالہ' مجھے بیر چاہئیں۔'' ہاشم بولا۔

''مجھے بھی.....'' رضیہ نے کہا۔

''تم لوگ ہر وقت فرمائشیں کرتے رہتے ہو۔'' بلقیس بیگم نے انہیں ڈانٹا ''تمہارے خالو نے کوئی درخت لگا رکھا ہے پیسوں کا۔'' مگر اس ڈانٹ میں بھی محبت تھی۔

''خالہ.....'' وہ سب ٹھنکنے اور بسورنے لگے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ بلاؤ اسے۔''

بچے بیر والی کو دروازے پر لائے۔ بلقیس بیگم نے اسے گھر میں بلا لیا۔ عورت نے بچے کو

زمین پر چھوڑا اور چھوٹی سی ترازو نکال کر بیر تولنے لگی۔ سب اپنے اپنے مطلب کی چیز کی طرف متوجہ تھے۔ بچے بیروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بیر والی رزق کمانے کی فکر میں تھی۔ بلقیس بیگم اس کے بچے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

بیر والی کا بچہ بہت چھوٹا اور بہت کمزور تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے بلقیس بیگم کے دل میں کراہیت کی ایک تند لہر اٹھی۔ بچے کا رنگ کالا سیاہ تھا۔ اس پر ستم یہ کہ وہ ننگا تھا اور اس کے جسم پر میل کی سیاہ تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ناک بھی اس کی بہہ رہی تھیں۔ لاغر وہ ایسا تھا کہ تمام پسلیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ نہایت بدصورت تھا۔

بلقیس بیگم نے ایک لمحے کو منہ پھیر لیا۔ مگر فوراً ہی وہ اسے دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو گئیں۔ اتنا چھوٹا بچہ ان کے لئے زیادہ کشش رکھتا تھا۔ وہ نوزائیدہ بچے کی مانند جو تھا۔ مگر دوبارہ دیکھا تو وہ حیران رہ گئیں۔ بچہ اٹھ کر چل رہا تھا۔ اور چلنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چلنا سیکھ رہا ہے۔

بلقیس بیگم کو بچے پر ترس آنے لگا۔ چلنا سیکھ رہا ہے تو وہ ایک سال کا تو ہوگا۔ مگر دیکھنے میں وہ مشکل سے تین چار ماہ کا لگتا تھا۔ اور وہ لاغر اتنا تھا کہ تین چار ماہ کا بھی کمزور بچہ ہی لگتا تھا۔ یہ تو سوچنا بھی مشکل تھا کہ وہ ایک سال کا ہوگا۔ مگر وہ چل رہا تھا..... ڈگمگاتے..... لڑکھڑاتے..... ڈولتے ہوئے۔

وہ سحر زدہ سی بچے کو دیکھتی رہیں۔ عورت بیر تول رہی تھی۔ بچہ چلتے چلتے بری طرح لڑکھڑایا۔ اس نے آگے کی طرف ہاتھ پھیلائے' جیسے وہاں سہارے کے لئے کسی کو ٹٹول رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل گرا اور گرتے ہی حلق پھاڑ کر چلانے..... رونے لگا۔

عورت کے ہاتھ سے ترازو چھوٹ گئی۔ بیر ادھر ادھر لڑھک گئے۔ وہ بجلی کی تیزی سے بچے کی طرف لپکی۔ بچہ منہ کے بل گرا ہوا تھا۔ عورت نے اسے سیدھا کیا۔ بچے کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس سے خون بہہ رہا تھا۔ عورت کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ وہ بچے کا رال' آنسوؤں اور خون سے لتھڑا ہوا منہ چومنے لگی۔

یہ منظر دیکھ کر بلقیس بیگم کو بہت گھن آئی۔ توبہ ہے۔ اتنے گندے بچے کو کیسے چوم رہی ہے۔ کیسی گندی عورت ہے۔ انہوں نے دل میں سوچا۔

''کیا ہوا؟ میرا ابا کا گھائل ہو گیا۔'' عورت بچے سے کہہ رہی تھی۔

ارے.... اس کا خون بھی سرخ ہے! بلقیس بیگم نے دل میں سوچا۔

عورت کو شاید پہلی بار بچے کے خون بہنے کا احساس ہوا۔ اس نے تڑپ کر بلقیس بیگم کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کچھ کرنا بی بی' دیکھتی نہیں' میرا بالک گھائل ہو گیا ہے۔"

بلقیس بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔ "دوا تو گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"دوا ہم لگاتے بھی کب ہیں۔ پر پانی تو ہے نا۔"

"وہ نل لگا ہے نا۔" بلقیس بیگم نے اشارہ کیا۔

"نا بی بی.... تو آپ ہی کسی برتن میں پانی ڈال دے۔ میں دھو دوں گی۔"

بلقیس بیگم کو اس کا حکم لگانا پسند نہیں آیا۔ مگر بچے کا خون بہہ رہا تھا۔ وہ اٹھیں اور لوٹا بھر کے عورت کے پاس لے گئیں۔ پانی ڈالا تو خون فوراً رک گیا۔ لیکن اس کے نتیجے میں بچے کا چہرہ عجیب سا ہو گیا۔ چہرہ جہاں سے دھلا تھا' وہاں کے میل نے دوسری جگہ قبضہ جما لیا تھا۔

"بس کر بی بی۔ تیرا شکریہ۔" عورت نے کہا۔

بلقیس بیگم نے دیکھا کہ بچہ اور گھناؤنا لگ رہا ہے۔ "اب اس کا منہ اچھی طرح سے دھلا دے۔" انہوں نے کہا۔

وہ پانی ڈالتی رہیں۔ عورت نے بچے کا منہ دھلا ڈالا۔ دھلنے کے بعد وہ خاصا معقول لگنے لگا۔ قابل قبول وہ اب بھی نہیں تھا۔

عورت بڑی شکر گزاری سے بلقیس بیگم کو دیکھ رہی تھی۔ "بڑی مہربانی بی بی۔" اس نے کہا۔ "میں نے تم کو بڑی تکلیف دی۔ پر میں تمہارے برتن کو.... یا نلکے کو ہاتھ لگا دیتی تو تمہارا دھرم بھرشٹ ہو جاتا۔"

بلقیس بیگم بڑی حیران ہوئیں۔ "دھرم بھرشٹ ہو جاتا؟" انہوں نے دہرایا۔ ویسے وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھیں۔ اس بات کا مطلب سمجھتی تھیں۔ مگر پاکستان میں پانچ سال گزارنے کے بعد اسے بھول گئی تھیں۔ اور یہاں اس کا موقع محل بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"وہ ہم لوگ شودر ہیں نا جی.... اچھوت۔" عورت نے وضاحت کی۔ "اونچی جاتی کے ہندوؤں کے تو ہم گھر میں بھی نہیں گھس سکتے۔"

"ہمارا دھرم بھرشٹ نہیں ہو سکتا۔" بلقیس بیگم نے بڑے یقین سے کہا۔ "ہاں برتن

ناپاک ہو سکتا ہے تو ہمیں اسے پاک کرنا بھی آتا ہے۔"

بچہ روئے جا رہا تھا۔ عورت پھر اسے چمکارنے' چومنے اور چاٹنے میں مصروف ہو گئی۔

بلقیس بیگم کو پھر گھن آنے لگی۔ انہوں نے عورت کی مصروفت کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "یہ سارے بیر مجھے دے دو۔ کتنے ہوں گے؟"

عورت نے سر اٹھایا۔ "تول دیتی ہوں بی بی۔ اندازے میں بے ایمانی بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ کمی بیشی میں معاف کرتی ہوں۔"

عورت چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "سوا سیر ایک ہوں گے بی بی۔"

"کتنے کے ہوئے؟"

"ڈھائی آنے کے۔"

بلقیس بیگم نے اندر سے ایک دونی اور ایک ادھنا لا کر اسے دے دیا۔ اتنی دیر میں عورت نے نہایت بے تکلفی سے بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر بلقیس بیگم کے سینے میں آگ سی جلنے لگی۔ اس کی تپش سے بچنے کے لئے انہوں نے سوچا.... کیسی بے شرم عورت ہے۔ کھلے عام دودھ پلا رہی ہے بچے کو۔

"تم بچے کو گھر میں چھوڑ کر کیوں نہیں آتیں؟" انہوں نے عورت سے پوچھا۔

"کس کے پاس چھوڑوں بی بی۔ پتی کام پر چلا جاتا ہے۔ کوئی اور ہے نہیں۔ اور ہوتا بھی تو میں نہ چھوڑتی۔"

"کیوں؟"

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ پندرہ سال بعد بھگوان نے دیا ہے مجھے۔ کہاں کہاں اس کے لئے متھا ٹیکا' کہاں کہاں چڑھاوا دیا تب میرا راج دلارا مجھے ملا ہے اور پھر کتنا کھبصورت۔ اسے تو میں کبھی اکیلا نہ چھوڑوں۔"

بلقیس بیگم نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ دل میں سوچا اس کے بھگوان نے پندرہ سال ماتھا ٹیکنے کے بدلے یہ دیا ہے اسے۔ اور یہ اسے خوبصورت کہہ رہی ہے۔ عقل کی اندھی۔ میں تو ایسے بچے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں کبھی۔ کالا بھجنگ بھی ہے اور گندا بھی ہے۔

اسی لمحے عورت نے ان کو نظر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر صاف حقارت لکھی دیکھ کر اسے کوڑا سا لگا۔ "یہ میرے جیون کی سب سے کھبصورت چیز ہے بی بی۔ بس ذرا کالا ہے۔ پر

کالے تو نند لالہ بھی تھے۔ اور پھر بھی کھبصورت تھے۔ سب سے کھبصورت۔ اور میرے بچے کے نین نقش تو دیکھو۔ ہوگا کوئی ایسا۔" اس کے لہجے میں چیلنج آگیا۔

تیرا بھگوان تجھے پندرہ سال ماتھا ٹیکنے پر یہ بچہ دے سکتا ہے۔ بلقیس بیگم نے دل میں کہا میرا اللہ مجھے مانگنے پر ایسا بچہ نہیں دے گا۔ وہ مجھے خوبصورت بچہ دے گا.... میرے خوابوں کا بچہ..... اور انہوں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہا۔ "بچہ تو پیارا ہے۔"

لیکن ان کا لہجہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ عورت نے اسے محسوس کیا اور تڑپ گئی۔ "تجھے کیا پتہ نہیں بی بی؟" وہ بولی۔ "بچہ صرف بچہ ہوتا ہے۔ وہ رنگ نہیں ہوتا۔ وہ صورت شکل نہیں ہوتا۔ وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ماں کے دل کا سب سے کھبصورت ارمان ہوتا ہے۔ ماں کو وہ صرف کھبصورت لگتا ہے اور ماں کا دل کبھی نہیں دکھانا چاہئے۔" یہ کہہ کر اس نے بچے کو سنبھالا۔ پیسے ساڑھی کے پلو میں باندھے اور پوٹلیا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چلتی ہوں بی بی۔ بھگوان تجھ پر دیا کرے۔" اس کے لہجے میں دکھ اور شکایت تھی۔

بلقیس بیگم سن ہو کر رہ گئیں۔ وہ عورت کو دروازے سے نکلتے دیکھتی رہیں۔ اچانک ان کے اندر کسی نے کہا۔ "تو نے بہت برا کیا بلقیس۔ تو نے غرور بھی کیا اور دل بھی دکھایا۔ اللہ کو یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ اب خود سوچ کہ اس کے بعد کیا تو ماں بننے کی مستحق ہے؟"

وہ گھبرا گئیں۔ بات درست تھی۔ ایسا تکبر..... اتنے بڑے بول! ان پر لرزہ چڑھ گیا۔

اب میں کیا کروں؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔

اس عورت کو بلا۔ اس بچے کو گود میں لے، جس کی تو نے تحقیر کی ہے، جسے اللہ نے بنایا ہے اور اسے گود میں لے کر اس کی ماں کی طرح پیار کر، جس کا تو نے دل دکھایا ہے۔

لیکن یہ سوچ کر ہی انہیں کراہت آنے لگی۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

تو پھر عمر بھر اولاد کی ناکام خواہش لئے بیٹھی رہ۔

وہ گھبرا گئیں۔ اتنی بڑی محرومی اور وہ بھی عمر بھر کی.... اللہ محفوظ رکھے۔ انہوں نے محلے کے بچوں کو دیکھا، جو مزے سے بیر کھا رہے تھے۔ وہ دروازے کی طرف لپکیں۔ انہوں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ بیر والی اپنے بچے کو اٹھائے بیرک کے پہلے کوارٹر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے اسے پکارنے کا ارادہ کیا مگر اتنی دیر میں وہ موڑ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اس بار بھی وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکیں۔ پلٹ کر آئیں۔ بچوں پر نظر پڑی تو انہیں خیال آیا۔ "اقبال .... ہاشم .... بھاگ کر جاؤ۔ بیری والی کو بلا کر لاؤ۔ وہ مسجد کی طرف گئی ہے۔"

اقبال نے بیر کھاتے کھاتے سر اٹھایا اور بولا۔ "کچھ فائدہ نہیں خالہ۔ اب اس کے پاس بیر نہیں ہیں۔"

"بیر کے بچے۔ میں جو کہہ رہی ہوں۔ بلا کر لا"

"خالہ.... آپ نے سارے بیر ہمیں دلا دیئے تھے۔"

بلقیس بیگم کو غصہ آگیا۔ "حرام خورو....."

بات حرام خوروں کی سمجھ میں آئی تو وہ مسجد کی طرف دوڑے مگر دس منٹ بعد وہ ناکام واپس آئے۔ بیر والی انہیں نہیں مل سکی تھی۔

اس روز بلقیس بیگم کے دل میں یہ یقین بیٹھ گیا کہ انہوں نے دل آزاری کی ہے، اللہ کو ناراض کیا ہے۔ اب ان کی گود کبھی نہیں بھرے گی، کبھی سطح سے امید ابھرتی اور اس یقین کو دبا دیتی۔ لیکن بالآخر وہ یقین پھر ابھر آتا۔ وہ مایوس ہو جاتیں۔

جب بھی اندر دبی خواہش وجود کی دیواروں سے سر ٹکراتی، وہ صابر علی کے دفتر والی ڈسپنسری میں جا کر لیڈی ڈاکٹر سے ملتیں۔ مگر وہاں سے صبر کی تلقین اور دلاسوں کے سوا کبھی کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا۔ پھر ان کا اس ڈاکٹر پر سے اعتقاد ہی اٹھ گیا۔

56ء میں باہر کے کسی ملک سے ایک بہت مشہور ڈاکٹر آیا۔ اخبار کی خبروں اور پبلسٹی کے مطابق وہ ایسا باکمال ڈاکٹر تھا کہ اس کی کاوش کے نتیجے میں پچیس سال سے اولاد سے محروم لوگوں کے ہاں اولاد آگئی تھی۔ بلقیس بیگم نے بھی وہ خبر پڑھی اور بے تاب ہو گئیں۔ خبر کے مطابق اس ڈاکٹر کا یہاں قیام ایک ماہ کا تھا۔ اور اس عرصے میں وہ صبح اور شام کے مخصوص اوقات میں مریضوں سے ملتا تھا۔

بلقیس بیگم کے دل میں ایک شمع سی روشن ہو گئی۔ ہر شام وہ ارادہ کرتیں کہ اگلے روز ڈاکٹر سے ملنے جائیں گی۔ لیکن جا نہ پاتیں۔ بات اتنی سی تھی کہ وہ ڈاکٹر مرد تھا۔ وہ اگر لیڈی ڈاکٹر ہوتی تو شاید وہ پہلے ہی دن اس سے ملاقات کے لئے پہنچ گئی ہوتیں۔ مگر یہاں وہ بہت بڑی کشمکش سے دوچار تھیں۔ یہ سوچ کر ہی انہیں حیا آتی تھی کہ وہ ایک مرد ڈاکٹر سے علاج

کرائیں۔ اور پھر یہ معاملہ بھی اور نوعیت کا تھا۔ یہ وہ کیسے کر سکتی ہیں۔

وہ سوچتی اور الجھتی رہیں۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ ایک طرف ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی 'جو پوری ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف حیا تھی 'جو اس راہ میں مانع تھی۔ وہ مرد ڈاکٹر کے پاس ایسے نازک مسئلے کے ساتھ جائیں 'یہ ان کا دل نہیں مانتا تھا اور دماغ تھا کہ یہ فرسودہ باتیں ہیں۔ اتنی بڑی محرومی دور ہو سکتی ہے تو اس میں حرج بھی کیا۔ ڈاکٹر کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ وہ تو دکھی انسانیت کے لئے بس مہربان مسیحا ہے۔

ایک ایک کر کے اٹھائیس دن گزر گئے۔ ڈاکٹر کا بس دو دن کا قیام رہ گیا تھا۔ اگر بات صرف ان کے فیصلے کی ہوتی تو وہ یقیناً اس دن ڈاکٹر کے پاس چلی گئی ہوتیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ صابر علی کی اجازت کے بغیر وہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں اور صابر علی سے کچھ کہنے کی ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار ان کے جی میں آئی کہ وہ خاموشی سے خود ہی ڈاکٹر کے پاس چلی جائیں۔ صابر علی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ اس پر ان کا ضمیر عمر بھر انہیں ملامت کرے گا۔ دوسرے وہ یہ بھی سوچتی تھیں کہ اگر یہ بات شوہر سے کرتے ہوئے انہیں حیا آتی ہے تو ڈاکٹر کے سامنے کیا حال ہو گا۔

مگر اس روز ان کی بے تابی حد سے گزر گئی۔ اب وہ گومگو میں نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ بس دو دن بھی گزر گئے تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گی اور کون جانے....

اس رات انہوں نے دل کڑا کر کے صابر علی سے دل کی بات کہہ ہی دی۔ صابر علی بھونچکے رہ گئے۔ "تم.... تم اس ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس میں کوئی حرج ہے؟" انہوں نے مدافعانہ انداز میں پوچھا۔

"ارے.... وہ مرد ہے۔" صابر علی نے اعتراض کیا۔

"بھئی وہ ڈاکٹر ہے بس۔ اور ہماری ضرورت اتنی بڑی ہے...."

"ہماری مت کہو۔ مجھے اس سے الگ رکھو۔ یہ صرف تمہاری ضرورت ہے۔" صابر علی نے تند لہجے میں کہا۔ "اور پھر ذرا سوچو تو۔ نعوذ باللہ اولاد ڈاکٹر دے سکتا ہے کہیں۔ بھئی یہ اللہ کا کام ہے۔"

"مجھ میں کوئی کمی ہے تو ڈاکٹر بتا سکتا ہے نا۔ اسے دور کرنے کی کوئی تدبیر 'کوئی دوا بتا

ہے۔"

"تم میں کوئی کمی نہیں۔" صابر علی کا لہجہ اور تند ہو گیا۔ "سب ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"مجھے اس ڈاکٹر پر اعتماد نہیں۔" وہ بولیں۔ "اگر وہ ٹھیک کہتی ہے تو ہم محروم کیوں ہیں؟"

"خدا کی مرضی۔" صابر علی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ سبب کے بغیر یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

صابر علی یک لخت بدل گئے۔ چہرے پر چھائی ہوئی سختی دور ہو گئی۔ لہجے کی درشتی غائب ہو گئی۔ انہوں نے بہت غور سے بلقیس بیگم کو دیکھا۔ چند منٹ وہ انہیں نظریں جمائے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ "ٹھیک کہتی ہو۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس کا بھی سبب ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ دور نہیں ہو سکتا۔"

بلقیس بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے شوہر کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ "سبب کیا ہے 'مجھے بتائیے۔"

"سبب میں ہوں۔ کمی مجھ میں ہے۔" صابر علی نے سادگی سے کہا۔

وہ بہت بڑا دھماکہ تھا۔ اس کے باوجود کہ چند لمحے بلقیس بیگم بات سمجھ ہی نہیں سکیں 'اس دھماکے نے انہیں لرزا دیا۔ "کیا.... کیا مطلب؟"

"مردوں میں اولاد پیدا کرنے کی جو فطری اہلیت ہوتی ہے 'وہ مجھ میں نہیں ہے۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟"

"ہر ٹیسٹ کرا چکا ہوں۔ ڈاکٹر کا یہی کہنا ہے۔"

اب دھماکہ بلقیس بیگم کے اندر ہوا۔ ان کے وجود کے در و دیوار ہل گئے۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ سناٹے کے عالم میں۔ کچھ کہنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"مجھے تم کو پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا۔" صابر علی نے کہا۔ "مگر ہم مرد بہت چھوٹے اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ عورتوں کو ذرا سی بات پر ملامت کی سولی پر گاڑنے والے۔ اسی لئے ڈرتے ہیں۔ اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہم سے۔ اور جہاں مردانگی پر حرف آتا ہو 'خواہ درست ہو 'وہاں یہ کم ظرفی اور بڑھ جاتی ہے۔ میں بھی اس کا شکار ہو گیا۔ برسوں سے یہ بات جانتا تھا لیکن تمہیں بتانے کی ہمت نہ کر سکا۔"

بلقیس بیگم اب بھی خاموش بیٹھی تھیں۔

"سو یہ حقیقت ہے کہ مجھ میں پیدائشی کمی ہے' جو کسی طرح دور نہیں کی جاسکتی۔"

بلقیس بیگم نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔

"ہر دور میں اس طرح کی کمی دیکھنے میں آتی رہی ہے.... مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔" صابر علی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "مگر مردوں کا پتہ نہیں چلتا وہ اپنی عورت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ عورت میں کمی ہو تو مرد کو اولاد کی خاطر دوسری شادی کا حق مل جاتا ہے۔ عورت کے لئے اس انداز میں نہیں سوچا جاتا...."

"بس کریں۔ میں یہ سب سننا نہیں چاہتی۔" بلقیس بیگم کے ہونٹ ہلے۔ لرزتی ہوئی آواز نکلی۔

"میں یہ اس لئے۔ صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں۔" صابر علی کہہ رہے۔ "مجھے اپنی نااہلی کا پتہ چلا تو اولاد کی خواہش خود بخود ختم ہو گئی بلکہ بچے مجھے برے لگے۔ مگر میں نے تم سے محبت کے باوجود تمہارے محرومی کے درد کو محسوس نہیں کیا۔ ہاں آج مجھے احساس ہو رہا ہے...."

"بس کریں۔" بلقیس بیگم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔

"مجھے کہنے دو۔ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' دل کی گہرائی سے' بے حد سچائی سے کہہ رہا ہوں۔ میرے سوا دنیا میں تمہارا کوئی بھی نہیں۔ کوئی بچا ہی نہیں۔ مجھ سے تمہیں وہ خوشی نہیں مل سکتی' جو تمہارا حق ہے.... مجھ میں یہ حوصلہ بھی ہے کہ میں تمہیں آزاد کر کے خود تمہاری شادی کراؤں اور...."

"بس کیجئے۔" بلقیس بیگم نے تڑپ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ صابر علی ان کے کندھے کو تھپکتے رہے۔ بلقیس بیگم کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں عورت کے دل کو۔ سمجھتے ہی نہیں۔ ارے عورت تو اپنے شوہر کے لئے اولاد کو بھی قربان کر دیتی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں' مجھے آپ کی قیمت پر اولاد.... نہیں' ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ نے تو مجھے داغ لگا دیا یہ کہہ کر۔ مگر میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد کبھی یہ خواہش بھی نہیں کروں گی' میرے لئے یہ کوئی محرومی بھی نہیں ہوگی۔ اور اب اس لمحے کے بعد آپ بھی کچھ نہ کہئے گا مجھ سے۔"

صابر علی کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں تکتے رہے۔

وقت گزرنے لگا۔ بلقیس بیگم نے جو کہا تھا' کر دکھایا۔ خواہش تو کیا' انہوں نے کبھی اولاد کی دعا بھی نہیں کی۔ لیکن اس دعا کا وہ کیا کرتیں' جو نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کر بیٹھتا ہے۔ مگر وہ دعا لفظوں میں نہیں ہوتی تھی۔ ہاں پورا وجود مجسم دعا بن جاتا تھا اور اس ایثار کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ وہ خوش رہنے لگیں۔ آدمی کسی محرومی پر صبر کر لے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان پر سے خود ترسی کا بوجھ بھی اتر گیا تھا۔ وہ ہلکی ہو گئی تھیں۔ اس پر یہ احساس کہ وہ شوہر کی محبت اور رفاقت کا حق ادا کر رہی ہیں۔

اس دن کے بعد میاں بیوی میں اس موضوع پر بھی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ انہوں نے کبھی یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ اس روز بھی کوئی بات ہوئی تھی۔ دونوں اس دن کی گفتگو کو بھول کر زندگی میں مصروف ہو گئے تھے۔

دونوں کا انداز اب بھی اپنا اپنا تھا۔ بلقیس بیگم کی بچوں سے محبت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اولاد سے محروم تھیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ دنیا کا ہر بچہ ان کی اولاد ہے۔ وہ استانی جی بن گئیں۔ قرآن پڑھانے لگیں۔ محلے بھر کے بچے گھر میں جمع رہتے تھے۔ پڑھائی کے بعد وہ وہاں کھیلتے کودتے۔ وہ انہیں کھلاتی پلاتی بھی رہتی تھیں۔ بچے ان سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔ ان کی ایک آواز پر بلاشبہ دس بچے دوڑے آتے تھے۔ وہ اس پر سوچتیں اور خدا کا شکر ادا کرتیں۔ ضروری نہیں کہ اپنی اولاد بھی اتنی سعادت مند ہو۔ یہاں تو غیر بچے ان پر جان چھڑکتے تھے۔ پھر محرومی کیسی۔

☆

ادھر صابر علی ویسے ہی بچوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اگرچہ اب اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلقیس بیگم سمجھ سکتی تھیں کہ صابر علی صرف ان کی خوشی کی خاطر اس کا اظہار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پہلے بچوں کو گھر میں دیکھ کر ان کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ وہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے جاتے ۔ بلقیس بیگم بچوں کو کبھی ان کے کمرے میں نہیں گھسنے دیتی تھیں۔ ویسے بھی بچوں کو انہوں نے سمجھا دیا تھا کہ خالو کی موجودگی میں گھر نہ آئیں۔ ہاں کبھی بازار سے کچھ منگوانا ہوتا تو وہ کسی بچے کو پکارتیں اور اس سے سودا منگا لیتیں۔

ایک دن صابر علی نے اس پر بھی انہیں ٹوک دیا۔ مگر بڑے سلیقے سے۔ ناگواری کا اظہار کئے بغیر۔ انہوں نے کہا۔ "بلقیس' میرے گھر میں ہوتے ہوئے جو تم پڑوسی کے بچوں کو زحمت دیتی ہو یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کچھ منگوانا ہو تو مجھے کہہ دیا کرو۔"

"آپ تھکے ہارے آتے ہیں۔"

"آتا ہوں اور تمہیں دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں کہ تمہاری خاطر کوئی کام نہ کر سکوں۔"

"مگر دن بھر یہی بچے میرے کام کرتے ہیں۔"

"اس وقت میں جو موجود نہیں ہوتا۔ میری موجودگی میں تو میرا حصہ مجھی کو دیا کرو۔" یہ کہتے کہتے صابر علی کے لہجے میں شکایت آ گئی۔

بلقیس بیگم سمجھ گئیں۔ انہیں یاد تھا' صابر علی نے کبھی کہا تھا کہ بچوں کے بعد بیویوں کی توجہ شوہر سے ہٹ کر صرف بچوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ بچوں کی خواہش نہیں کرتے۔ تو اب اس معاملے میں بھی وہ بچوں کی طرح رقابت محسوس کر رہے تھے اور اس کا اظہار کر رہے تھے۔ اور اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ احساس دلا رہے تھے کہ اللہ نے

انہیں اولاد نہیں دی تو ان کے اور بلقیس بیگم کے درمیان کوئی کیوں آئے۔

اس کے بعد بلقیس بیگم اس معاملے میں احتیاط کرنے لگیں۔ جو کچھ منگوانا ہوتا' صابر علی کے آنے سے پہلے ہی منگوا لیتیں۔ اس کے باوجود کبھی اچانک کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی تو صابر علی سے کہتیں اور وہ ہنسی خوشی بازار چلے جاتے مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ وہ باہر نکلتے تو ایک گھنٹے سے پہلے گھر واپس نہ آتے۔

"آپ سے کچھ منگواؤں تو یہ مصیبت ہے۔" ایک دن انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "چیز آتے آتے اس کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اتنی دیر لگا دی آپ نے۔"

"معاف کرنا۔ باہر نکلتا ہوں تو کوئی دوست باتوں میں لگا لیتا ہے۔ ورنہ میں کہاں باہر رکنا چاہتا ہوں۔" صابر علی نے شرمندگی سے کہا۔

"خیر.... اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر چیز بھجوا دیا کریں کسی کے ہاتھ۔" بلقیس بیگم بولیں۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ صابر علی باہر وقت گزار کر آتے تھے تو بہت تازہ دم لگتے تھے۔ آنکھوں میں چمک ہوتی تھی اور وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔

کچھ عرصہ گزرا تو صابر علی کی مصروفیات اچانک بڑھ گئیں۔ وہ دیر سے گھر آنے لگے۔ بلقیس بیگم کے استفسار پر کہنے لگے۔ "ایک اضافی کام کر رہا ہوں آج کل۔"

"کچھ پتا تو چلے۔"

"پتا چل گیا تو لطف کیا۔ خوشی اچانک ملے تو بہت بڑی لگتی ہے۔"

"بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

صابر علی نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ "کہیں تم مجھ پر شک تو نہیں کر رہی ہو؟"

"لاحول ولا۔" بلقیس بیگم برا مان گئیں۔ "ایسا کوئی خیال میرے دل میں آ ہی نہیں سکتا۔"

"بس اتنا سمجھ لو کہ جو کچھ کر رہا ہوں' تمہارے ہی لئے کر رہا ہوں۔ بتاؤں گا وقت آنے پر۔" صابر علی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اب میں کچھ پوچھوں گی بھی نہیں۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر صابر علی نے کہا۔ "مجھے آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ تم بچوں کو بلا لیا کرو۔"

تھوڑے عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ صابر علی گھر واپس آتے تو بہت تھکے ہوئے ہوتے۔ کھانا کھا کر وہ ذرا دیر چہل قدمی کے لئے نکلتے۔ واپس آتے تو بستر پر گر کر بے سدھ سو جاتے۔ بلقیس بیگم اس مصروفیت کے بارے میں سوچتی رہتیں۔ اتنا وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ مصروفیت ہے تھکا دینے والی۔

پھر ایک رات وہ گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ "کل اتوار ہے۔ تمہیں میرے ساتھ کہیں چلنا ہے۔" انہوں نے آتے ہی کہا۔

"کہاں؟"

"خود دیکھ لینا۔"

اگلے روز وہ دیر تک سوئے، جیسے تھکن اتار رہے ہوں۔ اٹھ کر انہوں نے ناشتا کیا۔ پھر بلقیس بیگم کو ساتھ لے کر نکلے۔ تانگے میں بیٹھ کر وہ صدر گئے۔ وہاں سے بس میں بیٹھ گئے۔ ایک جگہ انہوں نے بلقیس بیگم سے اترنے کو کہا۔

بلقیس بیگم نے اتر کر ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

انہوں نے پوچھا۔

"لالو کھیت۔" صابر علی نے جواب دیا۔

"بڑا عجیب نام ہے۔"

"مبارک بھی ہے۔"

"آپ یہاں کیوں لائے ہیں مجھے؟"

"چلو تو سہی۔"

وہ ایک خاصے چوڑے کچے راستے پر چلتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف کچے پکے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ گلیاں تھیں۔ وہ ایسی ہی ایک گلی میں داخل ہوئے۔ ایک پکے مکان کے سامنے صابر علی نے انہیں روک دیا۔ "یہ تمہارا گھر ہے بلقیس بیگم! یہ چابی لو اور تالا کھولو۔"

"میرا گھر؟" بلقیس بیگم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں.... اس پاک سرزمین پر تمہارا اپنا گھر۔ وہ بیرک تو بس ٹھکانا تھی.... لٹے ہوؤں کی پناہ گاہ۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ مبارک ہو۔"

بلقیس بیگم کا دل خوشی سے بھر گیا۔ "ہاں.... یہ ہمارا گھر ہے۔" انہوں نے تالے میں چابی لگاتے ہوئے کہا۔

☆

گھنٹے نے بارہ بجائے تو بلقیس بیگم چونکیں۔ بارہ بج گئے۔ صرف سوچتے سوچتے۔ یہ ماضی بھی کیا چیز ہے۔ یاد کرنا چاہو تو یاد نہیں آتا۔ بھولنا چاہو تو سب کچھ یاد رہتا ہے۔ حال کا وقت بھی کھا جاتا ہے۔

وحید کی واپسی میں ابھی بہت وقت تھا۔ انہیں پھر سویٹر کا خیال آگیا۔ انہوں نے انگلیوں کو حرکت دی۔ انگلیوں کی سختی دور ہو گئی تھی۔ اب وہ بنائی کر سکتی تھیں اور اس کام کے لئے ان کے پاس کم از کم ایک گھنٹا موجود تھا۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سلائیوں میں الجھا ہوا نامکمل سویٹر اٹھا لیا۔

☆

پوری کلاس کا تعارف مکمل ہو چکا تھا!

یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ حمید احمد نے دل میں سوچا۔ "بہت بہت شکریہ۔" اس نے اسٹوڈنٹس سے کہا۔ "آج ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا اور جانا۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا ساتھ کامیاب اور فیض بخش ثابت ہوگا اور ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھیں گے۔ میں ہر طرح سے آپ کے لئے حاضر ہوں۔"

اچانک ہی ایک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ حمید احمد نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی، جو اس کی آمد کے بعد تمام اسٹوڈنٹس کے بیٹھ جانے کے باوجود خود فراموشی کی سی کیفیت میں کھڑی رہی تھی۔ اس وقت اسے دیکھتے ہوئے حمید کو خیال آیا کہ وہ بہت جانی پہچانی لگ رہی ہے، جیسے اس نے اسے بہت دیکھا ہو۔ اس کے ساتھ بہت وقت گزارا ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ لڑکی ٹین ایجر تھی۔ شاید کوئی شباہت کا معاملہ تھا۔

"جی مس مدیحہ حامد؟" حمید نے اپنی یادداشت کا مظاہرہ کیا۔ پہلے تعارف کے بعد اپنا ہر اسٹوڈنٹ اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔

"میں کچھ کہنا چاہتی ہوں سر؟"

"جی کہیے۔ میں سن رہا ہوں۔"

"آپ نے اپنا مکمل تعارف نہیں کرایا سر!"

حمید نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "جتنا آپ لوگوں کو جاننا چاہئے' اپنا تعارف میں کرادیا ہے۔"

"مگر یہ نامکمل ہے سر۔"

"اس سے زیادہ کی ضرورت بھی تو نہیں۔"

"ضرورت تو ہے سر!" لڑکی نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"آپ نے فرمایا کہ آپ ہمارے بہترین دوست بھی ہیں۔ تو سر دوستوں کو ایک دوسر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہونا چاہئے۔"

حمید لاجواب ہو گیا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "آپ میر بارے میں کیا جاننا چاہتی ہیں؟"

"سب کچھ.... جو آپ کی ذات سے متعلق ہو۔"

"یہ تو بہت وقت طلب اور تفصیلی ہوا۔ جبکہ میرا پیریڈ ختم ہونے والا ہے۔" حمید نے عذ پیش کیا۔

لڑکی اب بھی کھڑی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں سر!"

حمید پریشان ہو گیا۔ اس کے تدریسی کیریئر میں پہلا موقع تھا کہ اس سے تفصیلی اور ذا تعارف کی فرمائش کی جا رہی تھی اور وہ اپنی ہی بات کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ دامن نہیں سکتا تھا۔ مگر اپنی نجی زندگی' اپنے دکھوں اور پریشانیوں کے بارے میں گفتگو کرنا اس کے لئے ناقابل قبول تھا۔ اب کیا' کیا جائے؟ پہلے مرحلے میں اسے مہلت حاصل کرنا تھی تاکہ کوئی ترکیب سوچی جاسکے۔ "ٹھیک ہے' آپ پوچھیں۔" اس نے کہا۔

پہلا سوال ہی پرسنل تھا۔ "آپ کی عمر کیا ہے سر؟" مدیحہ نے پوچھا۔

"یہ غیر ضروری ہے۔ دوستی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔"

"لیکن استاد کی حیثیت سے اس کی اہمیت ہے۔"

حمید خوش تھا کہ اسے موقع مل گیا۔ اب اسے یہ کوشش کرنی تھی کہ اس گھماؤ پھراؤ میں

پندرہ منٹ گزر جائیں اور پیریڈ مکمل ہو جائے۔ "چلو.... مان لیا۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تمہارا اندازہ کیا ہے؟"

"تیس.... زیادہ سے زیادہ بتیس سال۔" مدیحہ نے جھجکے بغیر کہا۔

حمید کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "میں بتا چکا ہوں کہ میرا تدریسی کیریئر سولہ برس پر محیط ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میری عمر اتنی کم ہو۔"

"مجھے جو لگی میں نے بتادی۔ آپ تصحیح کردیں۔" مدیحہ نے معصومیت سے کہا۔

نہ جانے کیوں.... بلا ارادہ' بے ساختہ حمید نے اپنی عمر میں تین سال کا اضافہ کردیا "میری عمر بیالیس سال ہے۔" اس نے کہا۔

کلاس میں اس پر گفتگو شروع ہو گئی کہ اس کی عمر اتنی لگتی نہیں۔ حمید گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا لمحے سست رفتاری سے گزر رہے تھے۔

مدیحہ حامد اب بھی کھڑی تھی۔ "اور سر.... اپنی تاریخ پیدائش بھی بتادیجئے۔"

حمید مسکرایا۔ "اس میں تمہیں کیا دلچسپی ہے؟ میرا اسٹار جاننا چاہتی ہو؟"

"یس سر!"

"تو تاریخ پیدائش کی بجائے یہی پوچھ لیتیں۔" حمید نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ موضوع اچھا ہے۔ اس پر بحث کر کے اسے طول دے کر باقی وقت باآسانی گزارا جاسکتا ہے۔ "اور اس کی ضرورت کیا ہے۔؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق تو پڑتا ہے سر۔ اس کے حوالے سے ہم دوسروں کو بہتر طور پر جان سکتے ہیں.... سمجھ سکتے ہیں اور ہمارے لئے اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ ہم آپ کے مزاج' آپ کی پسند ناپسند سے واقف ہوں۔ جانتے ہوں کہ آپ کن باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور کن باتوں سے ناراض۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ اسٹار معلوم ہو جانے کے بعد تم یہ سب جان لوگی؟" حمید کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

"جی.... کسی نہ کسی حد تک۔ انڈر سٹینڈنگ کی ایک بنیاد ہمیں مل جائے گی۔"

"دیکھتے ہیں۔" حمید نے پھر چیلنج کیا۔ "اور میں تمہیں بتادوں کہ میں ورگو ہوں.... سنبلہ۔"

مدیحہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ لگتا تھا کہ یہ اس کے لئے خلاف توقع ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ پھر اس کے نیچے سے ایک چمک ابھری اور وہ مسکرائی لیکن اب بھی وہ کچھ بولی نہیں۔

"اب بتاؤ' میرے بارے میں کیا جانا تم نے؟" حمید نے کہا۔

"بہت کچھ سر!" مدیحہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ اب وہ سنبھل چکی تھی۔

"مثلاً؟"

"آپ بے حد ذہین ہیں۔ آپ کے لئے دماغ سے سوچنے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ آپ کے پاس تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ عیب اور خامی آپ کو پسند نہیں.... کسی چیز میں' نہ انسان میں۔ حتیٰ کہ خود میں بھی نہیں۔ اور آپ کی ناقد نظر کسی بھی عیب یا خامی تک فوراً پہنچ جاتی ہیں اور آپ اس پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ خواہ اس کے نتیجے میں کسی کی دل آزاری ہو جائے۔ آپ ہر چیز کو' ہر انسان کو' خود کو پرفیکٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے خوش زیادہ رہتے ہیں' خوش کم ہی ہوتے ہیں۔ طبعاً آپ شرمیلے ہیں۔ اپنے جذبات کا اظہار کرنا آپ کو پسند نہیں۔ صحت اور صفائی سے آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ گندگی اور بے ترتیبی آپ کو سخت ناپسند ہے۔ ایسے ماحول میں رہنا پڑ جائے تو آپ بیمار ہو جائیں گے۔"

اب کے حیران ہونے کی باری حمید کی تھی۔ اس لڑکی نے جو کچھ کہا' درست تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے آرپار دیکھ رہی ہے۔ اور حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ سال ہو گی۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس کا آسٹرالوجی کا مطالعہ اتنا وسیع ہو گا۔ بہر حال یہ پتہ تو چل گیا کہ وہ مطالعے کی شوقین ہے اور آسٹرالوجی میں اسے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔

اسی لمحے حمید کو اس کی چھٹی حس نے بہت کچھ بتا دیا۔ کیسے اور کیوں کا تو اسے پتہ نہیں تھا مگر اس نے یہ سمجھ لیا کہ یہ لڑکی مدیحہ حامد اس کے لئے چیلنج بن سکتی ہے.... مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ اسے اہمیت کا احساس دلانا اور خود اعتمادی دینا خود اس کے لئے آزمائش ثابت ہو سکتا ہے۔ اسے اس بات کا خیال رکھنا ہو گا۔

چنانچہ اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کچھ اور مس حامد!"

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتی سر۔ لیکن میں نے پڑھا ہے کہ ورگو میں تجرد کی زندگی گزارنے

کا رجحان ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ ورگو ہی تجرد کی زندگی گزارتے ہیں۔" مدیحہ نے بے حد معصومیت سے کہا۔

اس بار حمید سناٹے میں آ گیا۔ لیکن اس نے اتنی ہی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

"شکریہ مدیحہ۔ آپ نے جو کچھ میرے بارے میں بتایا' بیشتر درست تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میری کلاس...." اس نے دانستہ تم کہنے سے گریز کیا۔ "ان معلومات سے کس حد تک استفادہ کرتی ہے۔ اب آپ بیٹھ جائیں پلیز!"

"لیکن سر' مجھے اور بھی کچھ پوچھنا ہے۔"

حمید نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلی۔ "سوری مدیحہ۔ وقت ہو چکا۔ مجھے اسٹاف روم میں اپنے کولیگز سے بھی ملنا ہے۔" اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا پھر کلاس سے مخاطب ہوا۔ "آپ سب سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب آئندہ پیریڈ سے ہم پڑھائی شروع کریں گے۔ آپ کے تعاون کا بہت شکریہ۔"

وہ کلاس روم سے رخصت ہو گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ پسینہ؟ اور وہ بھی یکم جنوری کو! اس لڑکی کی آخری بات نے اسے دہلا دیا تھا۔ خدا کا شکر کہ پیریڈ کا وقت بروقت ختم ہو گیا۔

☆

کلاس روم آوازوں سے بھر گیا۔ سب لوگ باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ صرف لڑکیاں اپنی جگہ بیٹھی لڑکوں کے باہر جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور لڑکے جیسے جیسے باہر جا رہے تھے کمرے میں موجود آوازوں کا حجم گھٹتا جا رہا تھا۔

پھر لڑکیاں بھی اٹھنے لگیں!

نسرین نے ساتھ بیٹھی مدیحہ کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ یوں بیٹھی تھی' جیسے کسی ٹرانس میں ہو' جیسے اسے گرد و پیش کا احساس ہی نہ ہو۔ "ارے کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔ اٹھو نا۔" نسرین نے اسے ٹہوکا دیا۔

مدیحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو۔"

باہر نکلتے ہوئے نسرین نے کہا "چائے کا موڈ ہے۔ کینٹین چلیں؟"

"نہیں بھئی۔ اب تو میں بس گھر جانا چاہتی ہوں۔"

وہ اس طرف چل دیں' جہاں مدیحہ نے کار کھڑی کی تھی۔

واپسی کے سفر میں کار میں بڑی خاموشی تھی۔ "کیا بات ہے؟ بہت چپ چپ ہو" نسرین نے کہا۔

"نیند آرہی ہے۔ رات دیر سے سوئی تھی نا۔ نیند پوری نہیں ہوئی۔"

"تب بھی۔ کچھ بولو نا۔ یہ نئے سر کیسے لگے تمہیں؟"

"بہت.... " مدیحہ کہتے کہتے رک گئی۔ "ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"یہ بتاؤ تم انہیں دیکھ کر حیران کیوں ہوئی تھیں؟"

"میں کب حیران ہوئی تھی؟"

"ارے تو یونہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔"

"اچھا وہ.... دراصل میرا سر کا جو تصور ہے' حمید صاحب اس سے بالکل مختلف تھے۔ بات ہے' پہلی نظر میں وہ مجھے سر لگے ہی نہیں۔"

"تو کیا لگے؟"

"ہیرو!" مدیحہ نے بے ساختہ کہا پھر احساس ہوا تو بات کا رخ بدلنے کے لئے اس نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ "فلمی ہیرو۔"

"اور تمہیں ان کی عمر بہت کم لگی۔ اتنے ننھے بھی نہیں ہیں وہ۔"

"اور اتنے بڑے بھی نہیں ہیں' جتنا انہوں نے بتایا۔"

"تم سے گھبرا کر عمر بڑھا کے بتائی ہوگی انہوں نے۔"

"مجھ سے کیوں گھبرانے لگے وہ؟"

"فدا ہو جانے والی نظروں سے جو دیکھے جا رہی تھی۔"

"اچھا.... ختم کرو اس بات کو۔" مدیحہ نے چڑ کر کہا۔

نسرین خاموش ہو گئی۔ مگر وہ سوچنے سے تو باز نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دن ہی غیر معمولی تھا ہر بات غیر معمولی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ سر حمید کو دیکھ کر اسے بھی شاک لگا تھا۔ اتنے جوان اور خوب صورت' ہر رد عمل غیر معمولی تھا۔ وہ جس طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ جیسے اس نے مکمل تعارف کا مطالبہ کیا تھا۔ جیسے اس نے آسٹرالوجی کے حوالے سے بات کی تھی اور پھر کلاس ختم ہو جانے کے بعد وہ اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت اور اب؛

چڑچڑاپن جبکہ عام حالات میں وہ بے حد خوش مزاج لڑکی تھی۔

نسرین جانتی تھی کہ اس کی اور مدیحہ کی دوستی بھی غیر معمولی ہے۔ معاشی اعتبار سے دونوں کے گھرانے ہم پلہ تھے۔ لیکن مزاج اور رہن سہن بالکل متضاد تھا۔ نسرین کے گھرانے کا مزاج مذہبی تھا جبکہ مدیحہ کا گھرانا آزاد اور مذہب سے بہت دور تھا۔ وہاں شراب بھی پی جاتی تھی اور مخلوط پارٹیوں میں بھی شرکت کی جاتی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلقات کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں مدیحہ جیسی لڑکی کا ہونا' جیسے کہ وہ تھی یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ ایک دن خود مدیحہ نے کہا تھا۔ "نسرین' اگر اسکول میں تم سے دوستی نہ ہو گئی ہوتی تو نہ جانے میں کیا ہوتی۔"

"تب بھی تم یہی ہوتیں۔" نسرین نے جواب میں کہا تھا۔ "کیونکہ تمہیں اللہ نے بہت اچھی روح دی ہے۔"

سو نسرین برسوں سے مدیحہ کو جانتی تھی۔ وہ اس کے نظریات' اس کی سوچوں تک سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مدیحہ محبت کی بھوکی ہے۔ اسے گھر میں کسی سے بھی وہ محبت اور توجہ نہیں ملی جس کی اسے ضرورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مدیحہ کے اندر محبت کا ایک خزانہ چھپا ہے۔ وہ کسی کی منتظر ہے۔ لیکن وہ مثالیہ پسند تھی۔ اس نے اپنی پسند کا جو معیار رکھا تھا' اس پر پورا اُترنا کسی لڑکے کے لئے آسان نہیں تھا لیکن اگر ایسا کوئی شخص اسے مل گیا تو وہ اپنی محبت کا خزانہ اس پر نچھاور کر دے گی اور یہ بھی تھا کہ مدیحہ مستقل مزاج اور دھن کی پکی تھی۔ وہ ضد نہیں کرتی تھی.... اور کرتی تھی تو کسی بڑے معاملے میں۔ اور ضد کر لے تو پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔

اس روشنی میں آج کی صورت حال....

"لو بھئی' تمہارا گھر آگیا۔" مدیحہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا۔ گاڑی اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ نسرین گاڑی سے اتر گئی۔ "اچھا مدیحہ' خدا حافظ۔ ڈراپ کرنے کا شکریہ۔"

"یو آر ویلکم۔ کل ملیں گے۔"

"جی نہیں۔ کل جمعہ ہے۔ چھٹی ہے' مگر تمہیں تو ہوش ہی نہیں ہے آج۔"

مدیحہ ایک لمحے کو کھسیا گئی۔ پھر اس نے خدا حافظ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆

گھر پہنچتے ہی مدیحہ رات کی نیند پوری کرنے کے ارادے سے لیٹ گئی۔ مگر لیٹی تو ا
نہیں آئی۔ اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا اور جب تم الجھنیں سلجھ نہ جاتیں' اسے سکون نہ
تھا۔ اسی لئے وہ ان پر سوچنے لگی۔

یہ سب کچھ سوکس کے نئے سر کی پہلی جھلک کے ساتھ شروع ہوا تھا اور سب ک
اچانک اور تیز رفتاری کے ساتھ ہوا تھا کہ اسے سنبھلنے اور سمجھنے میں خاصی دیر لگی۔

حمید صاحب کو دیکھنے کے بعد اس کا پہلا ردعمل مایوسی کا تھا۔ وجہ....؟ اس نے س
کہ وہ جانے والے سر فرقان جیسے ہی ہوں گے لیکن وہ ان سے بالکل مختلف تھے۔ اب
اور سمجھ سکتی تھی کہ اس کا ردعمل غیر فطری تھا۔ اس کا ردعمل تو خوش گوار ہونا چاہ
جبکہ مایوسی منفی چیز ہوتی ہے۔

اور اگلے ہی لمحے اس کی مایوسی جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہیں سے اس کی الجھ
آغاز ہو گیا تھا کیونکہ جھنجلاہٹ کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سر حمید بہت اچھے
انہیں دیکھ کر مایوس ہونا اور جھنجلانا ناقابل فہم تھا۔

اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی.... پاگلوں کی طرح یہاں تک کہ نئے سر کو اسے بٹھانے
لئے ٹوکنا پڑ گیا۔ بھری کلاس میں ایسا اس کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بہت ا
دماغ تھی۔ اس کی حاضر جوابی سے تو سب گھبراتے تھے۔ کیسی خفت ہوئی تھی اسے۔

سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ سوچ سوچ کر الجھتی رہی مگر ذہن میں اندھیرا تھا۔ کچھ
میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک تو غیر فطری ردعمل اور اس پر خود فراموشی کی کیفیت۔ کیا م
دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گیا تھا....

اس آخری سوال کا جواب اس کے لاشعور سے ابھرا.... ہاں' یہی بات ہے۔ اور اس
ساتھ ہی اسے شاک لگا۔ یہ کیا بکواس ہے۔

'کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔' لاشعور کی ابھاری ہوئی سوچ نے بے حد آہ
سے سرگوشی کی۔

عشق! وہ سناٹے میں رہ گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بات کیا ہے؟ یہ عشق کہاں سے آ گیا؟ ا
کیسے ہو سکتا ہے کہ جسے عشق ہو' وہ خود ہی بے خبر ہو۔

ذہن اچانک ہی خالی ہو گیا.... سادہ سلیٹ کی طرح۔ اب کہیں کوئی سوچ بھی نہیں تھی۔
سوال وہی تھا۔ وہ کھڑی کی کھڑی کیوں رہ گئی تھی؟ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ کیسی خود فراموشی
تھی؟ خود فراموشی....

اس بار لاشعور نے ایک جادوئی لفظ شعور کی طرف اچھالا.... سحر زدگی....
ہاں.... میں سحر زدہ تھی.... مسحور ہو گئی تھی۔ اس نے اعتراف کیا۔ مگر کیوں؟ سحر
زدہ.... مسحور.... نئے سر.... حمید صاحب کو دیکھ کر....!

اس بار اس کے تصور میں تصویری معمے کے تمام گم شدہ ٹکڑے آ گرے۔ اس نے سمجھ لیا
کہ اسے صرف ان ٹکڑوں کو ان کی جگہ لگانا ہے۔ پھر تصویر مکمل ہو جائے گی۔ معما حل ہو
جائے گا۔ اس نے ان ٹکڑوں کو ارینج کئے بغیر یہ بھی جان لیا کہ تمام الجھنیں ذیلی اور پر فریب
ہیں۔ اصل الجھن ایک ہی ہے۔ ہر سوال کا جواب ایک ہی ہے۔ اور جواب کے لئے اسے
تصویری ٹکڑوں کو درست طور پر ارینج کرنا ہے۔

اور تصویری ٹکڑوں کو ارینج کرتے ہی وہ حیران رہ گئی۔ وہ تو تصویر محبت تھی.... عشق
.... کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

بات اتنی تیزی سے اس کی سمجھ میں آئی کہ ترتیب دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ بات اسے
نہال کر گئی۔ سب کچھ سمجھا دیا اسے۔ وہ حمید صاحب کو دیکھ کر مسحور ہوئی تھی.... کھڑی
کی کھڑی رہ گئی تھی۔

کیوں.... ابھری بھی نہیں تھی کہ کیوں کا جواب اس کے ذہن میں بجلی کی طرح
کوند گیا۔ اس نے اپنے لئے مثالی جیون ساتھی.... مثالی مرد کا جو خاکہ بنایا تھا' حمید احمد ہو بہو
ویسے ہی تھے۔ وہی فکر' سوچ اور ذہن کی پختگی۔ وہی باوقار شخصیت' وہی سختی کی جگہ سختی اور
نرمی کی جگہ نرمی۔ وہی مطالعے اور علم کی گہرائی۔ وہی خوش اطواری و خوش گفتاری۔ وہی با
رعب آواز' وہی نرم و گداز اور دل نشیں لہجہ۔ ہاں.... وہ بالکل ویسے ہی تھے' جیسا اس نے
سوچا اور چاہا تھا۔

تو سیدھی سچی حقیقت یہ تھی کہ اسے پہلی نظر میں حمید احمد سے محبت ہو گئی تھی اور یہ کوئی
غیر فطری بات نہیں تھی۔ وہ پچھلے دو ڈھائی سال سے سوچوں میں ان کا پیکر تراش رہی تھی۔
اب وہ مجسم اس کے سامنے آ گئے تھے۔ اسے ان سے محبت نہ ہوتی تو یہ غیر فطری بات ہوتی۔

ہاں انہیں دیکھنے کے بعد اس کا فوری رد عمل غیر فطری تھا۔ پہلے مایوسی اور جھنجلاہٹ۔ مگر اب کڑیاں ملتی جا رہی تھی۔ اس کا وہ رد عمل بھی غیر فطری نہیں تھا۔ کوئی اپنے استاد کی پہلی جھلک دیکھنے کا منتظر ہو اور استاد کے لئے اس کے ذہن میں کسی مہربان، شفیق بزرگ ہستی کا تصور ہو اور استاد اسے جوان اور خوب رو نظر آئے تو مایوسی تو ہو گی۔

اور کسی نے اپنے لئے مثالی محبوب کا پیکر تراشا اور وہ پیکر اسے کلاس روم میں داخل ہو والے اپنے نئے استاد کے روپ میں نظر آئے تو اسے مایوسی بھی ہو گی اور جھنجلاہٹ بھی غیر فطری تو نہیں۔

مدیحہ نے سکون کی سانس لی۔ دل و دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ وہ خواہ مخواہ پریشا ہو رہی تھی۔ یہ تو اس کی زندگی کا سب سے یادگار، سب سے خوبصورت دن تھا۔ وہ تو اس زندگی کے لئے بہاروں کی نوید لایا تھا۔

اور اس یادگار دن کے حوالے پر اسے اخبار کا کالم.... آج کا دن کیسا گزرے گا.... گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے لئے کالم کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ لفظ بہ درست۔ بلکہ لگتا تھا کہ وہ لکھی ہی اس کے لئے گئی ہے۔ آج اسے اس کا پرنس چارمنگ۔ ا کے خوابوں کا وہ شہزادہ مل گیا تھا، جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ بس وہ کالم مشورے.... جھجکنا چھوڑیئے اور دل کی بات کہنے میں دیر نہ کیجئے... پر عمل نہیں کر تھی۔

لیکن وہ اس پر عمل کیسے کرتی؟ کلاس میں، سب کے سامنے دل کی بات کہہ دیتی۔ پھر وہ جھجک کو بالائے طاق رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ان سے مکمل اور تفصیلی تعارف مطالبہ کر دیا تھا۔ اس نے ان سے ان کی تاریخ پیدائش پوچھی تھی۔ وہ تو معلوم نہیں ہو لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ورگو ہیں۔ ورگو! پیش گوئی کے مطابق انہیں ورگو ہی چاہئے تھا۔ ورگو سن کر تو اس کا دل چند لمحوں کے لئے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ صبح اس نے کالم میں ورگو کا میسیج سرسری طور پر پڑھا تھا۔ اسے بس اتنا یاد کہ وہ جدی کے میسیج سے میچ کرتا تھا۔ مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اسے غور سے پڑ اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

وہ نیچے گئی اور اخبار کا وہ حصہ لے آئی، جس میں کالم چھپا تھا۔ بستر پر دراز ہو کر اس

ورگو کے میسیج کو پڑھا۔ سچ تھا۔ صبح اس نے صرف اپنے کام کی بات پڑھی تھی۔ پورے میسیج پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اب اس نے اسے کئی بار پڑھا۔ وہ بھی بالکل واضح تھا۔ لکھا تھا.... سچی اور لازوال محبت آج آپ کے دل کے دروازے پر دستک دینے والی ہے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے سنتے ہیں یا نہیں، دروازے کھولتے ہیں یا نہیں۔ ڈر ہے کہ آپ انا کی خاطر بے جا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے مسترد کر دیں گے۔ جدی کا کردار نمایاں ہے۔ لکی نمبر 4 ہے۔

وہ بجھ سی گئی۔ ایک جملہ بے حد دل شکن تھا۔ انا.... بے جا ہٹ دھرمی.... استرداد۔ کیا اس کے ساتھ ایسا ہو گا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس جملے میں یقین نہیں ہے۔ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ محض ایک امکان ہے اور ضروری نہیں کہ امکان پورا بھی ہو۔ اور پھر مقابلے پر لازوال محبت ہے.... لازوال.... کبھی نہ مٹنے والی محبت۔ اور آخری حصہ تو صاف اعلان کر رہا تھا کہ سنبلہ کو ملنے والی وہ محبت کسی جدی کی ہو گی۔ اور وہ جدی تھی!

اس نے اخبار کو ایک طرف اچھال دیا اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ہر پریشانی اور الجھن دور ہو چکی تھی۔ اس اس کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ "اب غور سے میری بات سن لیں مسٹر ورگو!" وہ نندا سی آواز میں بڑبڑائی۔ "تمہارے دل کے دروازے پر سچی اور لازوال محبت نے دستک دے دی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ دروازہ کھول دیں۔ ورنہ یہ محبت زبردست بھی ہے۔ دروازہ توڑ دے گی۔"

چند لمحے بعد وہ بے خبر سو رہی تھی!

☆

حمید احمد کو اپنا یہ نیا کالج بہت اچھا لگا تھا۔ یہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ سب سے بڑی بار کہ وہ پڑھائی کے لئے بہت سازگار ماحول تھا۔ ایسی بات نہیں۔ کچھ طلباء یہاں بھی ایسے جو تفریح کی غرض سے کالج آتے تھے۔ مگر وہ بھی دوسروں کی پڑھائی ڈسٹرب نہیں کر تھے۔ ہاں' وہ کلاسز کم ہی اٹینڈ کرتے تھے۔ ان میں چند ایک تو ایسے تھے کہ انہیں اس کا میں تین سال ہو گئے تھے وہ سب کے سب بیک بنچرز تھے۔ حمید کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ رہ گئے دوسرے اسٹوڈنٹس۔ تو وہ پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھے۔

سو حمید احمد یہاں آکر بہت خوش تھے۔ بس ایک خلش انہیں ستاتی تھی۔ اور وہ پہلے پہلی ہی کلاس سے ان کے ساتھ تھی۔ انہیں وہ دن خوب یاد تھا' جب انہوں نے اس کالج پہلی کلاس لی تھی۔ وہ کلاس روم میں داخل ہوئے تو سب ان کے احترام میں کھڑے ہو تھے۔ پھر جب سب بیٹھ گئے' تب بھی ایک لڑکی خود فراموشی کی سی کیفیت میں کھڑی ر تھی۔ بعد میں اسی لڑکی نے تعارف کے نام پر ان کی نجی زندگی کو کریدنے کی کوشش کی تھ وہ لڑکی ابھی تک ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں بنی تھی۔ لیکن انہیں لگتا تھا کہ مستقبل میں بلکہ مستقبل قریب میں ایسا ضرور ہو گا۔

اس نئے کالج میں انہیں ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ یہاں پڑھانے کا لطف بھی آ رہا تھا۔ مگر سیکنڈ ایئر کی کلاس سے خوف کھانے لگے تھے۔ لیکن نہیں.... یہ کہنا تو غلط ہو گا۔ دراصل اس لڑکی سے خوف زدہ تھے۔

ویسے مدیحہ نام کی وہ لڑکی بہت پیاری تھی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی' جو خوف کرنے والی ہو۔ اس کے مزاج میں تو جارحیت بھی نہیں تھی۔ وہ بہت ویل مینرڈ تھ صورت شکل کی بھی بہت اچھی تھی۔ خرابی بس یہ تھی کہ ان کے کلاس روم میں داخل ہونے کے پہلے لمحے سے آخری لمحے تک وہ انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی تھی۔ وہ

بھی اس کی طرف دیکھتے' اسے خود کو تکتا پاتے۔ اب ایسے میں آدمی ڈسٹرب تو ہو گا۔

حمید احمد نے اس کا علاج یہ نکالا کہ اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا۔

مگر بچت اس میں بھی نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد ہی انہیں اس کی نظروں کی چبھن اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگتی۔ اس کے نتیجے میں گدگدی سی ہوتی اور وہ بھول جاتے کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ایک لیکچرار کے لئے تسلسل کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بہت زیادہ ڈسٹرب ہونے لگے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس سے تو بہتر پہلی صورت حال ہی تھی۔

کوئی لیکچرار جب کلاس میں لیکچر دے رہا ہوتا ہے تو در حقیقت وہ سب کو دیکھتا ہے۔ مگر کسی خاص اسٹوڈنٹ کو نہیں دیکھتا۔ لیکچر ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے۔ وہ ایک اجتماعی چیز ہوتی ہے۔ حمید احمد کے ساتھ بھی یہی تھا۔ وہ اس لڑکی کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پاتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی نگاہ کی کیا کیفیت ہے۔ بہر حال انہیں یہ پریشانی تھی بھی نہیں۔ وہ برسوں سے پڑھا رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اسٹوڈنٹ اپنے ٹیچرز کو آئیڈیل بھی بنا لیتے ہیں اور ان سے بے حد محبت بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی بیسیوں مرتبہ ایسا ہو چکا تھا ان کے اسٹوڈنٹ تو ان سے زیادہ ہی محبت کرتے تھے۔

کلاس سے سوال کرنے کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ٹیچر اپنے مخاطب پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حمید احمد بالکل اچانک مدیحہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر دیکھ کر حمید احمد کو تشویش ہونے لگی۔ لڑکی کی نگاہوں میں عجیب سی وارفتگی اور والہانہ پن تھا۔ اور اب بھی اس کی پلکیں نہیں جھپک رہی تھیں۔

"مدیحہ.... آپ بتائیے کہ شہریت کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

مدیحہ گڑبڑا گئی۔ "سر.... صفائی...." وہ کہتے کہتے رکی' جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ وہ غلط جواب دینے والی ہے۔ پھر اس نے دھیمے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "آئی ایم سوری سر۔ میں آپ کی باتوں پر CONCENTRATE نہیں کر سکی تھی۔"

اس پر پوری کلاس نے جس انداز میں مدیحہ کو دیکھا' اس سے حمید احمد بہت کچھ سمجھ گئے۔ مدیحہ یقیناً بہت برائٹ لڑکی تھی۔ کلاس میں کسی کو اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے گی۔ یہ سب کے لئے ایک غیر معمولی بات تھی۔

"مدیحہ پلیز.... آپ اپنی توجہ میری طرف رکھیئے۔"

"سر' میری پوری توجہ آپ ہی کی طرف ہے۔" مدیحہ نے بے ساختہ کہا۔

حمید احمد گڑبڑا گئے۔ وہ چور سے بن گئے۔ لڑکی نے سچی بات کہی تھی۔ مسئلہ یہی تھا کہ ا کی توجہ ان پر تھی' لیکچر پر نہیں۔

حمید احمد کو امید تھی کہ اب لڑکی کا رویہ بہتر ہو جائے گا لیکن اس میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ وہ اسی طرح انہیں والہانہ وارفتہ نگاہوں سے تکتی رہتی تھی۔ اور اب حمید احمد ہمت نہیں تھی کہ اس سے کوئی سوال کرتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کلاس کو اس بات چلے۔ ذرا سی دیر میں بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ شک کا شائبہ بھی پیدا نہ ہونے میں ہی عا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کے معاملے میں اسے نظر انداز کر دیا۔

پہلے دن جب لڑکی نے تعارف کا مطالبہ کیا تھا' اس سے حمید احمد سمجھے تھے کہ اس مزاج میں جارحیت ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگلے روز وہ پھر ان سے تفصیلی تعارف کا م کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حمید احمد مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اس کے بارے میں ا تاثر کی اصلاح کر لی۔

انہیں اب یہ فکر تھی کہ کلاس میں کسی کو پتہ نہ چلے کہ مدیحہ تمام وقت انہیں تکتی ر ہے۔ ایسا ہو گیا تو ذرا سی دیر میں اسکینڈل بن جائے گا اور یہ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ ل اس معاملے میں ان کا اختیار کچھ بھی نہیں تھا۔ بس انہوں نے یہ کیا کہ مدیحہ کی طرف مت ہونا چھوڑ دیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے تو پوری کلاس اس کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ او مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔

حمید احمد کو اس لڑکی کے بارے میں ایک الجھن بھی تھی' جو ایک ہفتہ گزرنے کے با دُور نہیں ہو سکی تھی۔ پہلی بار ہی وہ انہیں جانی پہچانی سی لگی تھی۔ حالانکہ یہ بھی یقین تھا اس سے پہلے انہوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ انہو نے اسے بہت دیکھا ہے.... شاید اس میں کسی کی مشابہت تھی۔ کس کی.... یہ انہیں ذ پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آتا تھا۔

انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور گہری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی کلا وقت ہو گیا تھا اور کلاس وہی تھی.... سیکنڈ ایئر کی!

☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ مدیحہ جیسے بادلوں پر اُڑ رہی تھی!

ان دنوں وہ ایک ایسی خوب صورت کیفیت میں تھی' جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کیفیت ایک مکمل دنیا تھی.... باہر کی دنیا سے بالکل الگ' جس میں وہ رہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ رنگ تھے کہ کہیں کوئی بدصورتی اسے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔ ایک سرشاری سی تھی' ایک خوب صورت سا نشہ تھا' جو خون میں سرایت کر گیا تھا اور اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ وہ چلتی تھی تو جھومتی تھی۔ بیٹھتی تھی تو جیسے وجد میں ہوتی۔ دل جیسے سینے میں رقص کرتا۔ ذہن میں خوب صورت لفظوں کا ہجوم تھا' جو اس کیفیت کو جملوں کے ذریعے بیان کرنے کے لئے صرف حسن ترتیب کا محتاج تھا۔ لیکن وہ نہ شاعر تھی' نہ نثر نگار کہ ان مہکتے لفظوں کو پرو پاتی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کچھ لکھنا چاہتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اس کی زباں چپ تھی۔ ایک پل کے لئے اسے بے بسی کا احساس ہوتا۔ لیکن پھر وہ دوبارہ خود سپردگی کے حصار میں محفوظ ہو جاتی۔

بس ایک بار اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کیا ہے۔ یہ میرے وجود کی زمین پر محبت کا پہلا موسم اترا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اس موسم میں کتنی ہی رتیں آئیں' یہ موسم کبھی بدلے گا نہیں' کبھی جائے گا نہیں۔ یہ ہمیشہ میرے وجود پر چھایا رہے گا۔

مختصر یہ کہ وہ بہت خوش تھی!

اب اسے دو ہی جگہیں اچھی لگتی تھیں۔ اپنے کمرے کی تنہائی اور کلاس روم میں سوکس کا پیریڈ۔ ایک جگہ وہ خود سے.... اپنی محبت سے مل سکتی تھی اور دوسری جگہ اپنے محبوب سے۔ لیکن برا کچھ بھی نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک ان دیکھا حصار ہر لمحے اس کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ سوچتی.... تو یہ ہے محبت۔ ایسا کیف' ایسا سرور' ایسی لذت' ایسا انبساط' ایسی لطافت۔ آنکھوں کے سامنے سے جیسے ہر پردہ ہٹ گیا ہے۔ وہ خوشبو کی تصویر بنا سکتی ہے۔ وہ گیت کی دھن کو مظاہر فطرت کے روپ میں دیکھ سکتی ہے۔ وہ گہرے سمندروں کو کھنگال سکتی ہے۔ وہ آسمانوں میں پرواز کر سکتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کی دوست ہے۔ چاند ستارے اس سے باتیں کرتے ہیں۔ ہر چیز اس کی خوشی میں شریک ہے۔ اسے کتنی وسعت مل گئی ہے۔

اس کی خوشی اور سرمستی کا عجیب عالم تھا۔ اندر سے تمام جھوٹے اور منفی جذبے مٹ گئے

تھے..... غصہ، ناپسندیدگی، نفرت، بغض۔ اس کا وجود جیسے دھل گیا تھا۔ پاک ہو گیا تھا۔ سب سے محبت ہو گئی تھی..... سب سے..... دنیا کے ہر شخص سے..... ان لوگوں سے جنہیں وہ نہیں جانتی تھی، جنہیں اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دل میں پوری انسانیت لئے محبت تھی۔ ممی کی جو باتیں اسے ناپسند نہیں، جن پر وہ پاؤں پٹختی تھی، اب غیر اہم ہو تھیں۔ پاپا کی کمزوریاں لائق درگزر تھیں۔ بہن بھائیوں کی زیادتی پر اسے غصہ نہیں آتا اس کے ہونٹوں پر بس ایک خوب صورت مسکراہٹ سجی رہتی تھی۔ وہ مسکراہٹ دھنک کی مانند تھی کبھی اس کا کوئی رنگ سامنے ہوتا اور کبھی کوئی۔ کبھی اس میں محبت ہوتی کبھی درگزر۔ کبھی ہمدردی ہوتی اور کبھی کسی کے دکھ کی آگہی۔ مسکراہٹ وہی رہتی تھی۔ شیڈ بدلتے رہتے تھے۔

لطف و مسرت اور سرشاری کی وہ کیفیت اس کے لئے بالکل نئی بھی نہیں تھی۔ یاد کر پر اسے یاد آیا۔ چار سال پہلے نسرین کی تلقین پر تھوڑے عرصے کے لئے اس نے نماز شر کی تھی۔ جتنے عرصے تک وہ نماز پڑھتی رہی، اس کی یہ کیفیت رہی۔ فرق بس اتنا تھا کیفیت اس پر قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ آتی جاتی رہی تھی۔ اور اس کا دورانیہ بھی زیادہ نہ ہوتا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد نماز چھوٹنے لگی اور وہ کیفیت بھی ختم ہو گئی۔

اس پر غور کرتے ہوئے مدیحہ پر کئی اہم نکتے روشن ہوئے۔ پہلے تو اس نے اس حوالے سے محبت کے تقدس کو سمجھا۔ یہ بے طلب، بے ریا محبت، عبادت کی طرح تھی۔ بلکہ وہ ا مسلسل عبادت تھی۔ وہ ریاضت تھی۔ مجاہدہ تھا۔ وہ محبت کرتے ہوئے مسلسل عبادت کیفیت میں تھی۔ تب پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ اس محبت کی صورت میں اسے ایک بہ بڑی نعمت عطا کر دی گئی ہے۔ مگر وہ بہت بڑی ذمے داری بھی ہے اسے اس کا احترام کرنا گا۔ اس کے تقدس کا خیال کرنا ہو گا۔ اسے عبادت کا درجہ دینا ہو گا۔ اس نے سمجھ لیا کہ جو بھی اچھا ہے، اسی محبت کی پاکیزگی، اس کے صدق اور اس کے بے طلب ہونے کی وجہ ہے۔ اور اسے قائم رکھنا ہو گا۔

اس وقت..... کم از کم اس وقت یہ بات اسے بہت آسان لگی!

پھر اس پر مزید غور و فکر کرتے ہوئے اس نے دوسرا اور ... وہ بڑا اور اہم نکتہ سمجھا تھوڑا عرصہ ہی سہی، مگر باقاعدگی سے نماز پڑھتی رہی تھی۔ مگر ہر نماز یہ لطیف کیفیت

دیتی تھی۔ اور کیفیت عام طور پر زیادہ دیر قائم بھی نہیں رہتی تھی۔ جبکہ اب یہ بہا لے جانے والی کیفیت ایک ہفتے سے قائم تھی۔ اس بات پر اس کے ذہن میں ایک بے حد نازک، مخدوش اور ضرر رساں سوال نے سر اٹھایا۔ کیا محبت عبادت سے بڑی چیز ہے؟ اور یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی وہ پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔ اس نے اس سوال سے نظریں چرائیں۔ وہ اس پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن کوئی طاقت تھی، جو اس کی توجہ اس سوال سے ہٹنے نہیں دے رہی تھی۔ کوئی حکم تھا، جو اس کے دماغ پر ٹھوکریں مار رہا تھا..... اس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ یہ ضروری ہے۔

اس کے سامنے دو صریح اور واضح حقیقتیں تھیں۔ عبادت میں اس کیفیت کو قیام و ثبات نہیں تھا۔ اس میں تغیر و تبدل تھا۔ اس میں تسلسل نہیں تھا۔ جبکہ محبت میں یہ کیفیت مسلسل اور قائم تھی۔ اس سے ایک سیدھا اور صاف نتیجہ نکلتا تھا۔ محبت عبادت سے بڑی ہے۔

اس مشکل سوال کا گستاخانہ جواب دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی اور پر اعتماد ہو گئی۔ اس نے یہ جواب ایک ریزرویشن کے ساتھ دیا تھا۔ یہ منطقی جواب تھا، جو روشن حقائق کی بنیاد پر دیا گیا تھا اور وہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس سلسلے میں اور لوگوں کا تجربہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے بلکہ یقیناً ہو گا۔ چاہے ایسے لوگ سامنے آئیں یا نہ آئیں۔

مدیحہ جانتی تھی کہ وہ بہت کم عمر ہے۔ اس کے پاس تجربہ نہیں ہے۔ مطالعہ وہ ضرور کرتی ہے۔ مگر وہ محدود ہے۔ اور اس کا مشاہدہ بھی بہت محدود ہے۔ جبکہ یہ معاملہ بہت بڑا ہے۔ یہ تو بڑی عمر کے تجربے کار اور عالم لوگوں کے لئے بھی بڑا معاملہ ہے۔ مگر اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے دل میں کوئی معلم بیٹھا ہے..... ایسا معلم، جس کی دسترس میں تمام علوم ہیں اور وہ اس کی راہ نمائی کر رہا ہے۔ اسے بڑھاوا دے رہا ہے۔

وہ اس سوال پر اور اس سے متعلق گتھیوں پر غور کرتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سب کچھ اس کے فہم و شعور سے بالاتر ہے۔ اصل میں اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ تو یہ سب کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ کوئی رو ہے، طاقت ور "رو" جو پر سکون پانیوں سے کھینچ کر اسے گہرے سمندر میں اس طرف لے جا رہی تھی، جہاں ایک بے حد خوفناک بھنور اس کا منتظر ہے۔ جبکہ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا۔

مگر وہ سوچتی رہی کیونکہ سوچنے پر مجبور تھی۔

غور کرنے اور سوچنے کے لئے اس نے اپنے دونوں تجربوں کی ڈور مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ ذاتی تجربوں کے وہی دو حوالے تھے اس کے پاس۔ اس نے عبادت کی تو کبھی اسے چند ساعتوں اور کبھی چند لمحوں کے لئے وہ حاصلِ عمر کیفیت عطا ہوئی۔ اور کبھی نہیں بھی ملی اور اس نے محبت کی تو اسے وہی کیفیت قیام اور تسلسل کے ساتھ ملی۔ یوں محبت عبادت سے بڑی ثابت ہوئی۔ لیکن کیوں؟ ہونا تو عبادت کو بڑا چاہئے۔

کچھ دن اس نے نماز پڑھی۔ کبھی اسے لمحوں کے لئے اور کبھی ساعت کے لئے وہ کیفیت ملی۔ اور کبھی نماز پڑھنے کے باوجود وہ کیفیت ملی ہی نہیں۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہ کہ نماز کی کوالٹی میں فرق تھا۔ قبولیت کی لیاقت میں فرق تھا۔ کیفیت کوالٹی سے مشروط تھی۔

اسی لمحے اسے پوری طرح یاد آ گیا۔ جب نماز میں حضوری کا احساس ہوتا تھا، رقت طاری ہوتی تھی تو کیفیت شروع ہو جاتی تھی۔ ہاں.... اس کا دورانیہ مختلف تھا۔

اور اب وہ ایک انسان کی محبت میں سرشار تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کو 'دل کو بھا گیا تھا۔ اپنے پر اثر انداز 'اپنی آواز 'اپنی گفتار 'اپنے اطوار 'اپنی صورت شکل 'اپنے جسم 'اپنے وجود سمیت اس کے تصور میں سما گیا تھا۔ وہ اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتی اور اسے دیکھ لیتی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی 'اس کو پوری طرح 'بہتر سے بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی۔ اس کے نتیجے میں وہ حاصلِ عمر کیفیت مستقل ہو گئی تھی۔

تو فرق کیا تھا؟ سچائی کا 'شدت کا 'لگن کا....!

ہاں یہ بات ہے۔ اسے یاد تھا 'وہ نماز پڑھتی تھی تو نیت کرتی تھی.... واسطے اللہ تعالیٰ کے۔ لیکن بس یہ زبان سے ہوتا تھا۔ وہ اللہ کے بارے میں سوچے بغیر مشینی انداز میں نماز پڑھ ڈالتی تھی۔ نماز پڑھتے ہوئے وہ دنیا بھر کی خرافات کے بارے میں سوچتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوتا تھا۔ تو وہ سچی نماز تو نہیں ہوتی تھی۔ اور کبھی ذرا بھی سچائی کے ساتھ نماز پڑھ لیتی تھی تو اسے وہ کیفیت مل جاتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ سچائی کے ساتھ تو وہ ایک انسان سے محبت کر رہی تھی۔ اور اس کے صلے میں اس پر مسلسل وہ خوب صورت کیفیت طاری تھی۔

تو یہ فرق ہے محبت اور عبادت میں....

نماز عبادت نہیں۔ اس کے دل میں بیٹھے معلم نے اسے ٹوک دیا۔

اس کا ذہن بالکل سادہ ہو گیا۔ جھٹکا تھا ہی اتنا شدید۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ تو پھر؟ وہ خالی الذہنی کے عالم میں بڑبڑائی۔

غور کر.... سمجھنے کی کوشش کر کہ عبادت کیا ہے۔ اس کی تعریف کیا ہے؟ معلم نے کہا۔

روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ذہن روشن ہو گیا۔ تعلیم دینے والی سوچیں ابھر آئیں۔ وہ پڑھنے لگی۔

عبادت بہت وسیع مفہوم والا لفظ ہے۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم اپنے رب کے عبد ہیں اور وہ ہمارا معبود ہے۔ ہم اس کے بندے، اس کے غلام ہیں۔ عبادت بندگی ہے۔ اور بندگی بہت آسان اور بہت مشکل ہے۔ بندگی بس اللہ کا حکم ماننا ہے۔ بندگی ہر وہ کام کرنا ہے' جو اللہ کو پسند ہو۔ بندگی ہر اس کام سے بچنا ہے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ بندگی بہت آسان ہے۔ لیکن بندگی بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ انسان کے ساتھ نفس لگا ہے' جس کا کام صرف خواہشیں کرنا اور کئے چلے جانا ہے۔ نفس وہ خواہشیں کرتا ہے' جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ سو بندگی سب سے پہلے نفس کے کتے کو باندھ کر رکھنا ہے' جو دل میں خواہشیں پیدا کر کے بندے کو سرکشی پر اکساتا ہے۔ سو جب اس کے بھونکنے کی آواز دل میں ہلچل نہ مچائے تو سمجھو' بندگی کا آغاز ہو گیا۔

بندگی عبادت ہے۔ عبادت بہت وسیع' بہت بڑا مفہوم رکھتی ہے۔ انسانوں سے محبت کرنا عبادت ہے۔ جانوروں پر رحم کرنا عبادت ہے۔ کسی کی زیادتی پر' خطا پر بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود درگزر کرنا عبادت ہے۔ باطل کے ہجوم میں آوازِ حق بلند کرنا عبادت ہے۔ حق کے لئے سر کٹا دینا عبادت ہے کہ جو کچھ کرنا ہے' اللہ کی راہ میں' اللہ کی خاطر کرنا ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق کرنا ہے۔ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ اور جب آدمی ایسا ہو جائے تو اس کا ہر فعل' ہر عمل' اس کے دل کی ہر دھڑکن' اس کی ہر سانس عبادت ہے۔

تو یہ ہے بندگی.... یہ ہے عبادت' جس کی وسعت اور عظمت آسمان جتنی بلند ہے۔ نماز عبادت نہیں۔ عبادت کا ایک حصہ ہے۔ نماز فرض ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ بندگی بھی فرض ہے۔ عبادت کو فرشتوں کے مفہوم میں نہ لو۔ انہیں اللہ نے مطیع پیدا فرمایا۔ حمد و ثنا کے لئے' سجدہ گزاری کے لئے پیدا فرمایا۔ لیکن تمہاری عبادت بہت وسیع ہے۔ اس لئے کہ تم سرکش

پیدا کئے گئے۔ تمہارے ساتھ نفس لگا دیا گیا۔ تمہاری عبادت مشکل ہے۔ جنت دو
فرشتوں کے لئے نہیں، تمہارے لئے پیدا کی گئی۔ نماز صرف جسم کے نہیں، جسم او
کے رکوع و قیام و سجود سے ہوتی ہے۔

تو میری نماز.....

دل میں بیٹھا معلم مسکرایا۔ نماز کو چھوڑو۔ اپنی نماز کی حقیقت تو دیکھ ہی لی تم نے۔ تم نماز میں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ تم نماز کس کے لئے پڑھ رہی ہو۔ نماز سے زیادہ تو تمہیں انسان کی محبت سے مل گیا۔ کیوں مل گیا؟ اس پر غور کرو۔ یہ تو تم نے سمجھ لیا کہ عبادت بڑی اور عظیم چیز ہے۔ اب محبت کے بارے میں سوچو۔ تمہارے اپنے تجربے میں تو عبادت سے بڑی ثابت ہو گئی۔ اس پر غور کرو۔

ذہن میں روشنی کا ایک اور جھماکا ہوا۔ روشنی اور بڑھ گئی۔

ڈیڑھ دو سال پہلے نسرین کی امی نے قرآن پاک کی ایک آیت ترجمے کے ساتھ تھی۔ وہ مدیحہ کو یاد آگئی۔ اس آیت کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ بندہ اپنے جیسے بندوں سے محبت کرتا ہے، جیسی محبت اسے صرف اللہ سے کرنی چاہئے۔ جیسی محبت صرف اللہ کا ہے۔ اس وقت بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر جب معلم دل میں آ بیٹھے تو بات سمجھ کیسے نہ آئے۔ مدیحہ کی سمجھ میں بھی بات آئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ابھی وہ بات کی روح تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ اور دل کا ابھی اسے وہاں پہنچانا بھی نہیں چاہتا۔

اے اللہ، میں آپ سے ایسی محبت کیسے کر سکتی ہوں؟ اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

کیوں نہیں کر سکتیں؟ معلم نے کہا۔

میں اس قابل کہاں ہوں۔ مدیحہ بولی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جو خود کو اس قابل نہیں سمجھتے، وہی تو سچی، شدید اور عظیم محبت کرتے ہیں۔ یاد رکھو سچے آنسو بڑے انمول ہوتے ہیں..... عاجزی، ندامت اور توبہ کے آنسو۔ یہ جتنے گرتے ہیں، اس سے بہت..... بہت زیادہ اندر گرتے ہیں اور سب کچھ دھو ڈالتے ہیں۔ پا کر دیتے ہیں وجود کو۔

اس رات مدیحہ دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ جو کچھ اس نے سمجھا تھا، اس نے اسے د

اور جہان حیرت میں ڈوب گئی۔ اس میں اتنی سمجھ کہاں تھی۔ اس کے پاس تو ان باتوں کی ابتدائی تعلیم بھی نہیں تھی۔ اسے تو اس کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔ پھر یہ سب کچھ کیسے سمجھا اس نے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ سوچ کی..... خیال کی صورت یہ سب کچھ اس کے اندر خود بخود ابھر اتھا۔ کیوں.....؟ کیسے.....؟ اس کے جواب میں وہ بس یہی کہہ سکتی تھی۔

یہ کون ہے مرے سینے میں رہنما میرا
کہ میں نے سوچا وہ مفہوم جو کتاب میں تھا

لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس کے بعد بھی اس کے اندر نماز کے لئے رغبت پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے سوچا، جیسی نماز میں پڑھتی تھی، اس کا کچھ حاصل نہیں۔ اور یہ عبادت نہیں، عبادت کا محض ایک حصہ ہے۔ جبکہ مکمل بندگی اور عبادت انسان پر فرض ہے۔

اس وقت وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ نماز عبادت کا اہم ترین حصہ ہے۔ یہ اسے بعد میں سمجھنا تھا۔

☆

بے غرض، بے طلب، بے ریا محبت جاری تھی۔ وہ بہت معصوم محبت تھی..... دکھ، پریشانی اور پچھتاوے سے پاک۔ بے غرض جو ٹھہری۔ خوشی اور سرشاری کی کیفیت بھی وہی تھی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ بادلوں میں اڑتی تھی۔ چال میں رقص کی کیفیت ہوتی تھی۔ ہونٹوں پر سدا مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ اس کی وجہ سے چہرہ متبسم ہو گیا تھا۔ آنکھیں ہر وقت جگمگاتیں۔ وہ آئینے کے سامنے جاتی تو اسے خود بھی احساس ہوتا کہ آئینہ بہت روشن لگنے لگا ہے۔

اس کے لئے خلوت اور جلوت دونوں برابر تھیں۔ سوکس کے پیریڈ میں وہ سب کچھ بھول کر حمید احمد کے چہرے کو یوں پڑھتی، جیسے وہ کوئی صحیفہ ہو۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسے کسی بات کا احساس نہیں رہتا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ اسے تو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کلاس کی وہ کیا پرواہ کرتی۔

پہلی بار اسے پتہ چلا کہ کمرے کی تنہائی کتنی بڑی نعمت ہے ورنہ اسے یہ شکایت رہتی تھی کہ گھر میں کوئی کسی کو پوچھتا ہی نہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن، اپنے آپ میں مست رہتے تھے۔ اب یہ بات اچھی لگتی تھی۔ اپنے کمرے میں حمید احمد کے چہرے کا تصور قائم کر کے

اسے تکتی رہتی۔ وہ چہرہ اس کے لئے ایک دنیا کی طرح تھا۔ اور وہ اس دنیا میں گھومتی ر
گھومتے گھومتے تھک جاتی مگر تشنگی اور نارسائی کا احساس پھر بھی رہتا۔

نسرین اس کے بہت قریب تھی۔ اس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں دیکھ رہی تھی۔ ک
اس نے مدیحہ سے پوچھنے کا ارادہ کیا مگر پھر خود کو روک لیا لیکن ایک دن وہ پوچھ ہی
۔ "مدیحہ.... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اس وقت وہ اگلے پیریڈ کے انتظار میں کالج کے لان میں بیٹھی تھیں۔ مدیحہ بڑی نرمی
اپنی انگلیوں سے گھاس کی پتیوں کو سہلا رہی تھی، جیسے پیار کر رہی ہو۔ نسرین کی بات سن کر
چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر روشن روشن آنکھوں سے نسرین کو دیکھا "کیا ہوا ہے مجھے؟" ا
نے الٹا نسرین سے پوچھا۔

"تم بہت بدل گئی ہو۔"

"کیسے؟"

"اب یہی دیکھ لو۔ پہلے ہم یہاں بیٹھتے تھے تو تم گھاس کی پتیوں کو نوچتی رہتی تھیں۔ ا
اتنے پیار سے سہلا رہی ہو۔" نسرین نے کہا۔

"اور؟"

"اور تم بہت خوب صورت ہو گئی ہو۔"

"اور؟"

"اور تم بہت نرم ہو گئی ہو مگر بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔ پہلے کی طرح باتیں نہ
کرتیں۔"

"اور؟"

"تمہاری آنکھوں کی چمک اتنی بڑھ گئی ہے کہ تم سے نظریں نہیں ملائی جا سکتیں۔"

"اور؟"

اور تم نظریں اٹھاتی بھی کم ہو۔"

"اور؟"

"اور تم ہر وقت مسکراتی رہتی ہو۔ برا ماننے والی بات پر بھی برا نہیں مانتیں۔" نسرین ۔
کہا۔ "اور بھی بہت کچھ ہے، جو میں محسوس کرتی ہوں۔ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"یہ سب تبدیلیاں اچھی ہیں یا بری؟" مدیحہ نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ اچھی ہیں۔"

"تو پھر.... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟.... کہتے وقت تمہارے لہجے میں تشویش کیوں تھی۔"

"اس لئے کہ ان تبدیلیوں کی کوئی وجہ بھی ہو گی اور وہ مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھی تبدیلیوں کی وجہ بھی اچھی ہی ہوتی ہے۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وجہ معلوم ہو یا نہیں۔"

"تم واقعی بہت بدل گئی ہو۔ مختصر اور جامع جواب دینے لگی ہو۔" نسرین نے کہا "میں تمہاری واحد سہیلی ہوں۔ مجھے علم ہونا چاہئے۔"

"میں بتاتی ہوں۔" مدیحہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں شاید یہ راز سمجھنے لگی ہوں کہ سچی خوشی کیا ہے اور خوش کیسے رہا جا سکتا ہے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ خوشی دوسروں کو راحت پہنچانے میں ہے اور یہ کہ خوب صورتی کی نمو نرمی سے ہے۔ سختی خوب صورتی کو تباہ کر دیتی ہے اور یہ کہ حسن خاموشی میں... کم گوئی میں ہے اور یہ کہ سکون درگزر میں ہے اور یہ کہ مسکراہٹ درگزر کا سب سے حسین روپ ہے۔"

نسرین منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ "اے.... یہ تم کون سی زبان بول رہی ہو۔" بالآخر اس نے حیرت سے کہا۔ "تمہاری باتیں سمجھ میں تو آئی ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں انہیں پوری طرح نہیں سمجھ پائی ہوں۔"

"خود مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" مدیحہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہ باتیں کس نے سکھائیں۔"

"مجھے نہیں معلوم نسرین۔ بس یہ سب کچھ میرے اندر ہے اور میرے اندر سے ابھرتا ہے۔"

نسرین کے تعجب کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

"شاید یہ سب کچھ پہلے سے میرے اندر موجود تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا۔" مدیحہ نے مزید کہا۔

"یہ تبدیلی کیوں، کیسے آئی تم میں؟" نسرین کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "ذرا توقف کے

بعد وہ بولی۔ ”میں سمجھ گئی۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ میں دیکھتی رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ہوئے ‘ بدلتے ہوئے دیکھا مگر بہاؤ اتنا تیز تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں روک نہ سکی۔ مجھے مہلت ہی نہیں ملی.....“

اب حیران ہونے کی باری مدیحہ کی تھی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ نئے سر کے آنے سے پہلے تم ایسی نہیں تھیں۔ سر حمید کے...“

مدیحہ نے تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس نسرین پلیز.... اب آگے لفظ نہ کہنا۔“ اس کے لہجے میں مچلتی تڑپتی ہوئی التجا تھی۔ ”جس چیز کے بارے میں جانتی نہیں ہو۔ اس کے بارے میں کچھ مت کہو.....“

”لیکن میں جانتی ہوں.....“ نسرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

”شاید تم جانتی ہو لیکن یہ نہیں جانتیں کہ وہ کیا ہے۔“

”تم مجھے کیوں روک رہی ہو؟ جب کہ تم جانتی ہو کہ میں کیا کہنے والی ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ وہ سچ ہے۔“

”اسی لئے روک رہی ہوں۔ سچ بولنے کے بھی آداب ہوتے ہیں اور پھر جو کچھ مجھے کہنا چاہئے ‘ وہ تم کیوں کہو۔“ مدیحہ نے التجا کی۔ ”لیکن یہاں نہیں۔ یہ بات گھر پر ہوگی۔“

”مگر تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ تم تو مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھیں۔“ نسرین نے شکایت کی۔

☆

کالج سے نسرین کے گھر جاتے ہوئے مدیحہ اسی سوال پر غور کرتی رہی!

بات حیرت انگیز تھی۔ مدیحہ نے نسرین سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا اور یہ بات ایسی چھپانے والی بھی نہیں تھی۔ پھر یہ اس کا مزاج بھی نہیں تھا۔ اسے تو ہمیشہ خود سے اس بات کی شکایت رہی تھی کہ اس میں گہرائی کی کمی ہے بلکہ کبھی کبھی تو وہ اسے اچھے پن پر محمول کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کبھی کوئی بات دوسروں سے چھپائے بھی۔ سنبھال کر رکھے بھی۔

اور جب یہ اپنا بھید اس پر کھلا تھا‘ تب بھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے چھپائے۔ اس نے تو اخبار کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اخبار کے کالم میں لکھا تھا۔ ”... چھوڑیئے اور دل کی بات کہنے میں دیر نہ کیجئے۔“ اس نے سوچا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

وہ نسرین کو بھی یقیناً یہ بات بتاتی بلکہ وہ اس معاملے میں زبان کھولنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔

مگر اگلے روز تو جمعہ تھا۔ چھٹی تھی اور اسی روز اس پر ہونے والی باطنی تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا۔ اس روز وہ پہلی بار اپنے دل میں بیٹھے معلم سے متعارف ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ پہلے سے اس کے دل میں چھپا بیٹھا تھا یا ابھی آیا تھا۔ بہرکیف وہ اپنی محبت کا انکشاف کرنے کی غرض سے نسرین کے گھر کا نمبر ملا رہی تھی کہ اس کی انگلیاں ساکت ہو گئیں اور کسی نے کہا۔

”ایسی غلطی نہ کرنا۔“

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا مگر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ آواز اس کی اپنی ہی ہے اور اس کے اندر سے آئی ہے۔ اس نے اسے نظر انداز کر کے نمبر ملانے کے لئے انگلی کو حرکت دینا چاہی۔ لیکن وہ انگلی ہلا نہ سکی۔ ”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کوئی بہت بڑی نعمت مل جائے تو اسے چھپا کر رکھنا چاہئے۔“ معلم نے کہا۔

”کیوں؟ خوش خبری کو تو دوستوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہئے۔“ اس نے جرح کی۔

”یہ بہت بڑی نعمت کی بات ہو رہی ہے اور بہت بڑی نعمت وہ ہے ‘جس کی اہلیت ‘ آپ میں نہیں۔ مگر وہ رب کی کریمی سے آپ کو مل گئی۔ تم نہیں جانتیں ‘ یہ محبت بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے ‘ جو تم کو عطا کر دی گئی ہے۔“

”مگر نعمت کو چھپایا کیوں جائے؟“

”اس کے جواب کے بے شمار پہلو ہیں۔ نعمت بہت بڑی ہو تو بہترین دوست بھی حسد کر سکتا ہے۔ اس کی نظر بھی لگ سکتی ہے۔ پھر ایسی نعمت پر اترانے کا بھی آپ کو حق نہیں کیونکہ وہ آپ کی کمائی نہیں ‘ رب کی نوازش ہے پھر یہ لازم ہے کہ دینے والے کے حوالے سے نعمت کو بہت زیادہ محترم جانو۔ کسی ایسے شخص کے سامنے اس کی بات نہ کرو ‘ جو اس کی اہمیت نہ سمجھتا ہو کیونکہ ایسا شخص بڑی آسانی سے اس کی تحقیر کر سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو یہ تمہارے لئے برا ہے پھر اس بات کو بھی سمجھو کہ تم اس نعمت کے اہل نہیں تھے۔ لیکن وہ تمہیں عطا کر دی گئی۔ اب تم پر لازم ہے کہ خود کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کئے جاؤ۔ اہلیت حاصل کرنے سے پہلے اسے کسی پر ظاہر مت کرو کیونکہ اب اس نعمت کے حوالے سے تم بھی محترم ہو گئے ہو لیکن دوسرے لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ وہ تمہاری تحقیر کریں گے تو یہ اس نعمت کی تحقیر

ہو گی اور اس کی ذمے داری تم پر ہو گی اور ہاں ' اہلیت کے لئے خاموشی بڑی ا خاموشی ظرف کو بلند کرتی ہے اور کم وقت میں اہلیت عطا کرتی ہے۔

اس کے لئے سیپ کی مثال کو سمجھو۔ سمندر میں کروڑوں اربوں سیپیں ہوتی ہیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو سب اوپر آتی ہیں۔ سب منہ کھولتی بارش کا ایک قطرہ سمیٹ کر منہ بند کر لیتی ہیں مگر بارش کا پہلا قطرہ صرف ایک سیہ ہوتا ہے۔ یہ وہ قطرہ ہوتا ہے جسے آب دار موتی بننا ہوتا ہے۔ سیپ اسے لے کر سمند میں چلی جاتی ہے۔ اب اسے ایک مقررہ مدت تک خاموشی سے عام سیپیوں کی طر کی تہہ میں پڑے رہنا ہے.... منہ کھولے بغیر۔ مقررہ وقت پر بارش کا وہ قطرہ آب ا بن جائے گا اور اس کی وجہ سے وہ سیپ محترم ہو جائے گی لیکن اگر سیپ نے مقررہ و ایک لمحہ پہلے بھی منہ کھول دیا تو بارش کا وہ قطرہ ' قیمتی قطرہ ضائع ہو جائے گا اور سیہ سیپ رہ جائے گا۔

تو مجھے بہت بڑی نعمت ملی ہے حالانکہ میں اس کی اہل نہیں تھی۔ مدیحہ نے سوچا۔

اور وہ انقلاب آفریں لمحہ تھا' جس نے اس کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ اس ایک پل مہ کر رہ گئی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے نسرین کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے حمید احمد کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ کالم کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی تو اسے اس کے آ مشورے پر بھی عمل کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ نعمت اسے ر دی تھی' اس کالم کی پیش گوئی نے نہیں۔ یہ بات اس نے سمجھ لی۔

اور اب وہ خاموشی توڑنے والی تھی۔ زبان کھولنے والی تھی۔ راز ' راز نہیں رہتا تو راز نہیں رہا تھا۔ نسرین نے سمجھ لیا تھا اور وہ اپنے منہ سے کہنے والی تھی کہ اس۔ روک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ نسرین تحقیر.... اہانت نہ کر بیٹھے۔ اس سے بہتر تھا کہ اعتراف کر لے.... عظمت کے ساتھ.... یہ مجبوری تھی۔ وہ خوشی سے ایسا نہیں تھی۔ اسے نعمت کو.... اور خود کو تحقیر سے بچانا تھا۔

اس نے گاڑی نسرین کے بنگلے کے کھلے گیٹ سے گزاری اور پورچ میں لے جا کر دی۔

پانچ منٹ بعد وہ دونوں نسرین کے کمرے میں تھیں!

"کھانا نہیں کھائیں گے۔" نسرین نے کہا۔ "میں ذرا کھانے کو کہہ دوں۔"

"ذرا رک جاؤ۔ کھانا بھی کھا لیں گے۔ پہلے مجھے بات کرنے دو۔"

نسرین صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ "تو کرو جلدی سے۔ ایک سیکنڈ کی تو بات ہے۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے میرا۔"

"بات تو ایک سیکنڈ ہی کی ہے لیکن مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

"تو جاؤ۔"

مدیحہ باتھ روم میں گئی لیکن اس نے دروازہ بند نہیں کیا۔ نسرین نے حیرت سے دیکھا۔ وہ واش بیسن کے پاس کھڑی وضو کر رہی تھی۔

مدیحہ وضو کر کے باہر آئی اور نسرین کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ سر پر رکھا۔ اس کے چہرے پر تقدس کی روشنی جگمگا رہی تھی۔

نسرین نے اسے ایک نظر دیکھا اور جلدی سے نظر جھکا لی۔ کیا یہ وہ لڑکی ہے ' جسے میں برسوں سے جانتی ہوں جو میری سب سے اچھی سہیلی ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔

"نسرین.... اب میری بات غور سے سنو۔"

"وہ آواز زمین اور آسمان کے درمیان گردش کرتی محسوس ہوئی۔ وہ لہجہ ' وہ الفاظ نسرین کے سینے میں گونجے۔ وہ حیران بھی تھی اور مرعوب بھی۔ وہ جانتی تھی کہ مدیحہ کیا کہے گی.... شاید وہ لفظ بہ لفظ جانتی تھی لیکن اچانک کمرے کا ماحول ہی بدل کر رہ گیا۔ تقدس آمیز خاموشی در و دیوار سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا جیسے وقت کی گردش سمیت ہر چیز ٹھہر گئی ہو۔ نسرین جانتی تھی کہ مدیحہ کیا کہے گی مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ مدیحہ کوئی بہت غیر معمولی' کوئی بہت بڑی' بہت نازک' بہت خوب صورت بات کہنے والی ہے۔

وہ ہمہ تن سماعت ہو گئی۔

"نسرین.... مجھے حمید احمد سے محبت ہو گئی ہے۔" مدیحہ نے بڑے دبدبے سے کہا۔

وہ وہی لفظ تھے جو نسرین نے سوچے تھے کہ مدیحہ کہے گی۔ اور نسرین نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جواب میں اسے کیا کہنا ہے۔ وہ مدیحہ کو کیسے سمجھائے گی۔ وہ اسے بتائے گی کہ یہ بات اچھی نہیں' معیوب ہے' یہ بات عزت کی نہیں ہے۔ وہ ایک عظیم جذبے کی توہین کر رہی ہے۔

اسے اس کا حق نہیں۔

ان پامال لفظوں کے بیچ میں کچھ تھا..... بہت کچھ تھا..... بپھرے ہوئے سمندر کی اور جوش' فلک بوس پر ہیبت پہاڑوں کی بلندی..... اور..... نہ جانے کیا کچھ۔ وہ فرط سے شل ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس میں اتنی نہیں تھی کہ اس پاکیزگی' اس عظمت اور اس بلندی کی تحقیر کرتی۔

"اور نسرین پلیز..... تم ایک لفظ بھی نہ کہنا' کچھ بھی نہ کہنا ورنہ میں بہت چھوٹی ہو گی۔" اس بار مدیحہ کے لہجے میں التجا تھی۔

نسرین کو احساس ہو گیا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی' مدیحہ کو سمجھانا چاہتی تھی' شاید کافی ہی اس سے دست بردار ہو چکی تھی..... اس وقت سے' جب اس نے مدیحہ میں رونما والی خوب صورت تبدیلیوں کا مشاہدہ شروع کیا تھا۔

"میں کہاں کچھ کہہ رہی ہوں میری جان! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" اس نے بڑی محبت کہا۔ "میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا' میں اسے مکمل طور پر سمجھ نہیں لیکن شاید میں نے اسے پوری طرح محسوس کر لیا ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گی میری جان!"

اور مدیحہ مسکرا دی۔



پچھلے دس بارہ دن سے حمید احمد کے لئے سکون ہی سکون تھا۔ اس سکون کی وجہ بھی وہی تھی جو پہلے بے سکونی کا باعث تھی..... یعنی مدیحہ حامد!

شہریت کے استاد ہونے کی حیثیت سے وہ یہ بات دوسروں سے بہتر طور پر جانتے تھے کہ ایک فرد کا رویہ کتنا اہم ہوتا ہے اور وہ اجتماعی ماحول پر بعض اوقات کتنا زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں حیرت ہوئی۔ سیکنڈ ایئر کی وہی کلاس، جس سے وہ گھبرانے لگے تھے، اب انہیں سب سے اچھی لگتی تھی۔ سب سے برائٹ اور پڑھائی میں دلچسپی لینے والے سٹوڈنٹس اسی کلاس میں تھے۔ انہیں پڑھانے میں لطف آتا تھا۔ ان میں ایسے سٹوڈنٹس بھی تھے جو لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ جو ہر موضوع پر سوچنا چاہتے تھے۔ جو کتابوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

ویسے ممکن ہے کہ یہ تبدیلی دس بارہ دن سے زیادہ پرانی ہو اور انہیں اس کا پتا نہ چلا ہو کیونکہ انہوں نے تو مدیحہ کی طرف متوجہ ہونا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن ایک لیکچرار جب لیکچر دیتا ہے تو وہ اپنے انداز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے' سٹوڈنٹس کے چہرے ٹٹولتا ہے۔ ان کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس سے اسے پتہ چلتا ہے کہ کون پڑھائی میں کتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسے ہی اس روز بلا ارادہ ان کی نظر مدیحہ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ گھبرا کر نظر ہٹانا چاہتے تھے لیکن جو کچھ نظر آیا وہ حیران کن بھی تھا اور طمانیت بخش بھی۔ چنانچہ ان کی نظر اس کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

مدیحہ حامد ڈیسک پر نظریں جھکائے بیٹھی تھی!

وہ دیکھے جانے کے اتنے عادی..... اور اس سے اتنے خوف زدہ ہو چکے تھے کہ انہیں یہ بہت عجیب سا لگا۔ وہ مدیحہ کو بہت غور سے دیکھتے رہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ پڑھائی کی طرف متوجہ ہے یا نہیں..... اور ان کی اتنی اہمت تھی بھی نہیں۔ یہ کیا کم تھا کہ وہ ٹکٹکی

باندھ کر انہیں نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کی نظریں ڈیسک ٹاپ پر جمی تھیں۔ اس کے سامنے کھلی کتاب رکھی تھی۔

چند لمحوں میں حمید احمد کو اندازہ ہو گیا کہ مدیحہ محویت اور استغراق کے عالم میں ہے۔ ان کا دل سکون سے بھر گیا۔ مدیحہ پڑھائی کی طرف متوجہ ہو یا نہ ہو۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ انہیں ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی اور ان کے ڈسٹرب ہونے کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس لئے کہ اس میں پوری کلاس کا نقصان تھا۔

اس کے باوجود اگلے روز انہوں نے ڈرتے ڈرتے مدیحہ کی طرف نگاہ کی۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ پہلے کی طرح انہیں تک رہی ہو گی لیکن نہیں، انہوں نے اسے گزشتہ روز والی کیفیت میں پایا۔ وہ بڑے سکون اور دل جمعی سے لیکچر دیتے رہے۔

تیسرے روز ان کا اعتماد بحال ہو گیا۔ لڑکی میں کوئی جادوئی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی توجہ ان کی طرف سے بالکل ہٹ گئی تھی۔

مگر اب یہ ہوا کہ وہ فرصت کے لمحوں میں اس کے بارے میں سوچنے لگے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ استاد اپنے شاگردوں میں سے چند ایک کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ فطری بات ہے۔ لیکن عام طور پر وہ دو طرح کے شاگردوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ ایک بہت لائق اور ایک بہت نالائق۔ لائق شاگردوں کے بارے میں وہ محبت سے سوچتا ہے۔ توقع کرتا ہے کہ وہ امتحان میں بڑی کامیابی حاصل کریں گے اور وہ ان کے لئے دعا کرتا ہے۔ دوسرے وہ نالائق شاگردوں کے بارے میں فکر مندی اور تشویش سے سوچتا ہے کہ ان کا کیا بنے گا۔ ان کے امتحان کا نتیجہ اس کے لئے باعث شرمندگی ہو گا اور وہ انہیں پڑھائی کی طرف راغب کرنے کی، ان میں لیاقت پیدا کرنے کی ترکیبیں سوچتا ہے۔

لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ بات لڑکی کی لیاقت یا نالائقی کی نہیں، اس کی صورت کی نہیں تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی لیکن مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ اپنی چالیس سالہ زندگی اور سولہ سالہ کیریئر کے دوران میں انہوں نے اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں دیکھی تھیں مگر پہلے کبھی کسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یہاں بھی بات اس کی خوبصورتی کی نہیں تھی، کسی مشابہت کی تھی، جو ذہن پر زور دینے کے باوجود انہیں یاد نہیں آتی تھی۔ لڑکی انہیں کسی کی یاد دلاتی تھی.... کس کی؟ یہ انہیں یاد نہیں آتا تھا۔ اب اس کے رویے

کی طرف سے اطمینان ہوا تو یہ خلش انہیں ستانے لگی۔ وہ ذہن پر زور دیتے.... دیتے رہتے۔ مگر کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا اور وہ جھنجلانے لگتے۔ کچھ یاد آتا تھا لیکن شعور کی گرفت میں آنے سے پہلے معدوم ہو جاتا تھا۔ اس پر وہ جھنجلاتے.... اور پھر جھنجلاہٹ دور کرنے کے لئے وہ اسی کے بارے میں سوچنے لگتے۔

کہتے ہیں کہ پہلا تاثر آخری ہوتا ہے اور ان کا کسی کے بارے میں پہلا تاثر شاذ ہی غلط ثابت ہوا تھا لیکن اس لڑکی کے بارے میں ان کا پہلا تاثر غلط ثابت ہوا تھا۔ پہلے دن جب وہ سب کے بیٹھ جانے کے باوجود کھڑی رہی تو انہوں نے یہ تاثر لیا کہ وہ توجہ حاصل کرنے کی .... خود نمائی کی شوقین ہے پھر جب اس نے اٹھ کر ان سے تفصیلی تعارف کا مطالبہ کیا تو ان پر یہ تاثر مرتب ہوا کہ اس کی طبیعت میں جارحیت ہے۔ وہ ڈرتے رہے کہ موقع ملتے ہی وہ اپنا یہ مطالبہ دہرائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اگلے ایک ہفتے میں انہیں اپنے پہلے تاثر کے دونوں حصوں سے رجوع کرنا پڑا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ اسے نہ خود نمائی کا شوق ہے نہ توجہ حاصل کرنے کی خواہش۔ بلکہ وہ تو توجہ ملنے پر گھبرا جاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے دیکھا جائے۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس کے مزاج میں جارحیت نہیں ہے کیونکہ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ دوسرے سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا نہیں تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ تعارف کے معاملے میں ان کے ساتھ اس کا طرز عمل ایسا کیوں تھا۔ لیکن اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

پھر وہ کلاس کے دوران میں انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ اس طرح کہ وہ نروس ہونے لگے۔ وہ اس سے.... بلکہ اس کی کلاس سے بھی گھبرانے لگے۔ وہ اس کی نظروں کی تپش سے بچنے کے لئے اس کی طرف دیکھنے سے ہی گریز کرنے لگے۔ انہیں اپنا مقام، اپنا مرتبہ، اپنا وقار خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ خوف زدہ ہو گئے۔

پھر وہ رت بھی گزر گئی۔ اب وہ نازک خوبصورت لڑکی ایک ٹرانس میں لگتی تھی۔ اپنے آپ میں یا کسی خیالی دنیا میں گم۔ محویت اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ اسے کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے کلاس کے علاوہ بھی دیکھا تو اسی عالم میں دیکھا۔ لگتا تھا کہ وہ خواب میں چل رہی ہے۔

کچھ بھی ہو، میری پریشانی تو دور ہو گئی۔ انہوں نے سوچا اور یہ بھی ہے کہ اب میں اس

لڑکی کو سمجھ گیا ہوں۔ یہ بے حد متلون مزاج لڑکی ہے۔ اس کی کوئی کیفیت قائم رہ
نہیں۔ یہ پل پل رنگ بدلتی ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ جو کیفیت چھا جائے، یہ اسی کی اسیر ہے۔ تعلیم کے میدان میں یہ کبھی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر

انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کا یہ تاثر بھی غلط ہے۔ وہ متلون مزاج نہیں، بلکہ مستقل مزاج لڑکی ہے۔ ایسی مستقل مزاج، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے!

☆

نسرین پر راز کھولنے کے بعد مدیحہ کچھ پریشان ہو گئی!

یہ بات اس نے سمجھ لی تھی کہ اسے ایک ایسی نعمت عطا کی گئی ہے، جس کی وہ اہل
اس کے شایان شان تو اس کا ظرف بھی نہیں۔ ایسے میں کوئی غلطی ہو جائے تو اس
نعمت بڑی آسانی سے چھن جائے گی اور وہ یہ نہیں چاہتی۔ آسمان کو چھونے کے بعد
کون آنا چاہتا ہے۔

اب وہ سوچتی تھی کہ اس کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ بنیادی با
محبت کا تقدس تھا، اس کی پاکیزگی تھی۔ وہ عبادت جیسی محبت تھی لیکن اس کے تقد
سمجھنے والے لوگ کہاں تھے اور دنیا میں کیسی محبت رائج ہے اور کوئی اس کی محبت کو د
لے، سمجھے اور محسوس کرے گا تو اسی مروجہ محبت کے حوالے سے تو ایسے میں اس مح
تحقیر نہیں ہو گی؟ اور ایسا ہوا تو وہ اس سے چھن جائے گی۔

اسی لمحے اس نے سمجھ لیا کہ اس کی کلاس میں وارفتگی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ا
انداز سے، طور طریقے سے، اس کی نگاہوں سے نسرین نے اس کا راز کھوج لیا تھا۔ ا
سامنے اعتراف محبت تو اس نے مجبوراً کیا تھا.... محبت کو تحقیر سے بچانے کے لئے۔
نسرین جان چکی تھی۔ صرف اس کی بے احتیاطی کی وجہ سے.... اور جو بات نسرین نے
لی تھی، وہ کلاس میں اور لوگ بھی سمجھ سکتے تھے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

تو کیا اور لوگ سمجھ چکے ہیں؟ اس سوال نے اسے لرزا دیا۔

وہ غور کرتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اب تک ایسا نہیں
ہے۔ ہوتا تو سمجھنے والا اپنے ظرف، اپنی ذہنیت کے مطابق اس پر یہ بات جتا چکا ہوتا۔
چھیڑ چھاڑ، کوئی چھینٹے اڑاتا ہوا کم ظرف فقرہ، کوئی طنز.... کچھ نہ کچھ۔ مگر ایسا ہوا نہیں

اس نے اطمینان کی سانس لی اور اب ایسا ہو گا بھی نہیں۔ میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گی۔ یہ میری ذمے داری ہے۔

اس نے سمجھ لیا کہ اسے اپنے رویے کو تبدیل کرنا ہو گا۔ وہ اب سوکس کے پیریڈ میں خود کو سنبھال کر رکھے گی۔ نظر اٹھائے گی ہی نہیں۔ کیونکہ نظر اٹھی تو حمید احمد کے چہرے کی طرف ہی اٹھے گی اور اس طرح یہ راز فاش ہو جائے گا۔

اور نظر وہ کیوں اٹھاتی ہے....؟ صرف انہیں دیکھنے کے لئے نا؟ تو نظر اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ چہرہ تو وہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ سکتی ہے۔ کھلی آنکھوں سے کسی بھی چیز میں دیکھ سکتی ہے.... ہر چیز میں دیکھ سکتی ہے.... اور دیکھتی ہے۔ سوکس کا پیریڈ تو صرف ایک گھنٹے کا ہوتا ہے جبکہ وہ چہرہ تو چوبیس گھنٹے.... ہر پل اس کی نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ وہ اسے کتاب کے صفحے پر بھی دیکھ سکتی ہے اور ڈیسک کے ٹاپ پر بھی۔ جب وہ سامنے نہیں ہوتے تب بھی تو وہ انہیں جب جی چاہتا ہے، دیکھ لیتی ہے۔ تو نظریں اٹھا کر انہیں دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں دنیا پر افشائے راز کا خطرہ مول لیا جائے۔ کیوں محبت کی رسوائی اور تحقیر کا خطرہ مول لیا جائے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے پہلی بار سوکس کی کلاس اٹینڈ کی تو نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ نظریں جھکائے رکھنے کے لئے اسے خود سے لڑنا ہو گا۔ نظریں خود بخود اٹھیں گی، اس چہرے پر ٹھہرے رہنے کی ضد کریں گی لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ وہ خود سپردگی کی ایسی کیفیت میں تھی کہ اس محبت کے نام پر وہ ہر حکم بلا چون وچرا قبول کر سکتی تھی۔ اس کے اندر آمادگی ہی آمادگی تھی۔

اس لمحے کے بعد وہ نامعلوم گہرائی والی پرسکون جھیل بن گئی۔ ایسی جھیل کہ بہت تیز چلنے والی ہوا بھی اسے متلاطم نہیں کر سکتی تھی۔ بس سطح کے پانی کو ہلکے دھیمے ہلکورے دے سکتی تھی۔ ایسی جھیل جس میں دیکھو تو پانی کے ذرا نیچے کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بس اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔

☆

حمید احمد، وحید کے ساتھ بیٹھے اپنی نگرانی میں اسے ہوم ورک کرا رہے تھے۔ یہ ان کے روز کے معمولات میں سے تھا بلقیس بیگم کچھ فاصلے پر کروشیا لئے بیٹھی تھیں۔ مگر اس وقت

ان کی توجہ بُنائی کی طرف نہیں تھی۔ وہ ان دونوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ روز
ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھتیں تو انہیں صابر علی کا خیال آتا۔ وہ سوچتیں کہ اگر وہ ماں
گئی ہوتیں تو صابر علی بھی اپنے بیٹے کو اسی طرح پڑھاتے؟ اس سوال کا جواب وہ سوچنا نہ
چاہتی تھیں کیونکہ ایسا ہوا ہی نہیں۔ اور ہو جاتا تو شاید صابر علی.... یہاں پہنچ کر وہ از
سے بے حال ہو جاتیں۔ ان کا وہ زخم کھل جاتا' جس کی ٹیسیں انہیں نڈھال کر دیتی تھیں۔
سوچتیں' شاید نہیں یقیناً.... صابر علی یقیناً اپنے بیٹے کو اتنی محبت اور توجہ دیتے لیکن مق
میں محرومی ہو تو کوئی کیا کرے۔ البتہ انہیں یقین تھا کہ جس صبر اور ظرف کے ساتھ صا
علی نے اپنی محرومی کے ساتھ زندگی گزاری تھی' اس کا اجر اللہ کے ہاں انہیں ضرور ملے
اور بے حساب ملے گا۔ اپنا دکھ چھپانا اور دوسرے کی دل جوئی کرنا....

وہ چونک گئیں۔ سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ "ابو.... یہ آخری سوال مجھ سے نہیں ہو
ہے۔" وحید کہہ رہا تھا۔ "یہ.... آپ مجھے سمجھا دیجئے۔"

"دیکھو بیٹے' اہمیت METHOD کی ہے سوال کی نہیں، METHOD یاد رکھو گے
ہر سوال آسان ہو جائے گا۔" حمید احمد نے کہا۔

"بس یہ سوال کر دیں ابو' پھر ہوم ورک مکمل۔" وحید نے ٹھنک کر کہا۔

"تم مجھے METHOD سمجھاؤ۔"

وحید نے جو کچھ باپ سے سمجھا تھا' بتانا شروع کیا۔

"بالکل ٹھیک' حمید احمد نے کہا۔ "اب ذرا اس میتھڈ کے مطابق یہ سوال حل کرو۔"

وحید کاپی پر جھک گیا اور سوال حل کرنے لگا۔

"ارے.... رکو۔ یہ فائیو کہاں سے آ گیا۔" اچانک حمید احمد نے اسے ٹوکا۔

"فائیو سیون زا...." وحید کہتے کہتے رکا۔ "اوہ سوری ابو' یہ تو سیون ہو گا۔"

"ہاں.... اب آگے چلو۔"

دو منٹ خاموشی رہی' پھر وحید کی آواز ابھری۔ "یہ.... یہ تو ہو گیا ابو!"

"ہاں بیٹے۔ اگر میتھڈ آتا ہے تو آپ نے غلطی بھی نہیں کی تو جواب غلط کبھی نہیں آ
گا۔" حمید احمد کے لہجے میں طمانیت تھی۔ "جواب غلط آئے تو چیک کرو۔ کہیں نہ کہ
تمہاری غلطی ہو گی۔"

"ہوم ورک ہو گیا ابو! اب میں کھیلنے جا سکتا ہوں؟" وحید نے کتابیں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

حمید احمد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "دس منٹ بعد جانا۔ تمہارے کھیلنے جانے کا وقت پانچ بجے ہے۔"

وحید نے کتابیں رکھ دیں اور ادھر ادھر وقت گزاری کرتا رہا۔ اس کے انداز میں بے چینی تھی۔ اس کا بس چلتا تو گھڑی میں پانچ بجاتا اور کھیلنے کے لئے نکل جاتا۔

"بیٹے.... تمہیں یاد ہے ناکہ کس وقت تمہیں گھر لوٹ آنا ہے؟" حمید احمد نے پوچھا۔

"جی ابو۔ مغرب کی اذان سے پہلے۔"

"اور یہ بھی یاد ہے ناکہ باہر جا کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنا تمہاری ضرورت ہے۔ ان سے کوئی اچھی بات ضرور سیکھو۔ لیکن کوئی بری بات نہ سیکھو۔ اپنی زبان خراب نہ کرو چاہے تمہارے ساتھ کھیلنے والوں کو یہ اچھا لگتا ہو۔"

"مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے ابو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔" حمید احمد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

وحید باہر چلا گیا۔ حمید احمد، بلقیس بیگم کی طرف آ گئے۔ "تم بچے سے کتنی بڑی باتیں کرتے ہو بیٹے۔" بلقیس بیگم نے کہا۔

"یہی وقت ہوتا ہے ان باتوں کا اماں۔" حمید احمد نے جواب دیا۔ "عمر کے اس حصے میں جو سمجھ میں آ گیا، وہ ساری عمر ساتھ رہتا ہے، شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ جوانی میں کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ ہنس دیئے۔ "جوانی تو باغی ہوتی ہے اماں۔"

بلقیس بیگم نے انہیں محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ "میں یہ سب کچھ کیا جانوں بیٹے! مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ تم ماشاءاللہ بہت عقل مند ہو۔"

"یہ آپ کی محبت ہے اماں۔" حمید احمد مسکرائے۔ "ورنہ وحید کی اصل تربیت تو آپ کر رہی ہیں۔ اس کی شخصیت کی تعمیر کر رہی ہیں۔"

"میں تو صرف محبت کر رہی ہوں بیٹا۔ اور کچھ تو مجھے آتا ہی نہیں ہے۔"

"اچھا.... یہ کیا کر رہی ہیں؟" حمید احمد نے کروشیئے کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے.... یہ تو وقت گزاری ہے۔" بلقیس بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایک بات میں کب سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے۔" حمید احمد نے اچانک کہا۔

''تو پوچھتے کیوں نہیں؟''

''آپ کا دن کیسے گزرتا ہے؟'' حمید احمد نے پوچھا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔ '' مطلب ہے 'دن کا وہ حصہ جب آپ اکیلی ہوتی ہیں۔ جب میں کالج گیا ہوتا ہوں اور و سکول۔ وہ وقت آپ کیسے گزارتی ہیں۔''

''ارے.... وقت کا کیا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا۔ گھر کے کام بھی ہوتے ہیں اور فر کے وقت میں کبھی مڑ کر پیچھے دیکھ لیتی ہوں۔ بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔'' بلقیس بیگم نے سر بھری۔ حمید احمد افسردہ ہوگئے۔ ''نہیں اماں۔ میں جانتا ہوں۔ آپ کا دل بہت گھبرا ہوگا۔''

''ارے نہیں بیٹے!''

''اور آپ پہلے جو بچوں کو قرآنی تعلیم دیتی تھیں۔''

''تب وقت نہیں کٹتا تھا....''

''اجر کا کام بھی تو تھا اماں۔ آپ نے چھوڑ کیوں دیا؟''

''فرصت ہی کہاں تھی.... اور پھر....'' بلقیس بیگم کہتے کہتے یوں خاموش ہوگئیں جیسے منہ سے کوئی غلط بات نکلنے والی ہو۔

''کہیں نا' آپ کیا کہہ رہی تھیں۔''

''کوئی خاص بات نہیں۔'' بلقیس بیگم کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔

''بتائیں نا' آپ کو میری قسم۔''

''تم بھی بچوں کی طرح پیچھے پڑ جاتے ہو۔'' بلقیس بیگم نے خفگی سے کہا۔ پھر ذ شرمندگی سے بولیں۔ ''پہلے تو ننھے وحید میں الجھی رہتی تھی۔ فرصت ہی نہیں ہو تھی....''

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ جب وحید سکول جانے لگا تو فرصت بھی ملنے لگی آپ اور اب ماشاء اللہ وہ نو سال کا ہے۔ باہر کھیلنے بھی جاتا ہے۔ مجھ سے آپ سے کچھ دور ہو ہے.... اور ہوتا چلا جائے گا....''

''خیر.... دور تو نہیں ہو رہا ہے' نہ ہوگا۔''

''اماں.... یہ فطری ہے۔ وہ تالاب سے ندی میں گیا ہے۔ اسے دریا میں اور پھر سمند

میں جانا ہے۔'' حمید احمد نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ فرصت ملنے پر بھی آپ کو بچوں کو قرآن پڑھانے کا خیال نہیں آیا؟''

''آیا تھا۔ میں یہ سوچ کر رہ گئی کہ شاید تمہیں اچھا نہ لگے۔'' بلقیس بیگم نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''یہ آپ نے کیوں سوچا؟''

''بس یونہی خیال آیا کہ تم سوچو گے' میں آئی تو وحید کے لئے ہوں اور دوسروں کے بچوں کو وقت دے رہی ہوں۔''

''میرا اپنا کام دوسروں کے بچوں کو پڑھانا ہے اماں!'' حمید احمد کے لہجے میں شکایت تھی۔

''آپ نے مجھے اتنا چھوٹا کیوں سمجھا۔''

''خود چھوٹی ہوں نا اس لئے۔'' بلقیس بیگم نے آہ بھر کر کہا۔

حمید احمد تڑپ گئے۔ ''ایسا نہ کہیں' چھوٹا تو میں واقعی ہوں۔ وحید کو سکول جاتے پانچ سال ہوگئے اور مجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ آپ کو تنہائی ستاتی ہوگی....''

''ایسا بھی نہیں ہے۔'' بلقیس بیگم نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہوں۔''

''چھوٹے بچوں کو پڑھانے لگیں تو دوسراہٹ بھی ہوگی' بس آپ ایسا کرلیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹے!''

اس لمحے حمید انہیں بالکل صابر علی کی طرح لگا۔ صابر علی نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اور کبھی کبھی تو بلقیس بیگم کو یہ لگتا تھا کہ یہ حمید احمد ان کا اور صابر علی کا بیٹا ہے۔ وہ عادت واطوار میں صابر علی سے بہت ملتا تھا۔

وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اپنے لالوکھیت کے گھر میں پہنچ گئیں' جہاں صابر علی نے ان سے یہ بات کہی تھی....

☆

''آپ بچوں سے اتنا تو چڑتے ہیں۔ انہیں اپنے گھر میں کہاں برداشت کریں گے۔'' بلقیس بیگم نے صابر علی کی بات سن کر کہا۔

''تمہاری خاطر.... صرف تمہاری خاطر بلقیس بیگم!'' صابر علی نے گہری سانس لے کر

کہا۔ اس وقت بلقیس بیگم ان کی بات کا اصل مفہوم نہیں سمجھ سکیں۔ وہ تو بہت بعد میں
کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ "تمہاری خاطر میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں
تمہیں خوش دیکھنے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں اور پھر یہ گھر بھی تو مختلف ہے۔"

بلقیس بیگم نے کچھ نہیں کہا۔ بس وضاحت طلب نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔

"دیکھونا۔ یہ اس سرکاری کوارٹر جیسا تو نہیں۔ وہ تو بہت ہی چھوٹا تھا۔" صابر علی بولے
"یہ کشادہ ہے۔ پھر میں نے اسے بنوایا ہی یہ سوچ کر ہے۔ وہ الگ تھلگ بیٹھک ہے میرے
لئے۔" جس کا دروازہ باہر بھی کھلتا ہے۔" انہوں نے اشارہ کیا۔ "اب یہاں رہیں گے
گھر ہے۔ تو دوستیاں بھی ہوں گی۔ میرے دوست آئیں گے تو اس بیٹھک میں نشست ہو
اور مجھے گھر کا پتہ بھی نہیں چلے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ گھر تو تمہارا ہی ہے۔"

"جی نہیں۔ گھر تو آپ کا ہے۔"

"دونوں کا ہے۔ تمہارا کچھ زیادہ ہے۔ تم منتظم بھی ہو۔"

وہ بہت بڑی حوصلہ افزائی تھی بلقیس بیگم کی۔ کہاں تو وہ ایک بچے کو ترستی تھیں
کہاں دیکھتے ہی دیکھتے کم و بیش دو درجن بچوں کی اماں ہو گئیں۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کہا
لیکن یہاں بچوں نے ابتدا ہی سے انہیں اماں کہا۔ بن مانگے ہی سب کچھ مل رہا تھا۔

چنانچہ وہ گھر جس کے سونے پن سے' جس کی تنہائی سے وہ ڈرتی تھیں۔ علاقے کا سب
سے بارونق گھر بن گیا۔ وہ سوچتی تھیں کہ وہ گھر ان کی ضرورت سے بہت بڑا ہے۔ مگر وہ
چھوٹا پڑ گیا۔ بچے وہاں ہر وقت بھرے رہتے تھے۔ صبح اور شام کے وقت تو وہ پڑھنے کے
لئے آتے تھے۔ مگر باقی وقت وہ اماں کی محبت میں وہاں دھرے رہتے تھے۔ سب کچھ وہاں
ہوتا تھا۔ مار پیٹ' سر پھٹول بھی وہاں ہوتا، تو مرہم پٹی بھی وہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک چھوٹی
سی' آزاد اور خود مختار ریاست تھی۔ بلقیس بیگم، جگت اماں، وہاں مطلق العنان تھیں۔ وہی
فرماں روا' وہی منصف' وہی محکمہ تعزیر کی سربراہ۔ مظلوم کو سینے سے لگا کر اس کی اشک شوئی
اور دل جوئی بھی وہی کرتیں اور ظالم کی خبر بھی وہی لیتیں۔ جرم کی مناسبت سے ظالم کو سزا
دی جاتی۔ کبھی بات زبانی ڈانٹ ڈپٹ پر ٹلتی۔ کبھی ظالم کو قید تنہائی کی سزا دی جاتی اور کبھی
اس کی مرمت بھی ہو جاتی۔ مگر کسی کو کبھی منصف سے شکایت نہ ہوتی۔ نہ سزا پانے والے کو
نہ اس کے گھر والوں کو اور یہ بھی تھا کہ سزا پوری ہونے کے بعد مجرم کی خاطر مدارات بھی

ہوتی تھی۔

وہ ایک باقاعدہ نظام تھا.... قدرت کے نظام سے منسلک۔ علاقے کے ہر بچے کی بسم اللہ
اماں کے گھر میں ہوتی تھی۔ چار سال کے بچے آتے۔ بسم اللہ ہوتی نورانی قاعدے سے
تعلیم شروع ہوتی اور ختم قرآن پر مکمل ہوتی۔ پھر ان بچوں کی سکول کی تعلیم شروع ہو جاتی
اور ان کی مصروفیات بڑھ جاتیں۔ اماں کے پاس ان کا آنا کم ہو جاتا۔ مگر چھوٹتا نہیں تھا۔ بچے
بڑے ہو جاتے۔ لیکن اماں کے پاس ویسے ہی آتے رہتے۔ اور ان کی جگہ پہلے ہی چھوٹے
بچوں کی نئی کھیپ لے چکی ہوتی تھی۔

چھوٹے بچوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی تھی۔ دو بچے قرآن ختم کرتے تو چار بسم اللہ
کے لئے تیار ہو چکے ہوتے۔ اماں کے گھر کی رونق میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا اور علاقے میں
سب سے خوش حال گھر بھی وہی تھا۔

کبھی کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو بلقیس بیگم گھر کو بچوں پر چھوڑ کر اس کے گھر کی طرف
لپکتیں۔ وہ وہاں وقت گزارتیں' اس کی تیمارداری اور دیکھ ریکھ کرتیں۔ بچے کی ماں بے چاری
بھی اسے اتنا وقت نہ دے پاتی تھی۔

تو صورت حال یہ ہوئی کہ وقت پر لگا کر اڑ جاتا تھا۔ انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کب دوپہر'
کب شام ہو گئی اور کب رات آ گئی۔ کہاں یہ عالم تھا کہ وہ تنہائی کی وجہ سے گھبراتی تھیں کہ
پہاڑ جیسا دن کیسے گزرے گا اور کہاں وہ وقت سے شاکی ہو گئیں کہ وہ کچھ کرنے کی مہلت ہی
نہیں دیتا۔ تیزی سے گزر جاتا ہے۔ رات کو وہ تھکی ہاری لیٹتیں اور بے سدھ ہو کر سو
جاتیں۔ کتنی اچھی نیند آتی تھی۔ کسی محرومی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی
تھی۔

یہاں اپنے گھر میں صابر علی بھی بالکل بدل گئے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں وہ بہت اچھے
ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی مصروفیات بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ ملنے جلنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا
تھا۔ یہ بلقیس بیگم کے لئے ایک اور آسانی تھی۔ صابر علی دفتر سے مقررہ وقت پر آتے تھے۔
اب لیٹ آنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ اس وقت سے ذرا پہلے ہی بچوں کی چھٹی کر دیتی
تھیں۔ صابر علی آتے' ہاتھ منہ دھوتے' کپڑے بدلتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے۔
خوش مزاجی سے باتیں کرتے۔ پھر کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی۔ پتہ چلتا کہ ان کا کوئی

دوست آیا ہے۔ وہ جا کر دیکھتے۔ بیٹھک کا باہر کا دروازہ کھول کر آنے والے کو بٹھاتے اور
بلقیس بیگم کو مطلع کرتے۔ "زحمت تو ہو گی۔ تم چائے بنا دو ذرا۔" وہ فرمائش کرتے۔

"زحمت کیسی؟ کمال کرتے ہیں آپ!"

بیٹھک کا سلسلہ شروع ہوتا تو رات تک چلتا۔ صابر علی کے دوست آتے رہتے۔ یہ
عجیب جادو تھا۔ جیسے ہی صابر علی بیٹھک میں جاتے' نہ جانے کیسے بچوں کو پتہ چل جاتا
میدان صاف ہو گیا۔ وہ پھر سے گھر پر دھاوا بول دیتے۔

بلقیس بیگم بیٹھک والوں کے لئے اہتمام بھی کرتی رہتیں۔ کبھی پکوان تل دیتیں۔
بازار سے کچھ منگوا لیتیں۔ مگر وہ خود بیٹھک کی طرف کبھی نہیں گئیں۔ بس وہ دن میں
کے لئے ایک بار بیٹھک میں جاتی تھیں۔ پردہ وہ بڑے اہتمام سے کرتی تھیں۔ صابر علی
کسی دوست کو انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ٹرے لے کر جاتیں اور بیٹھک کے صحن میں کھ
والے دروازے پر دستک دیتیں۔ صابر علی دروازہ کھولتے اور ٹرے لے لیتے۔ ایسا بھی
ہوتا تھا کہ صابر علی آتے اور انہیں چائے کے لئے کہتے۔ بلقیس بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ
آئیں اور بچوں کو دیکھ کر جھنجلائیں۔ اس لئے چائے وہ خود ہی دے آتی تھیں۔ وہ خود ہی
پوچھ لیتی تھیں کہ اندر کتنے افراد ہیں۔

بچے رات کو اس وقت اپنے اپنے گھر جاتے' جب انہیں نیند آنے لگتی اور صابر علی
کے بھی کچھ بعد گھر میں آتے۔ پھر وہ دونوں ساتھ کھانا کھاتے۔ کھانے کے بعد صابر
صحن میں ہی ٹہلتے۔ وہ بار بار آسمان پر ستاروں کو دیکھتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔ "یہ اتنا
صحن ایک بہت بڑی نعمت ہے۔"

اس پر بلقیس بیگم کو مہاجر کیمپ یاد آتا' وہ کہتیں۔ "یہ گھر ہی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم
سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نصیب نہیں تھا۔"

"بے شک۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔" صابر علی صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جا
"آؤ بلقیس یہاں بیٹھو میرے ساتھ۔"

ایک دن صابر علی نے کہا۔ "تم بہت اچھی..... بہت صابر ہو بلقیس بیگم۔ تمہاری خا
سے اللہ نے مجھ پر عنایت کی کہ مجھے یہ سب ملا۔"

"میں ایسی کہاں ہوں۔ اصل میں آپ بہت اچھے ہیں۔" بلقیس بیگم نے بے حد خ

سے کہا۔

"نہیں۔ سچ یہ ہے کہ تم سے اچھا کون ہو سکتا ہے" صابر علی نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے
کہا۔ "ورنہ میں تو تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا۔ الٹا زندگی کی سب سے بڑی محرومی تمہیں میری
وجہ سے ملی اور پھر بھی تم....."

بلقیس بیگم نے بہت تیزی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب.... اور آئندہ کبھی
ایسی بات نہ کیجئے گا۔ یہ تو سب اللہ کی مرضی کا کھیل ہے۔ اور ہمیں اسی میں خوش رہنا ہے۔
کمی تو مجھ میں بھی ہو سکتی تھی۔"

"مگر میں اس صورت میں کم ظرف ثابت ہوتا۔" صابر علی نے گہری سانس لے کر کہا۔
"میں تو اس محرومی کو دور کرنے کے لئے دوسری شادی کر لیتا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ ہرگز ایسا نہ کرتے۔" بلقیس بیگم نے بڑے یقین سے کہا۔

"تم ایسے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"یقین کا تعلق دل سے ہے اور دل سب کچھ جانتا ہے۔"

"اور دل ہی آدمی کو خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے۔"

بلقیس بیگم نے ان کی سنی ان سنی کر دی۔ "اور ایک بات بتاؤں آپ کو....؟ سچ سچ۔"

صحن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ اس چاندنی میں بلقیس بیگم کے چہرے کا ایک ایک نقش اور
آنکھوں کی کیفیت بالکل روشن اور واضح تھی۔ صابر علی انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"اگر کمی مجھ میں ہوتی تو میں خود آپ کی دوسری شادی کراتی۔ خود آپ کے لئے دلہن
ڈھونڈتی' خود سب کچھ کرتی۔"

"اس کا تو مجھے یقین ہے۔"

"کیسے؟"

"بس میں جانتا ہوں۔ بالکل شروع سے جانتا ہوں۔" صابر علی کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا۔
"اور میں اس سے ڈرتا رہا ہوں۔"

"بس آئندہ یہ تذکرہ نہ چھیڑیئے گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ کتنے بچے مجھ سے ماں جیسی
محبت کرتے ہیں۔ میری محرومی تو دور ہو گئی۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"اور یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ میری خاطر ان بچوں کو برداشت کرتے ہیں۔"
بیگم نے احسان مندی سے کہا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے بلقیس بیگم۔ بچے اب مجھے اتنے برے بھی نہیں لگتے۔"

صابر علی کا وہ جملہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔ بوجھ ہلکا کر دینے والا۔ اس سے پہلے بلقیس کو یہ خلش رہتی تھی کہ کہیں محلے کے ان بچوں کی وجہ سے وہ صابر علی کی حق تلفی تو رہی ہیں۔ کہیں ان کے معاملات میں ان سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ یہ خیا کے دل میں آتا تھا۔ مگر پھر وہ سوچتی تھیں کہ ایسا نہیں ہے۔ صابر علی رات نو دس ب اپنی بیٹھک میں دوستوں میں مگن رہتے ہیں۔ اتوار کو بھی گھر سے نکل جاتے ہیں اور کے بعد ہی گھر میں گھستے ہیں۔ بہرحال جب وہ ان کے پاس ہوتے تھے تو وہ ان کی ہر ضر کا خیال رکھتی تھیں۔ سر میں تیل لگاتی تھیں۔ ٹانگیں دباتی تھیں۔ انہیں ہر ممکن پہنچاتی تھیں۔ یہ الگ بات کہ وہ ان کے ہاتھ کم ہی آتے تھے۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد قدرت نے بلقیس بیگم کو ایک موقع فراہم کر دیا۔ صابر علی دفتر سے ذرا دیر سے آئے۔ آتے ہی خلاف معمول انہوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور اندر گئے۔ پھر وہ دروازہ بھیڑ کر بلقیس بیگم کے پاس آئے تو کچھ گھ ہوئے تھے۔ "خیریت تو ہے؟ کیا بات ہے؟ بلقیس بیگم بھی گھبرا گئیں۔

"وہ.... دفتر سے تین دوست آئے ہیں میرے ساتھ۔"

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟" وہ کچھ مطمئن ہو گئیں۔

"بھئی.... وہ کھانا بھی کھائیں گے۔"

"تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔"

"ارے.... کچھ اہتمام کرنا ہوگا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔"

"میں ان کے ساتھ نہ بیٹھوں تو یہ بھی بری بات ہوگی۔"

"تو آپ جا کر بیٹھیں ان کے ساتھ۔"

"مگر گوشت ترکاری، سودا سلف...."

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ سب ہو جائے گا۔ آپ جا کر ان کے ساتھ بیٹھیں۔"

بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

صابر علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مگر ان کے کہنے پر وہ بیٹھک میں چلے گئے۔ اب یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہاں وہ کیسے بیٹھے رہے۔ بہرحال بیس منٹ بعد بلقیس بیگم نے بیٹھک کے دروازے پر دستک دی اور بسکٹ اور پکوڑوں کے ساتھ چائے اندر دے دی۔

بچے آگئے تھے۔ بلقیس بیگم نے ان سے سودا منگوایا اور کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا انہوں نے۔ کئی طرح کے سالن بنائے۔ میٹھا الگ تھا۔ بچے بھی بڑے جوش و خروش سے ان کے ساتھ لگے رہے۔ اوپر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

بالآخر بلقیس بیگم نے بیٹھک کے دروازے پر دستک دی۔ صابر علی نے دروازہ کھولا تو وہ دسترخوان لئے کھڑی تھیں۔ "آپ دسترخوان بچھالیں اور دروازہ کھلا چھوڑ دیں' وہ بولیں۔
"بچے سب کچھ لگا دیں گے۔"

بچوں کو انہوں نے سمجھا دیا تھا۔ وہ باورچی خانے میں بیٹھی رہیں۔ بچوں نے سب کچھ لے جا کر سلیقے سے لگا دیا۔ ایک بچہ پانی کی سلفچی لئے دروازے پر کھڑا تھا تو دوسرے کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ مہمانوں کے ہاتھ دھلوا دیئے گئے۔ اس کے بعد بھی بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے رہے۔ کوئی قاب لے کر آرہے ہیں۔ سالن کے لئے گرم روٹی لے کر جا رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ سب کچھ سلیقے اور ڈھنگ سے ہو گیا۔

اس رات صابر علی ان کے پاس آئے تو جیسے اچنبھے میں تھے۔ مگر خوش بھی بہت تھے۔ "بچوں نے کمال کر دیا۔" انہوں نے کہا۔ "مجھے ہلنے بھی نہیں دیا اور کوئی کمی بھی نہیں ہونے دی۔"

"جی۔ بچے بڑی نعمت ہوتے ہیں۔" بلقیس بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اور اللہ نے آپ کو ماشاءاللہ اتنے سارے دیئے ہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" بلقیس بیگم نے ستاروں بھرے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔"

اس دن کے بعد گھر کی فضا بہت بہتر ہو گئی۔ بچوں کے ساتھ صابر علی کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ بلقیس بیگم بہت خوش تھیں۔ مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس خوشی کے دن بہت

تھوڑے ہیں اور اس کے بعد ایک مستقل ساتھ رہنے والا دکھ ہے اور سب کے ہوتے
تنہائی۔

وہ 64ء تھا۔ انہیں لالوکھیت کے مکان میں آئے سات برس ہوئے تھے۔ وہ بڑی
شام تھی، جب صابر علی گھر تو آئے مگر اپنے پیروں پر چل کر نہیں، ایمبولینس میں لد
زندہ نہیں، ایک لاش کی صورت۔ وہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے ختم ہو گئے تھے۔ کسی کو کچھ کر
مہلت بھی نہیں دی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کا احسان نہیں لیا تھا.... آخری سانس پر
آسمان جیسے بلقیس بیگم پر گر پڑا۔ ان کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ دنیا میں ان کا کوئی نہ
پڑوسیوں کے، بستی کے لوگوں کے سوا۔ کسی کی آمد کا انتظار بھی نہیں تھا کہ جانے وا
رات بھر کے لئے ہی روک لیتیں۔ سو جانے والا عشاء کی نماز کے ساتھ ہی رخصت ہو
جاتے وقت انہوں نے دروازے سے ان کے ڈولے کو اٹھتے دیکھا۔ دیکھا کیا
آنسوؤں کے پار کیا دیکھا جا سکتا ہے.... اور کتنا دیکھا جا سکتا ہے۔ پڑوس کی عورتیں
اندر لے گئیں۔ وہ صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود ایک خلش میں مبتلا ہو گ
بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔۔ جاتے وقت انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا، اس م
بات ایسی تھی کہ اگر وہ نارمل ہوتیں تو اس پر حیران ہوتیں لیکن وہ دکھ سے نڈھال
اس لئے اسے سمجھ نہ سکیں۔ یہی بہت تھا کہ انہوں نے اسے محسوس کیا اور وہ خلش بن
وہ کیا تھی، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جنازے کا وہ منظر ان کی یادداشت سے چپک گیا تھا۔ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں سک
اور اسے یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ کسی کتاب کے بہت زیادہ دیکھے جانے
ورق کی طرح بار بار ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا اور ہر بار وہ خلش بھی انہیں ستا
انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر اس منظر کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس کی جزئیات
دے سکیں۔

وہ بہت پر ہجوم منظر تھا۔ کتنے سارے لوگ تھے۔ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں
بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ سب ان کے گھر میں روز آنے والے بچے تھے اور....
خلش ان کی سمجھ میں آ گئی۔

ڈولے کو چاروں طرف سے پکڑنے والے بڑے لڑکے تھے اور وہ لڑکے پھوٹ

کر رو رہے تھے۔ وہ ابا.... ابا.... پکار رہے تھے۔

ان کا بہت برا حال تھا۔ محلے کے بڑے لوگ انہیں لپٹا کر دلاسے دے رہے تھے جیسے وہ
لڑکے ہی مرنے والے کے لواحقین ہوں۔

اور پھر سب سے پہلے جنازے کو اٹھانے والے بھی وہی لڑکے تھے۔ کتنی نرمی، کتنی
نزاکت سے انہوں نے ڈولے کو اٹھایا تھا اور ان لڑکوں کی عمریں سولہ سال سے اٹھارہ سال
کے درمیان رہی ہوں گی۔

"وہ لڑکے کون تھے؟ وہ دکھ سے اتنے نڈھال کیوں تھے؟ اور لوگ انہیں اتنی محبت سے
دلاسا کیوں دے رہے تھے؟"

لفظ بیٹے، بالکل اچانک ان کے ذہن میں ابھرا۔ انہوں نے سوچا، ممکن ہے.... لیکن
نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو پھر؟ اور اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

انہوں نے پڑوس کی عورت سے اس بارے میں استفسار کیا۔ پاس بیٹھے ہوئے سعید نے
جلدی سے کہا۔ "ارے.... وہ انعام بھائی، امین بھائی.... وہ لوگ تو ابا کے دوست تھے۔"

بلقیس بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا "دوست....؟"

"جی.... ابا نے ان کے لئے کرکٹ ٹیم بنائی تھی۔" سعید نے بتایا۔

"بلقیس بیگم کے لئے ایک نئی خلش پیدا ہو گئی۔ وہ اسے بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

پھر ایک دن دھماکا ہو گیا۔

وہ صابر علی کے انتقال کا پانچواں دن تھا۔ سعید نے آ کر ان سے کہا۔ "وہ انعام بھائی آئے
ہیں، آپ سے ملنے کے لئے۔"

بلقیس بیگم اس وقت صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "میں عدت میں ہوں بیٹے۔
اور ویسے بھی میں ان کے سامنے کیسے آ سکتی ہوں؟"

باہر سے کسی نے کہا۔ "لیکن ہم تو آپ کے بیٹے ہیں اماں۔"

"ابا کے بیٹے آپ کے بھی بیٹے ہوئے نا۔" یہ دوسری آواز تھی۔

پھر باہر کوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بلقیس بیگم تڑپ گئیں۔ "انہیں بلا لو بیٹے!"

لڑکے آ گئے۔ ان سے تعارف ہوا۔ انعام کا سب سے برا حال تھا۔ وہ یتیم تھا۔ اس کے
لئے صابر علی ہی ابا تھے اور صابر علی سب سے پہلے اسی سے ملے تھے۔ پتہ چلا کہ ان کی کرکٹ

ٹیم صابر علی ہی نے بنوائی تھی۔ وہی اس کے اخراجات اٹھاتے تھے۔

"کتنا عرصہ ہو گیا تمہاری اس ٹیم کو بنے؟" بلقیس بیگم نے پوچھا۔

"آٹھ سال۔" امین نے بتایا۔

"آٹھ سال! یہ کیسے ممکن ہے۔ ہمیں تو یہاں آئے سات سال ہوئے ہیں۔"

لڑکوں کی، کی ہوئی وضاحت ایک نامکمل تصویر کا حصہ بن گئی۔

"ہم صرف یہ کہنے آئے ہیں اماں کہ آپ اکیلی نہیں۔ آپ کے بیٹے موجود ہیں۔ آپ جب چاہیں، جو چاہیں حکم دے سکتی ہیں۔" لڑکوں نے بیک آواز کہا۔

ان کے جانے کے بعد بلقیس بیگم نے سعید کو دیکھا جو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ "تجھے کیا ہوا سعید؟" انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

سعید نے نہ سر اٹھایا، نہ منہ سے کچھ کہا۔

انہوں نے اسے جھنجوڑا۔ وہ رو رہا تھا.... بری طرح۔ انہوں نے پانی لا کر اسے پلایا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔ "اماں.... ابا بہت اچھے تھے۔"

بلقیس بیگم اچنبھے میں رہ گئیں۔ یہ کیا جانے انہیں؟ پھر رو کیوں رہا ہے؟ انہوں نے سوال کیے، جواب سنے اور سمجھا کہ تصویر مکمل ہو گئی۔

انہوں نے تصور میں سب کچھ دیکھا!

صابر علی نے پلاٹ خرید لیا تھا۔ مکان نہیں بنا تھا۔ اسے بنوانا تھا۔ وہ باقاعدگی سے یہاں آتے تھے۔ انہیں انعام، امین اور دوسرے لڑکے ملے۔ وہ ان سے گھل مل گئے۔ انہوں نے باپ کے سائے سے محروم انعام کو اتنی محبت دی تھی کہ وہ انہیں ابا مان بیٹھا۔ انہوں نے کرکٹ ٹیم بنائی۔ مکان بننے میں لڑکوں نے ان کی بڑی مدد کی۔ مکان بن گیا اور وہ لوگ یہاں آ بسے۔ مگر اس سے پہلے ہی صابر علی لوگوں کے.... خاص طور پر لڑکوں کے دل میں چکے تھے۔

وہ دیکھتی رہیں!

بیٹھک کا صحن میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند ہے۔ صابر علی باہر کے دروازے سے نکلتے ہیں۔ بچوں کو ٹافیاں دیتے، پیار کرتے ہیں۔ "یار سنو.... اپنی اماں کے سامنے مجھے ابا نہ کہنا۔ گھر میں مجھ سے دور رہنا، ڈرتے رہنا۔ تمہاری اماں کو پتہ نہ چلے کہ تمہاری مجھ

دوستی ہے۔ ورنہ دوستی ختم۔ ٹھیک ہے؟"

وہ آگے جاتے۔ بڑے لڑکوں کو کرکٹ کھیلتا دیکھتے۔ ان سے باتیں کرتے۔ ان کے مسئلے سنتے۔ کبھی ان کی مدد کرتے، کبھی مشورہ دیتے اور کبھی حوصلہ بڑھاتے۔

"ابا.... اتوار کو میچ ہے، آئیں گے نا؟"

"ہاں، آؤں گا تھوڑی دیر کے لئے۔"

"زبردست ٹیم سے میچ ہے ابا۔ کیا بنے گا ہمارا۔"

"جیت جاؤ گے انشاء اللہ۔ اور نہیں تو ہار جاؤ گے.... اگلی بار ان سے جیتنے کے لئے۔"

پھر صابر علی اٹھتے۔ "چلو.... تمہیں چائے پلواؤں۔ ہو سکتا ہے بسکٹ یا پکوڑے بھی مل جائیں۔"

وہ سب بیٹھک میں چلے آتے۔ صابر علی جا کر بلقیس بیگم سے کہتے۔ "چھ پیالی چائے کا سوال ہے بلقیس بیگم...."

تو یہ ہے مکمل تصویر۔ بلقیس بیگم نے سوچا۔ کتنے گہرے آدمی تھے صابر علی۔ میرے محرومی کے احساس کو ہلکا کرنے کے لئے اپنی محرومی چھپاتے تھے۔ ظاہر کرتے تھے کہ انہیں بچے کی پرواہ نہیں۔ ضرورت بھی نہیں اور اتنے چپکے چپکے محبت کر کر کے اپنے اور میرے لئے اتنے سارے بیٹے کما لئے۔ میں نے سوچا بھی نہیں کہ مرد بیٹے کے بغیر کہاں رہ سکتا ہے۔ اب مجبوری تھی ان کی۔ اللہ کو منظور نہیں تھا مگر کتنے ظرف والے تھے صابر علی۔ مجھے کبھی احساس بھی نہیں ہونے دیا اور اپنے صبر سے میرے احساس محرومی کو مٹا دیا۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ تصویر اب بھی مکمل نہیں!

ایک دن ایبے سینیا لائن سے لوگ پرسے کے لئے آ گئے، جہاں انہوں نے سرکاری کوارٹر میں دس سال گزارے تھے۔

"وہ ہر اتوار کو آتے تھے، علاقے کے لڑکوں سے ملتے تھے...."

"زیادہ دیر نہیں رکتے تھے۔ کہتے تھے، جانا ہے۔ وہاں لڑکوں کا میچ دیکھنا ہے۔ انہیں میری ضرورت ہے...."

بلقیس بیگم کو لگا کہ تصویر مکمل ہو گئی ہے!

وہ تصور میں سب کچھ دیکھ سکتی تھیں....

"بلقیس .... میرے گھر میں ہوتے ہوئے جو تم پڑوس کے بچوں کو زحمت دیتی ہو
مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کچھ منگوانا ہو تو مجھے کہہ دیا کرو۔" کبھی صابر علی نے کہا تھا۔

"آپ تھکے ہارے آتے ہیں۔"

"آتا ہوں اور تمہیں دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں کہ تمہاری خاطر کام نہ کر سکوں۔"

"مگر دن بھر یہی بچے میرے کام کرتے ہیں۔"

"اس وقت میں جو موجود نہیں ہوتا۔ میری موجودگی میں تو میرا حصہ مجھی کو دیا کرو۔"

اب وہ سمجھ سکتی تھیں کہ وہ کوئی چیز لینے جاتے تو دیر سے واپس کیوں آتے تھے۔ بھول کر وہ بچوں میں الجھ جاتے تھے۔ وہ گھر پر انتظار کرتیں اور جھنجلاتیں۔ وہ واپس آتے کہتیں۔ "آپ سے کچھ منگواؤں تو یہ مصیبت ہے۔ چیز آتے آتے اس کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اتنی دیر لگا دی آپ نے۔"

"معاف کرنا۔ باہر نکلتا ہوں تو کوئی دوست باتوں میں لگا لیتا ہے ورنہ میں کہاں باہر چاہتا ہوں۔" وہ شرمندگی سے کہتے۔

تو یہ تھے صابر علی اور زندگی میں انہوں نے پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ یہ ہیں۔ صرف لئے کہ یہ جان کر وہ اولاد کے لئے تڑپنے لگتیں۔ زخم محرومی ہرا ہی رہتا۔ وہ شخص جس دوست بچے اور لڑکے تھے۔ اور اس نے دور جا کر بھی پہلوں کو نہیں چھوڑا۔ چھٹی کے آرام کے دن وہ آرام چھوڑ کر پہلے پرانے علاقے میں جاتے۔ پھر وہاں سے اپنے علاقے جا کر میچ دیکھتے لڑکوں کا۔ خدا جانے' کھانا بھی کھاتے تھے یا نہیں۔

کیسا دکھ ہو گا ان کا.... کیسی محرومی۔ اور وہ یہ سب اندر ہی اندر سہتے تھے۔ ساجھا کرتے تھے۔ پھر آرام بھی نہیں۔ ایسے میں کتنا جیے گا آدمی۔ وہ تو پھر چوالیس سال جی تھے۔ ہائے.... کاش مجھے پتہ ہوتا۔ میں بھی ساجھا کرتی تو وہ اتنی جلدی نہ مرتے۔

مگر بلقیس بیگم نہیں جانتی تھیں کہ تصویر اب بھی مکمل نہیں ہوئی ہے!

صابر علی کی موت کو ایک ماہ ہوا ہو گا کہ ایک باوقار اور خوش لباس عورت پرسے لئے بلقیس بیگم کے گھر آئی۔ وہ اسے پہچان نہیں سکیں.... "معاف کیجئے' میں نے آ پہچانا نہیں۔" انہوں نے کہا۔

"بہت پرانی بات ہے۔ بہت پہلے ہم ملے تھے۔" عورت نے کہا۔ "میرا نام نجمہ ہے.... نجمہ فیاض...."

"مجھے نام بھی یاد نہیں آتا۔"

"ڈاکٹر نجمہ فیاض!"

ڈاکٹر سن کر بلقیس بیگم کے ذہن میں گھنٹی سی بجی۔ "کہیں وہ دفتر والی...."

"جی' میں وہی ہوں۔ دفتر کی ڈسپنسری کی ڈاکٹر۔"

بلقیس بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں سب کچھ یاد آ گیا۔ کیسے صابر علی انہیں لے کر گئے تھے۔ "سب کچھ ختم ہو گیا ڈاکٹر!" انہوں نے کہا اور رو پڑیں۔

ڈاکٹر نجمہ نے انہیں لپٹا لیا۔ تھپک تھپک کر انہیں دلاسا دیتی رہی۔ "میں جانتی ہوں۔ میں آخری لمحوں میں ان کے پاس تھی۔" اس نے کہا۔

"مجھے.... مجھے بتایئے.... ان کے آخری لمحوں کے بارے میں۔"

"بتانے کو کچھ بھی نہیں۔" ڈاکٹر نجمہ کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ انہوں نے تو پانی کا احسان بھی نہیں لیا کسی سے۔ ڈسپنسری میں آتے آتے وہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔"

بلقیس بیگم پھر رونے لگیں۔ "وہ ایسے ہی تھے.... خوددار.... سر اونچا رکھنے والے۔"

"میں آپ کے پاس بہت پہلے آ جاتی' ڈاکٹر نجمہ نے کہا۔ "مگر میں جھجکتی' سوچتی اور جھجکتی رہی۔ بتاؤں نہ بتاؤں۔ بڑی الجھن تھی۔ مگر اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔"

بلقیس بیگم کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

"اب سوچتی ہوں کہ ایسی بات تو نہیں تھی۔ مجھے جھجکنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ بات ایسی ہے آپ کی امانت کی طرح ہے۔"

بلقیس بیگم کی الجھن بھی بڑھ گئی اور دھڑکنوں کی رفتار بھی۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بہت بڑا راز کھلنے والا ہے۔ "آپ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر بہت عظیم انسان تھے۔"

بلقیس بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "اور یہ بات کہتے ہوئے آپ جھجک رہی تھیں؟"

"جی نہیں۔ یہ بات تو بے سوچے سمجھے بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ تو بہت بڑا سچ ہے بات ہے۔"

"تو وہ بھی بتادیں۔"

"آپ کو یاد ہے' جب آپ پہلی بار میرے پاس ڈسپنسری میں آئی تھیں۔"

بلقیس بیگم نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"آپ کے جاتے ہی صابر صاحب اکیلے میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کی تھی۔"

"دوا کی خوراک کے بارے میں۔"

"جی نہیں۔ وہ بات آپ کے بارے میں تھی۔ ان کے کہنے پر میں نے آپ سے یہ چھپائی تھی کہ آپ اولاد پیدا کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔"

بلقیس بیگم سناٹے میں آگئیں۔ کچھ دیر تو ان سے بولا ہی نہیں گیا۔ ان کے ذہن سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ پھر انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "لیکن اس دن تو آپ نے ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے۔ اس وقت تو ٹیسٹ ہوئے بھی نہیں تھے۔ پھر انہیں یہ کیسے معلوم کہ...."

"انہیں معلوم نہیں تھا' ڈر تھا اس بات کا اور ٹیسٹوں کی رپورٹوں سے ثابت ہوا کہ خدشہ درست تھا۔"

"لیکن انہوں نے کہا تھا کہ کمی ان میں...."

"یہی تو ان کی عظمت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ آپ کو میرے پہلی بار لانے سے پہلے ہی وہ اپنا مکمل چیک اپ کرا چکے تھے۔ وہ ہر اعتبار سے نارمل تھے۔ اپنے چیک اپ کے بعد انہیں یہ ڈر تھا کہ خدانخواستہ آپ میں کوئی کمی سامنے آئے اسی لئے انہوں نے مجھے پہلے ہی سمجھادیا تھا۔ مجھے یاد ہے' انہوں نے کہا تھا.... ڈاکٹر مجھے کی خواہش ہے لیکن میں اسے اہمیت نہیں دیتا۔ اگر اللہ نے یہ نعمت میرے لئے نہیں مجھے نہیں مل سکتی اور مجھے یقین ہے کہ اس میں ہماری بہتری ہو گی لیکن اگر میری بیوی کی ہے تو وہ مجھے سمجھ کر بھی نہیں سمجھے گی اور وہ عدم تحفظ محسوس کرے گی۔ اور یہ بھی ہے کہ وہ مجھے دوسری شادی پر مجبور کرے۔ کچھ بھی ہو' ہماری زندگی نارمل نہیں رہ

اور یہ میں نہیں چاہتا۔ اگر میں اپنے اندر کمی کا اعتراف کرلوں تو میری بیوی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ میری دل جوئی کی خاطر سچ مچ اپنی محرومی پر صبر کرلے گی۔ ڈاکٹر پلیز.... اگر میری بیوی میں کمی ہو تو اسے کبھی نہ بتانا...."

بلقیس بیگم کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے مسز صابر کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا۔ اب بھی میں یہی سوچ کر جھجکتی رہی ہوں کہ کیوں پرانی باتوں کو چھیڑوں۔ پھر آپ سے اس جھوٹ کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا۔ مگر میں نے سوچا کہ یہ ضروری ہے۔ آپ کو اپنے شوہر کے مرنے کے بعد یہ ضرور معلوم ہونا چاہئے تاکہ آپ انہیں ان کی عظمت کے شعور کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھیں۔ اب مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ بوجھ ہلکا کردیا۔ آپ سے جھوٹ بولنے پر میں شرمندہ ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے سزا دے...."

"ایسی باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحبہ!" بلقیس بیگم نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی۔ انہوں نے ڈاکٹر کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "آپ نے پہلے بھی مجھ پر احسان کیا.... مجھے میری کمی کے متعلق نہ بتا کر اور آج بھی آپ نے مجھ پر احسان کیا۔ مجھے حقیقت بتا کر۔ میں تو آپ کو صلہ بھی نہیں دے سکتی۔" وہ رونے لگیں۔ "وہ تو ساری عمر مجھ پر احسان کرتے رہے لیکن آپ نے اچھا کیا کہ مجھے بتادیا۔ اس احسان کا اجر تو انہیں اللہ ہی دے گا۔"

ڈاکٹر نجمہ اور تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھی' پھر چلی گئی۔

بلقیس بیگم کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ صابر علی کتنی محبت کرتے تھے ان سے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنی کمی تسلیم نہ کی ہوتی تو وہ خود ان کی دوسری شادی کراتیں۔ اس بات پر تو وہ لڑتیں ان سے۔ یقیناً تلخی ہوتی اور صابر علی کو ہار ماننی پڑتی۔ واقعی.... زندگی نارمل تو نہیں رہتی۔

واقعی.... کتنے عظیم انسان تھے صابر علی۔ ورنہ کوئی مرد کب اپنی مردانگی پر حرف آنے دیتا ہے۔ چاہے اس میں سچ مچ کمی ہو۔ وہ تسلیم تو نہیں کرتا۔ مگر صابر علی نے انہیں الجھنوں سے' احساس محرومی سے' احساس عدم تحفظ سے بچانے کے لئے سب کچھ اپنے سر لے لیا۔ کیا کرب سہا انہوں نے۔ وہ بچوں سے محبت کرنے والے تھے۔ مگر ان کی خاطر بچوں کے لئے ترستے رہے۔ ان سے چھپ چھپ کر دوسروں کے بچوں میں محبت اور شفقت تقسیم

کرتے رہے۔ چاہتے تو دوسری شادی کرتے اور اولاد پالیتے۔

"آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔" بلقیس بیگم کے دل سے ہوک اٹھی۔ انہوں شکایت کی۔ "اور جاتے جاتے مجھے کتنا چھوٹا پن دے گئے' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں انہوں نے سوچا' آج تصویر مکمل ہو گئی ہے۔

سچ یہ تھا کہ صابر علی انہیں بے آسرا چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ ان کا اپنا مکان تھا۔ ب واجبات کی شکل میں خاصی بڑی رقم ملی تھی انہیں۔ پھر صابر علی نے بیمہ پالیسی لے تھی۔ اس کی ادائیگی کے بعد بینک میں ان کے لئے دو لاکھ سے اوپر رقم موجود تھی او ملنے والی پنشن کی رقم اتنی معقول تھی کہ ان کے گزارے کے لئے بہت کافی تھی۔ ایک تھیں۔ اپنا کوئی خرچ تھا ہی نہیں ایک پان کے سوا۔ سو سب کچھ بچوں پر خرچ کر دیتی تھی اور صابر علی انہیں اتنے بیٹے دے کر گئے تھے کہ وہ سب کو جانتی بھی نہیں تھیں۔ ا ایک آواز پر پوری بستی دوڑی آتی تھی۔ تنہائی کا احساس تو انہیں کبھی ہوا ہی نہیں۔

مگر بلقیس بیگم کو نہیں معلوم تھا کہ تصویر اب بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ اس کا ایک ابھی سامنے نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ گمشدہ ٹکڑا انہیں آٹھ سال بعد ملے تصویر بڑی خوبصورتی سے مکمل ہو گی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا....

☆

پھر ایک دن نا معلوم گہرائی والی پرسکون جھیل کے بیچوں بیچ کسی نے ایک کنکر پھینک دیا! جن پانیوں کو ہوا بھی متلاطم نہ کر سکے' ان میں نظر آنے والے عکس کو بکھرا نہ سکے' ایک چھوٹا سا کنکر انہیں چھوٹے بڑے دائروں سے بھر دیتا ہے۔ کنکر کنارے پر گرے تو دائرے دور تک نہیں پھیلتے لیکن کنکر درمیان میں گرے تو جھیل چاروں طرف سے چھوٹے بڑے دائروں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور عکس کے اتنے ٹکڑے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے' وہ کانچ کا بنا ہوا تھا.... اور گر کر ٹوٹ گیا ہے۔

وہ جو عظمت تھی' کیفیت تھی' بے طلبی کے دم سے تھی۔ اسے کچھ چاہئے ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس محبت کئے جاتی تھی.... نفس نفس' دھڑکن دھڑکن اور کئے بھی کہاں جاتی تھی کہ کرنا تو مشقت ہوتا ہے۔ وہ تو ایسا تھا کہ کوئی سوئچ آن ہو گیا تھا اور برقی رو اس کے وجود میں دوڑنے لگی تھی اور وہ کیا کر رہی تھی؟ وہ تو بس انجوائے کر رہی تھی.... اس کی حدت حرارت کو.... اس کی روشنی کو' اس کی لطافت کو' اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے بعد' اس کے سوا اسے کچھ اور بھی چاہئے' وہ تو بس اسی حال میں مست و بے خود تھی۔

مگر پھر عکس بکھر گیا۔ اس کے ٹکڑے دائروں میں بٹ گئے۔

وہ کنکر کسی نے دانستہ نہیں مارا تھا۔ وہ تو ایک واقعے کا کنکر تھا' جو وقت کی ٹھوکر سے فضا میں اچھلا تھا اور جھیل کے بیچوں بیچ جا گرا تھا۔ ایسے کنکر جھیل میں گرتے رہتے ہیں اور جھیل کنکروں سے' بڑے بڑے پتھروں سے بھرنے لگے تو اس کی گہرائی کم ہو جاتی ہے۔ اس کا عکس اتنا شفاف نہیں رہتا۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ اس کی خالہ زاد بہن سمعیہ کی شادی طے ہو گئی تھی!

سمعیہ باجی' مدیحہ سے بارہ سال بڑی تھیں۔ وہ بچپن ہی سے ان سے بہت متاثر تھی۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا' ان کے حوالے سے بہت کچھ سمجھا تھا۔ وہ اسے بہت اچھی لگتی

تھیں کیونکہ وہ پورے خاندان میں سب سے مختلف تھیں۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے
کرنے والی۔ اور وہ دوسری لڑکیوں کی طرح کبھی عام گفتگو نہیں کرتی تھیں۔ کپڑے
فیشن.... انہیں ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ انہیں شعر و ادب سے
سے' پھولوں سے' رنگوں سے' ایسی چیزوں سے دلچسپی تھی۔ وہ بہت شوخ طبیعت تھیں
کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔ ان کی ہنسی کی کھنک آج بھی اس کے کانوں میں
تھی' اگرچہ وہ ایک بھولی بسری یاد بن چکی تھی۔

پھر باجی ایک دم بدل گئیں۔ وہ کھوئی کھوئی' چپ چپ رہنے لگیں۔ مسکراتی وہ اب
تھیں۔ مگر اس میں بڑی اداسی ہوتی تھی۔ مدیحہ اس وقت نو دس سال کی تھی۔ اس کی
میں نہیں آتا تھا کہ اتنی شاندار باجی کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔

تب مدیحہ کو پہلی بار محبت کا پتہ چلا تھا۔ اس کے بہن بھائیوں اور خالہ زاد اور
زاد بہن بھائیوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ اسے سن کر ہی
ان کے معاملات کی آگہی ہوئی تھی۔ کوئی نعیم بھائی تھے' جنہیں مدیحہ نے دیکھا بھی نہیں
بہر حال باجی کو ان نعیم بھائی سے محبت ہو گئی تھی۔

مدیحہ کے بہن بھائی اور کزنز' سب ان دونوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ "باجی' کا دماغ
گیا ہے۔ محبت بھی کی تو کس سے۔" ایک کہتا۔

"پاپا کہتے ہیں' ان کے دماغ میں خلل ہے۔" کوئی Quote کرتا۔

"یار ذرا ان نعیم بھائی کو دیکھو تو۔ ہنہ نعیم.... بھائی۔"

"ارے بھائی.... سائیکل بھی نہیں ہے ان کے پاس۔"

"اور رہتے کہاں ہیں.... ٹی اینڈ ٹی کالونی کے سرکاری کوارٹر میں۔"

"صورت شکل میں بھی زیرو ہیں۔ باجی حور ہیں تو وہ لنگور ہیں۔ پتا نہیں' باجی نے
دیکھا ان میں۔"

چار سال گزر گئے تو مدیحہ بھی ان محفلوں میں شریک ہونے لگی لیکن سامع کی حیثیت
سے۔ وہ اس معاملے میں کبھی بولی نہیں۔ اس نے تو نعیم بھائی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ البتہ
سن کر اس کی معلومات خوب ہو گئی تھیں اور باجی اب بھی اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ
ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر باجی کو کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ باجی اور نعیم بھائی کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ یوں محبت ہو گئی تھی
لیکن نعیم بھائی ایک سرکاری ملازم کے بیٹے تھے۔ اسٹیٹس کا فرق بہت بڑا تھا۔ خالہ جان نے
انکار کر دیا کہ یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی اور باجی نے اعلان کر دیا کہ وہ نعیم بھائی کے سوا کسی سے
شادی نہیں کریں گی۔

"تو تم گھر سے بھاگ کر شادی کرو گی؟" خالہ جان نے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

"جی نہیں۔ میری شادی ہوئی تو آپ سب کی مرضی سے ہو گی اور میں اس گھر سے ہی
وداع ہوں گی۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں۔ تو تم چھپ چھپ کر اس سے ملتی رہو گی۔"

"میں ان سے کبھی نہیں ملوں گی' یہ میرا وعدہ ہے۔"

"اور ہم تمہاری شادی کرنا چاہیں...."

"میں نے کہا نا' نعیم کے سوا میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

چار سال ہو گئے۔ اس دوران میں باجی نعیم بھائی سے کبھی نہیں ملیں۔ انہوں نے خود کو
پڑھائی میں غرق کر لیا۔ ایک ایم اے وہ کر چکی تھیں۔ دوسرا کر رہی تھیں۔ کلاس کے علاوہ
ان کا سب سے زیادہ وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔

پھر ایک دن باجی نے فون کیا۔ "مدیحہ.... تم فوراً ہمارے گھر آ جاؤ۔"

مدیحہ خوش ہو گئی۔ باجی سے قریب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ چلی گئی۔ "مجھے ایک کام
ہے تم سے۔" باجی نے اس سے کہا۔ "ایک تم ہی مجھے ہمدرد لگتی ہو۔ باقی سب تو مذاق اڑانے
والے ہیں۔ اور تم بولتی کم ہو' راز رکھ سکتی ہو۔"

"جی باجی' میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" مدیحہ کا دل دھڑکنے لگا۔ کوئی راز اس پر
کھلنے والا تھا۔ تجسس سے اس کا برا حال تھا۔

"نعیم نے مجھے بلایا ہے۔" باجی نے بتایا۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔"

مدیحہ اس وقت چودہ سال کی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا۔ "لیکن کیوں باجی' آپ کو اکیلے
جانا چاہیے۔"

"میں زیادہ جانتی ہوں یا تم۔" باجی نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر نرم لہجے میں بولیں "میں
نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ نعیم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ مگر اب نعیم نے ایسی قسم دی ہے کہ

میں ٹال نہیں سکتی۔ تمہیں ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ تاکہ تم گواہ رہو۔ ضرورت وہ سب بتا سکو' جو سنا ہو۔ مگر بلا ضرورت کبھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔"

"ٹھیک ہے باجی!"

وہ باجی کے ساتھ گئی۔ ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات طے تھی۔ وہاں اس نے پہلی بھائی کو دیکھا اور حیران ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ وہ شکل صورت میں زیرو ہیں اسے تو وہ بہت اچھے لگے۔ شاید اس لئے کہ وہ بدترین توقعات لے کر گئی تھی۔

اور جب نعیم بھائی بولے تو وہ اسے بہت ہی خوب صورت لگے۔ ان کی آواز اور خوبصورت تھا۔ وہ نرم میٹھی گفتگو کرتے تھے۔ باجی نے اسے ان سے متعارف کر بولے۔ "تم نے انہیں زحمت کیوں دی سمعیہ؟"

"یہ ضروری تھا۔ تم نے قسم ایسی دی تھی۔ ورنہ میں کبھی نہ آتی۔ میں نے می کیا تھا اس کا۔"

"لیکن...."

باجی نے ان کی بات کاٹ دی۔ "جو گفتگو ہوگی' مدیحہ کے سامنے ہوگی اور شاید کوئی بات بھی نہیں کرنی' جو اس کے سامنے نہ کی جا سکے۔"

"اتنے یقین سے نہ کہو۔"

"تو پھر وہ بات بھی اس کے سامنے ہی ہوگی۔"

نعیم بھائی نے اپنے اور باجی کے لئے کافی اور اس کے لئے آئس کریم منگوائی۔ شروع ہوئی۔ "اب میں اور برداشت نہیں کر سکتا سمعیہ۔" نعیم بھائی نے کہا۔

"مگر کرنا پڑے گا۔ اور کچھ ممکن بھی تو نہیں۔" باجی بولیں۔

"اب نہیں ہو سکتا۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

"خدا نہ کرے۔" باجی نے تڑپ کر کہا اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا کریں۔ بتائیں' میں کیا کر سکتی ہوں۔" ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"مجھ سے شادی کر لو...."

"اس سے میں نے کب انکار کیا ہے؟" باجی کے لہجے میں شوخی آ گئی۔ "اس سے می بھی نہیں کروا سکیں۔"

"تم عاقل و بالغ ہو۔ خود مختار ہو۔ قانون بھی ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے اور شرع بھی۔ میرے ساتھ چلو...."

"یہ ناممکن ہے نعیم! میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں۔ میری می اور پاپا کو رضامند کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"اور وہ رضامند کبھی نہیں ہوں گے۔" نعیم بھائی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اب یہ ہماری قسمت۔" باجی نے سرد آہ بھری۔

"قسمت کو الزام مت دو۔ جب آدمی کچھ کر سکتا ہو اور نہ کرے تو یہ قسمت نہیں۔ تمہارے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں۔ مجھ سے بڑا تو تمہارا وہ وعدہ ہے' جو تم نے اپنی می سے کیا ہے ورنہ میں تم سے کسی غلط کام کو نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"دیکھو نعیم! اپنی نہیں' گھر والوں کی نہیں۔ لیکن محبت کی عزت اور حرمت مجھے بہت عزیز ہے۔" باجی نے سرد اٹل لہجے میں کہا۔ "اور تمہاری اذیت کا مجھے اندازہ ہے۔ کیونکہ کم از کم اتنی اذیت تو میں بھی سہہ رہی ہوں۔"

"تو تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟" نعیم بھائی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اس انداز میں نہیں۔ میرے گھر والوں سے رشتہ مانگنا' اس سے منظوری حاصل کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

یوں وہ ملاقات بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ لیکن نہیں۔ شاید یہ اسی ملاقات کا نتیجہ تھا کہ اب ... چار سال بعد نعیم بھائی کے گھر والے رشتہ لے کر آئے تھے.... اور خالہ جان نے ہاں کر دی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اب نعیم بھائی کا کنسٹرکشن کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بہت بڑے بنگلے میں وہ رہتے تھے۔ اور شکل و صوت کے اعتبار سے انہیں زیرو کہنے والے اب انہیں وجیہہ' خوب رو اور ہینڈسم قرار دے رہے تھے۔

رشتہ ہونے کے بعد مدیحہ نے باجی کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ تو کوئی حور لگ رہی تھیں' جو آسمان سے اتر آئی ہو۔ وقت کے جتنے تاریک سائے ان کے چہرے پر تھے' سب ڈھل گئے تھے اور وہ کسی نوخیز کلی کی طرح نکھری نکھری لگ رہی تھیں۔

اب مدیحہ خود ایک تجربے سے گزر رہی تھی۔ اس لئے اسے بہت تجسس تھا۔ "باجی! اس حسن کا راز؟" اس نے سرگوشی میں باجی سے پوچھا۔

"خوشی.... سچی خوشی۔ محبت کی خوشی!"

"محبت تو آپ پہلے بھی کرتی تھیں۔ پھر ناخوش کیوں رہتی تھیں؟" مدیحہ نے اٹھایا۔

"ملنے کی خوشی' نہ ملنے کا غم۔" باجی گنگنائیں۔

"تو محبت میں ملنا اتنا اہم ہوتا ہے؟" مدیحہ نے پوچھا اور دل میں سوچا کہ یہ تو ا سوچا اور سمجھا ہی نہیں تھا۔

"پگلی کہیں کی۔" باجی نے محبت سے اسے جھڑکا۔ "ملنا تو حاصل محبت ہے۔ ورنہ ا کچھ رائیگاں ہے۔"

وہ ایک کنکر تھا' جو نامعلوم گہرائی والی پرسکون جھیل کے بیچوں بیچ گرا!

فطرت ہے کہ آدمی اپنے تجربے میں دوسروں کے تجربوں اور ان کے اخذ کردہ بھی شامل کرلیتا ہے۔ یہی مدیحہ کے ساتھ ہوا۔ اس کے سوچنے کے انداز میں بے حد رفتار تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی۔ اور اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ جو اس نے دیکھا تھا' وہ مستند تجربہ بھی تھا اور مشاہدہ بھی۔ اس نے باجی کو مرجھایا ہوا دیکھا تھا۔ وہ جان گئی تھی و فراق آدمی کو کملا دیتا ہے۔ اور اب اس نے باجی کو نودمیدہ کلی کی طرح تروتازہ دیکھ یعنی وصل سے تازگی اور حسن ہے۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کے دل میں طلب جاگی ہے۔ ہاں' وہ ان خطوط پر سوچتی رہ باجی کی شادی ہوگئی اور وہ نعیم بھائی کے گھر چلی گئیں۔ اس روز باجی پر جو حسن اترا مدیحہ کے دل پر ہمیشہ کے لئے نقش ہوگیا۔

اب مدیحہ میں جو تبدیلی آئی' وہ ایسی نہیں تھی' جسے وہ آسانی سے محسوس کرلیتی۔ کی محفل اب بھی وہی تھی۔ وہ اب بھی حمید احمد کے بارے میں سوچتی تھی۔ مگر انداز ب تھا۔ پہلے کی بے طلب' معصوم محبت دودھ کی نہر کی طرح تھی۔ اب اس نے اس میں کے لیموں کے دو قطرے ٹپکا دیئے تھے۔ وہ دو قطرے پوری نہر کے دودھ کو پھاڑ طاقت رکھتے تھے۔ مگر یک لخت نہیں' بتدریج۔ اس لئے فوری طور پر اسے احسا ہوسکا۔

اس کے اخذ کردہ نئے حوالے اس کی سوچوں پر چھا گئے تھے۔ وہ حمید احمد کے بار

سوچتی' ان کا تصور کرتی تو نجانے کیسے وہ دلہا بنے نظر آنے لگتے۔ اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ ن کے چہرے کے خطوط میں نعیم بھائی کے خدوخال بھی گھل مل رہے ہیں۔ پہلے وہ اپنے ارے میں سوچتی ہی نہیں تھی۔ بلکہ وہ حمید احمد کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے تصور میں ان کے چہرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر اب سوچتے سوچتے اسے دلہن بنی ابی کا چہرہ نظر آتا۔ چند لمحے اسے وارفتگی سے دیکھنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی وتی۔ اپنے عکس کو دیکھتے دیکھتے وہ تصور میں اسے دلہن بنانا شروع کردیتی۔ "میں دلہن بن کر سی لگوں گی؟" ایک دن اس نے سوچا۔

تیسرے دن اس سوالیہ بیان میں ایک وضاحت کا گوٹہ لگ گیا.... حمید احمد کی دلہن!

پھر وہ تصور میں حمید احمد کو دلہا بنے دیکھنے کی کوشش کرتی۔ کوشش یوں کہ کبھی وہ میاب ہوتی تو کبھی ناکام۔ اور اس بات کا احساس اسے ہو ہی نہیں سکا کہ دلہا کے روپ میں وہ حمید احمد کا چہرہ دیکھتی ہے' وہ پوری طرح ان کا چہرہ نہیں۔ اس میں نعیم بھائی کے چہرے جھلکیاں چھپی ہوتی ہیں۔

اسے پتہ بھی نہ چلا کہ اس طلب کی اسی ہوا میں اس کے تصور پر چھائے ہوئے حمید احمد کے چہرے کے نقوش لحہ بہ لحہ دھندلاتے جارہے ہیں۔

اس روز اسے بہت بڑا شاک لگا' جب اس نے تصور میں حمید احمد کو دیکھنا چاہا اور اسے ساس ہوا کہ وہ نعیم بھائی کو دلہا بنے دیکھ رہی ہے۔ اس نے تصور کی سلیٹ سے وہ چہرہ ہٹایا ر پھر کوشش کی۔ پھر وہی نتیجہ۔ اور بار بار کی کوشش کے بعد آخر میں یہ ہوا کہ تصور کی لیٹ سادہ رہ گئی۔ اس پر کوئی نقش بھی نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتی رہی۔ لیکن تصور میں حمید مد کو نہ دیکھ سکی۔

"یہ کیا ہوا؟" اس نے ہراساں ہو کر خود سے پوچھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چہرہ بھول اؤں۔ وہ نقوش' وہ خدوخال کہاں چھپ گئے۔

و زیاں کا اتنا بڑا احساس تھا کہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جنت ملنے کے عد اس سے چھین لی گئی ہے۔ وہ اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا بس نہیں چل ہا تھا۔ زیاں اور بے بسی کے اس احساس نے اسے سونے بھی نہیں دیا۔

اگلے روز وہ بے تابی سے سوکس کے پیریڈ کا انتظار کرتی رہی۔ اور حمید احمد کے آتے ہی

اس نے اپنی پیاسی نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے والہانہ نظرو
انہیں تکنے لگی وہ ان کے چہرے کے ایک ایک نقش کو تصور میں تازہ کر رہی تھی۔ تھو
بعد اس نے نظریں جھکائیں اور انہیں تصور میں دیکھنا چاہا۔ لیکن تصور کا ورق سادہ ہی ر
پر کوئی نقش نہ ابھرا۔

اس روز گھر میں وہ اور زیادہ بے چین رہی۔ تصور کا سادہ ورق اسے جھنجلاہٹ م
رہا تھا۔ یہ میرے تصور کو کیا ہو گیا؟ یہ کوئی سزا ہے؟ یہاں تک اس نے ضرور سوچا
سے آگے نہ سوچ سکی۔ سزا.... کس بات کی.... یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے گھبرا کر پھر طلب کے دامن میں پناہ لی۔ اس نے خود کو دلہن کے روپ
دیکھا۔ 'میں دلہن بن کر بہت اچھی لگوں گی۔ اس نے خود کلامی کی۔ پھر اضافہ کیا۔ 'ح
کی دلہن۔'

اس بار یہ خیال پوری طرح اس کے شعور تک پہنچ گیا۔ اوہ.... تو یہ ممکن ہے
نہیں۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔ اور حمید احمد کے ساتھ کیسی گزرے گی؟ بہت اچھی...
زمین پر کسی کو جنت مل جائے۔ خوشیاں ہی خوشیاں.... سچی اور بے حساب۔

طلب کی وہ سوچ اسے اتنی خوب صورت، اتنی اچھی لگی کہ وہ اس سے کھیلتی رہی۔
جھنجلاہٹ ہوا ہو گئی۔

اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ طلب کے مزاج میں کتنی زیادہ توسیع پسند
ہے۔ وہ ایک ہشت پا کی طرح ہوتی ہے۔ وہ تصور سے ابتدا کرتی ہے مگر رکتی نہیں۔
طرف دوڑتی ہے اور سب کچھ مل جانے پر بھی نہ رکتی ہے، نہ مطمئن ہوتی ہے۔ اس
نفس کی اولاد ہوتی ہے۔

اس وقت مدیحہ کو نہیں معلوم تھا کہ دودھ کی نہر میں دودھ پھٹنا شروع ہو گیا تھا
کے لیموں کے دو قطروں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

☆

اس بار حمید احمد کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کا یہ اندازہ بالکل درست ہے۔ مدیحہ حامد بے حد
تلون مزاج لڑکی ہے!

کچھ عرصہ سکون سے گزرا تھا.... اتنے سکون سے کہ وہ انہیں سب سے زیادہ اچھی
لگنے لگی تھی۔ مگر اس روز لیکچر دیتے ہوئے ان کی نظر اتفاقاً مدیحہ کی طرف اٹھی تو پھر
ہی منظر تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے والہانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

پہلے تو انہوں نے سوچا کہ یہ اتفاق ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ لیکچر کے
دوران میں لیکچرار ہی اپنے سامعین کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ مگر لیکچرار کی نظر کسی پر
کے تو اس کی نظریں جھک جاتی ہیں یا ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سوچ کر انہوں نے مدیحہ
کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

ثانیے دبے پاؤں گزرنے لگے۔ لیکن مدیحہ کی پلکیں بھی نہیں جھپکیں۔ وہ انہیں دیکھتی
ہی اور اب پہلے کی طرح اس کی نگاہوں میں خالی پن بھی نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ انہیں
ر پار دیکھ رہی ہو۔ انہیں چہرے پر تمازت کا احساس ہو رہا تھا۔ جلد کے نیچے جیسے چیونٹیاں
ں رینگ رہی تھیں۔ وہ انہیں صرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ انہیں لگا کہ وہ نگاہوں سے انہیں
وم رہی ہے۔

انہوں نے سوچا یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اور اب کے اس کی سنگینی اور شدت بہت
ڑھی ہوئی تھی۔ وہ بھولنے لگے کہ کیا کہہ رہے تھے۔ بات کا تسلسل اور ربط قائم رکھنے کے
لئے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے جلدی سے نظریں ہٹا لیں۔

اس کلاس کے بعد انہیں دو گھنٹے کی فرصت تھی۔ وہ سٹاف روم میں چلے گئے۔ وہاں ان
کے سوا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے چپراسی کو چائے لانے کی ہدایت کی۔ چائے آئی تو وہ اس
کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ ایسے میں خود کو خالی الذہن کر کے وہ اپنی ذہنی تھکن

دور کر رہے تھے۔

مگر اس روز وہ خالی الذہن نہیں رہے۔ انہیں خاصی دیر بعد احساس ہوا کہ وہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ تصور میں اسے دیکھ کر الجھ رہے ہیں۔ اطمینان کی تھی کہ وہ کوئی پرسنل انداز نہیں تھا۔ وہ بس یہ سوچ رہے تھے کہ اس لڑکی کو یقیناً ان پہلے نہیں دیکھا۔ مگر اس سے مشابہ کسی ہستی کو وہ دیکھتے رہے ہیں۔ اب اس لڑکی کو دی کے ذہن میں کوئی بھولی بسری یاد کلبلاتی ہے۔

لیکن انہیں یاد کچھ نہیں آتا تھا۔ ایسا لگتا کہ کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کوئی با ہے اور معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔ بعض مشابہتیں ا اتنی دور کی ہوتی ہیں کہ انہیں تلاش کرنا کاغذوں کے ڈھیر میں ایک ایسی چیز کی تلاش کے مترادف ہوتا ہے، جس پر بس ایک حرف لکھا ہو۔ وہ پورے چہرے کی مشابہ ہوتی۔ کسی ایک نقش، کسی ایک خط کی ہوتی ہے۔

وہ سوچتے اور یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوا مشابہت تلاش کرنے کا شغل ختم ہوا اور کب وہ اس چہرے کی خوب صورتی اور سراہنے لگے۔ وہ اس وقت چونکے، جب اسٹاف روم دوسرے لیکچررز کی آوازوں سے انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ان کی اگلی کلاس کا وقت ہو گیا تھا۔

☆

وہ حمید احمد کو بہت غور سے دیکھتی۔ تاکہ ان کا چہرہ تصور میں محفوظ ہو جائے۔ ل ہی وہ آنکھیں بند کرتی، تصور کی سلیٹ سادہ رہ جاتی۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ کیونکہ عرصہ پہلے حمید احمد کا چہرہ یاد کرنے، دیکھنے کے لئے اسے کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی چہرہ تو ہر وقت نگاہوں میں رہتا تھا۔ پھر اب کیا ہو گیا؟ اب یہ چہرہ دیکھنے پر بھی یاد نہیں کیوں؟

اس سوال پر سوچنے کے لئے اس کے پاس فرصت نہیں تھی۔ طلب کی آگ ا چین رکھتی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ مگر کوئی بے چینی تھی اس نے سوچا۔ "جو سامنے حقیقت میں موجود ہو۔" اسے تصور میں دیکھنے کی کو حماقت ہی ہے نا۔ لیکن حمید احمد اس کے روبرو صرف کلاس میں ہی ہوتے تھے۔ اس

نہیں۔ تو بعد میں تو تصور ہی میں دیکھنا ممکن تھا۔ لیکن یہ چہرہ تو آنکھوں کے راستے دل میں اتر لیا تھا۔ محفوظ ہو گیا تھا۔ پھر اب کیا ہو گیا۔ وہ سوچتی اور الجھتی۔

تصور اسے اپنے کمرے کی پرسکون تنہائی میں بہت پریشان کرتا تھا۔ وہ اب صاف شفاف نہیں رہا تھا۔ دھندلاہٹ بہت بڑھ جاتی تھی۔ اتنی کہ ان کا چہرہ صاف اور واضح طور پر نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہاں، وہ اپنا تصور کرتی تو خود کو دلہن کے روپ میں بالکل صاف دیکھتی۔ کیا بت کا محور و مرکز بدل گیا ہے؟ ایک روز اُس نے سوچا۔ کیا حمید احمد کی بجائے میں خود سے بت کر رہی ہوں؟ بہت سوچنے پر بھی اس سوال کا جواب اسے نہ مل سکا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ میں تو حمید احمد سے محبت کرتی ہوں۔ ان کی دلہن بننا چاہتی ہوں۔

اس روز سوکس کا ماہانہ ٹیسٹ ہو رہا تھا مگر مدیحہ کسی اور ہی عالم میں تھی۔ اسے سوال بھی علوم نہیں تھے۔ وہ تو بس حمید احمد کے چہرے کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ اس کے وران کے درمیان محبت اور ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ اس پر اسے کوئی بھولی بسری یاد آئی۔ اس نے نظریں جھکائیں۔ اس کا قلم نوٹ بک پر چلنے لگا۔

نسرین نے لکھتے لکھتے غیر ارادی طور پر برابر میں بیٹھی ہوئی مدیحہ کو دیکھا۔ پھر اس کی نظر ریحہ کے ہاتھ پر پڑی۔ اس میں موجود قلم کاغذ پر حرکت کر رہا تھا۔ مگر کاغذ پر جو نظر آ رہا تھا" اس نے نسرین کو مبہوت کر دیا۔ وہ کاغذ پر نظریں جمائے اسے دیکھتی رہی، جیسے اسے ہن نشین کر رہی ہو۔ حالانکہ یاد کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مدیحہ نے دو نام لکھے تھے.... ور وہ بھی حروف توڑ کر۔ پھر اس نے دونوں ناموں کے مشترکہ حروف کاٹ دیئے تھے۔

ح م ی د ا ح م د   م د ی ح ہ ح ا م د

نسرین نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں اور اپنی کاپی پر جھک گئی۔ یہ ماہانہ ٹیسٹ کتنے مشکل ہوتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹے میں دو سوالوں کے جواب دینا۔

ادھر مدیحہ حیرت سے سوچ رہی تھی۔ یہ کیا ہوا۔ ان کے نام میں تو ایک حرف بھی نہیں بچا۔ سارے کٹ گئے۔ اور میرے نام میں صرف ایک حرف بچا۔ ایک حرف.... یعنی LOVE یہ تو بالکل درست ہے.... سچ ہے۔ I LOVE HIM مگر یہ کچھ نہ بچنے ا..... پورا نام کٹ جانے کا کیا مطلب ہے۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔

وہ کوشش کرتی رہی۔ مگر کچھ سمجھ نہیں پائی۔ اس وقت اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سوال

برسوں اسے ستائے گا۔

اسی لمحے حمید احمد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "اب اپنے اپنے پرچے مجھے دے دیں بند کردیں۔"

مدیحہ نے دیکھا۔ وہ اسی طرف آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے کاپی کے درمیا سے جڑے ہوئے دو ورق نکال کر علیحدہ کئے' پہلے صفحے پر اپنا نام، کلاس اور رول نمبر لکھ وقت تک حمید احمد پرچے جمع کرتے ہوئے اس تک آپہنچے۔ اس نے پرچا انہیں تھمادیا۔

☆

وہ دونوں لان میں بیٹھی تھیں۔ مدیحہ بے دھیانی میں گھاس کی پتیوں کو نوچ رہی نسرین اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر نسرین نے

"سوکس کے ٹیسٹ کے دوران میں تم کیا کر رہی تھیں؟"

"کیا کر رہی تھی؟" مدیحہ نے خالی الذہنی کے عالم میں دہرایا۔ پھر وہ بولی۔ " جواب لکھ رہی تھی۔"

"تمہیں یاد ہے کہ تم نے جواب لکھا تھا۔"

"ظاہر ہے' ٹیسٹ کے دوران میں اور کیا کروں گی میں۔" مدیحہ نے جھنجلا کر کہا۔

"خوب یاد کر کے بتاؤ۔ پرچہ کیا تھا نا تم نے؟"

مدیحہ بھنا گئی۔ "تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا تھا تو تم کچھ اور کر رہی تھیں۔" نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیا کر رہی تھی میں؟"

"دو نام لکھ کر ان کے مشترکہ حروف کاٹ رہی تھیں۔"

مدیحہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "ارے وہ.... ہاں .... میں ان کے اور اپنے ریلیشن شپ چیک کر رہی تھی۔"

"اپنے اور کس کے درمیان؟"

مدیحہ پھر جھنجلا گئی۔ "اپنے اور حمید صاحب کے درمیان اور کسی سے مجھے اتنی دلچ ہے؟"

"کیسے؟ میں سمجھی نہیں۔"

"بھول گئیں۔ ہم کیسے چیک کرتے تھے کہ کس سے کیسا تعلق رہے گا۔"

نسرین کو یاد تھا۔ لیکن اس نے کہا۔ "یاد نہیں۔ تم یاد دلاؤ ذرا۔"

مدیحہ نے بڑے جوش و خروش سے کاپی کھولی' قلم کھولا اور پھر دو نام لکھے.... م د ی ح ہ ام د۔ ن س ر ی ن ص ب و ر۔ "اب ان میں مشترک حروف کاٹتے ہیں۔" اس نے کہا۔ اور یہاں صرف "ی" مشترک ہے۔ باقی رہ جانے والے حروف کو ہم اس طرح گنیں گے ... HATE, LIKE, LOVE اور ADORE پھر دوبارہ LOVE.... تو یہ یکھو۔ میرے نام کے آخری حرف پر بھی ADORE آیا اور تمہارے نام کے آخری ف پر بھی ADORE آیا۔ یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کو ADOER کرتے ہیں۔"

"ہاں.... یاد آگیا مجھے۔" نسرین نے کہا۔ "تو تم اپنی اور حمید صاحب کی ریلیشن شپ ک کر رہی تھیں۔ ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔"

مدیحہ کاپی میں وہ صفحہ تلاش کرتی رہی۔ وہ نہیں ملا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ کر کے ھاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"دوبارہ کی بچی۔" وہ تم نے پرچہ سمجھ کر حمید صاحب کو تو نہیں دے دیا؟"

"اومائی گاڈ۔" مدیحہ دہل گئی۔ مگر چند لمحوں میں سنبھل گئی۔ "ایسا ہو گیا ہے تو اب کچھ کیا ی نہیں جاسکتا۔ دیکھا جائے گا۔ تم یہ دیکھو۔"

اس نے حمید احمد کا اور اپنا نام لکھا اور مشترکہ حروف کاٹنے لگی۔

"یہ کیا؟ حمید صاحب کے نام کے تو سب حروف کٹ گئے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" رین نے پوچھا۔

"یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ بہر حال میں ان سے LOVE کرتی ہوں۔ اور کچھ نہ بچے پر سوچنا پڑے گا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

"یہ تو کھیل ہے پگلی' اسے اتنی اہمیت نہ دو۔" نسرین نے کہا۔

"یہ کھیل نہیں۔ ہمیشہ درست ثابت ہوا ہے۔"

"محض اتفاقاً۔"

"میں تو اسے سچ مانتی ہوں۔"

نسرین چند لمحے اسے بغور دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''ایک بات کہوں مدیحہ۔ تم بہت گئی ہو۔''

مدیحہ نے چونک کر اسے دیکھا ''کیسے ؟''

''ابھی کچھ دن پہلے تم بہت .... بہت اچھی ہو گئی تھیں۔ مگر اب پھر پہلے جیسی ہو۔''

''کیسے ؟'' مدیحہ نے اپنا سوال دہرایا۔

''اب یہی دیکھو۔ تم نے گھاس کی پتیاں نوچ نوچ کر ڈھیر لگا دیا اور تم میں چڑچڑاپن ہو گیا ہے اور تم بہت زیادہ جھنجلانے لگی ہو۔''

''ہاں۔ شاید میں بدل گئی ہوں۔ مگر اس پر میرا اختیار کب ہے۔''

''اچھا۔ یہ تو بتاؤ۔ تمہیں یہ لو' لائیک' ہیٹ کھیلنے کی کیا سوجھی ؟''

''یہ کھیل نہیں ہے۔'' مدیحہ نے زور دے کر کہا۔ ''اور میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کریں گے یا نہیں۔''

نسرین اچھل پڑی۔ ''کون.... ؟ سر حمید ؟ تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟''

''فرق کیوں نہیں پڑتا۔ محبت دو طرفہ ہو تو شادی کامیاب رہتی ہے۔'' مدیحہ نے نہایت سادگی سے کہا۔

نسرین بھونچکی رہ گئی۔ ''یہ شادی کہاں سے آ ٹپکی ؟ تم سر حمید سے شادی کرو گی ؟''

''محبت کی ہے تو شادی بھی کروں گی۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو مدیحہ۔ تمہیں اس انداز میں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔''

''کیوں نہیں سوچنا چاہئے۔ ملنا ہی تو حاصلِ محبت ہے۔ ورنہ تو سب کچھ رائیگاں ہے؟'' مدیحہ کا لہجہ خواب ناک ہو گیا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے مدیحہ۔'' نسرین پریشان ہو گئی۔ ''پچھلی بار میں نے تمہاری ع... کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ سوچا بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ مجھے کوئی بہت آسمانی چیز لگی تھی۔ مگر اب.... خدا کے لئے خود کو تماشا نہ بناؤ۔ بہت رسوائی ہو گی۔''

مدیحہ چند لمحے سوچتی رہی۔ ''نسرین.... شادی کوئی بری چیز ہے ؟''

''یہ میں نے کب کہا۔ شادی تو بہت مقدس اور پاکیزہ رشتہ ہے۔''

''تو پھر.... ؟''

نسرین بہت تیزی سے سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مدیحہ اب اس مرحلے میں ہے' جہاں کسی کو سمجھانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اتنے سے دنوں میں وہ اتنا بدل گئی' اتنا آگے چلی گئی۔ پچھلی بار اس نے مدیحہ کی محبت کا جو روپ دیکھا تھا' وہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ایسی محبت کوئی بھی شاگرد اپنے استاد سے کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسا ہوتا رہا ہے۔ لیکن شادی.... ! کتنا پیچیدہ معاملہ ہے یہ۔ اب اسے کیسے سمجھائے۔ روکنا تو مسئلہ نہیں ہے۔ وقت خود روک دے گا.... مگر رسوائی کے ساتھ اور وہ سہیلی ہے مدیحہ کی۔ وہ کب چاہے گی کہ اس کے ساتھ ایسا ہو۔ تو پھر.... ؟

اچانک اسے ایک خیال سوجھ گیا۔ ''یہ بات اتنی آسان نہیں مدیحہ۔'' اس نے کہا ''سر حمید ایک پختہ مرد ہیں' کوئی لڑکے نہیں....''

''مجھے لڑکے اچھے بھی نہیں لگتے۔'' مدیحہ نے جلدی سے کہا۔

''مجھے بات پوری کرنے دو۔'' نسرین جھنجلا گئی۔ ''تمہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ بلکہ یقیناً ان کے بچے بھی ہوں گے۔''

مدیحہ دہل گئی۔ واقعی.... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ہاں.... یہ تو یقینی ہے۔ وہ یاس میں ڈوبنے لگی۔ مگر فوراً ہی امید کا ایک تنکا اسے مل گیا۔ ''تو کیا ہوا؟ وہ دوسری شادی بھی کر سکتے ہیں۔ مرد تو چار شادیاں کر سکتے ہیں۔''

نسرین نے بڑی مشکل سے اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس کی سہیلی ایک وقتی پاگل پن میں مبتلا ہے۔ یعنی اسے ایک پاگل کو سمجھانا اور اس کے پاگل پن کو دور کرنا ہے۔ ''تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس طرح تم ایک عورت کو محرومی میں مبتلا کرو گی' اس کا حق چھینو گی اور یاد رکھو چھیننے والا کبھی خوش نہیں رہتا۔ خواہ اس کے پاس سب کچھ موجود ہو۔ تم معصوم بچوں سے ان کا باپ چھین لو گی ؟''

''ایسا کیوں ہو گا؟'' مدیحہ نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''آدمی سب کے حقوق ادا کر سکتا ہے۔''

''یہ بس کہنے کی بات ہے۔ آدمی تقسیم ہو کر نہیں چلتا۔ کسی کو کم عمر' خوب صورت بیوی مل جائے تو وہ برسوں کی مضمحل ساتھی کو کیوں یاد کرے' کیوں اس کا خیال رکھے۔''

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"یہ تم اب کہہ سکتی ہو۔ اس وقت تمہیں رقابت ستائے گی۔ تم خود بھی انہیں نہیں جانے دو گی۔ اور ان کے بیوی بچوں کی محرومی کی بازپرس تم ہی سے ہو گی۔"

مدیحہ کے جسم میں جھرجھری سی آئی۔ "ہم مفروضوں پر بات کر رہے ہیں۔ چھوڑو بات کو۔"

نسرین مطمئن ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ دراصل مدیحہ اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب وہ سوچے گی اور یقیناً اپنی اصلاح کرے گی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی' جو گھاس کی ٹوٹی ہوئی پتیوں کے ڈھیر کر بڑی نرمی اور محبت سے سہلا رہی تھی۔

یہ لڑکی کبھی کسی کو تکلیف تو پہنچا ہی نہیں سکتی۔ نسرین نے بے حد طمانیت سے سوچا۔

☆

حمید احمد سیکنڈ ائر کے ٹیسٹ کے پرچے چیک کر رہے تھے!

وہ سب کاپی سے جوڑ کے مقام سے نکالے گئے دو جڑے ہوئے ورق تھے.... یعنی صفحے۔ کسی کسی سٹوڈنٹ نے بہت تفصیلی جواب لکھے تھے۔ انہوں نے ایسے دو سیٹ بنا دیئے تھے اور انہیں پن سے جوڑ دیا تھا۔

وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ یہ کلاس بہت اچھی جا رہی تھی۔ وہ آدھے سے زیادہ پرچے چیک کر چکے تھے۔ اور اب تک سبھی سٹوڈنٹس نے بہت اچھے مارکس لئے تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ سالانہ امتحان میں ان کی کلاس کا رزلٹ بہت اچھا ہو گا۔

اچانک ان کے ہاتھ میں مدیحہ حامد کا پرچا آ گیا۔ سامنے والے صفحے پر بالائی حاشیے کے اس کا نام، کلاس اور سیکشن اور اس کا رول نمبر لکھا تھا۔ تحریر بہت خوب صورت تھی۔ حروف خوش نما اور متوازن تھے۔ لیکن اس کے علاوہ پورا صفحہ سادہ تھا۔

ایسا تمام سٹوڈنٹس نے نہیں کیا تھا۔ نام، کلاس اور رول نمبر سبھی نے بالائی حاشیے کے لکھے تھے۔ لیکن اسی صفحے پر پرچا حل کرنا شروع کیا تھا۔ اب تک مدیحہ کا پرچا پہلا تھا جس سامنے کا صفحہ سادہ تھا۔

انہوں نے ورق اُلٹا۔ ملے ہوئے دو صفحے سامنے تھے۔ وہ حیران رہ گئے۔ ان ج

صفحوں میں بائیں جانب والا صفحہ بالکل سادہ تھا۔ داہنی جانب والے صفحے پر کچھ لکھ کر کاٹا گیا تھا.... اور وہ بھی اردو میں۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ وہ انگلش میڈیم کالج تھا۔ وہاں میڈیم آف اسٹڈی بھی انگلش تھا اور میڈیم آف آنسر بھی انگلش تھا۔

انہوں نے اردو کی کٹی ہوئی اس عبارت کو نظرانداز کر دیا۔ انہوں نے سوچا۔ ممکن ہے جواب پچھلے صفحے پر ہو۔ ویسے بھی انہیں اس لڑکی سے کوئی اچھی امید نہیں تھی۔ حالانکہ کبھی بھی اس میں انہیں BRILLIANCE کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر مجموعی طور پر وہ انہیں ڈل لگتی تھی۔

پچھلا صفحہ دیکھا تو ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ بھی سادہ تھا۔

وہ بھنا گئے۔ انہوں نے اس پرچے کو ایک طرف رکھا اور باقی پرچے چیک کر ڈالے ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ تمام پرچے چیک کرنے کے بعد انہوں نے مدیحہ کے پرچے کو یوں ہاتھ میں لیا' جیسے تول رہے ہوں۔ وہ سامنے والے صفحے پر مارکنگ کرنے کے ارادے سے جھکے۔ زیرو کے علاوہ اسے کچھ دیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مگر وہ جھجک گئے۔ انہوں نے سوچا' تیسرے صفحے پر کچھ لکھا ہوا تو ہے۔ بے شک لکھ کر کاٹ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھ تو لیا جائے۔ ایسے ہی زیرو نمبر دینا پیشہ ورانہ آداب کے منافی تھا۔

اس لمحے اچانک ان کے اندر تجسس جاگ اٹھا۔ جہاں جواب انگلش میں دیا جانا ہو' وہاں تیسرے صفحے پر اردو میں کوئی عبارت.... اور پھر اسے کاٹ دیا جائے۔ کوئی معنی تو رکھتی ہو گی۔ نجانے کیوں تجسس کے ساتھ انہیں خوف آنے لگا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔

انہوں نے ورق الٹا اور اس عبارت کو دیکھا۔ چند لمحے تو ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ اردو کی عبارت بھی نہیں تھی۔ وہ ملے ہوئے نہیں' ٹوٹے ہوئے مفرد حروف تھے۔ اور ان میں سے بیشتر کٹے ہوئے تھے۔ بلکہ درحقیقت ایک حرف کو چھوڑ کر باقی سب کاٹ دیئے گئے تھے۔

وہ حیرت و استعجاب کے عالم میں نظریں جمائے اس ایک سطر کو دیکھتے رہے۔

حامی داح م د م دی ح ہ ح ام د

پھر انہیں احساس ہوا کہ کاٹے جانے کے باوجود حروف سمجھ میں آ رہے ہیں اور اس کے

چند لمحوں کے بعد اچانک بھید ان پر کھل گیا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ارے..... دو نام ہیں.... اور ایک ان کا اپنا نام ہے اور دوسرا مدیحہ حامد کا۔ انہیں غصہ آیا کہ اتنی سی بات ان کی سمجھ میں اتنی دیر سے آئی۔

لیکن ان کا اتنی دیر سے سمجھنا فطری تھا۔ ایک ایسا شخص جو امتحانی پرچہ چیک کر رہا ہو، تمام پرچے انگریزی زبان میں ہوں۔ تو ایسی مہمل عبارت اس کی سمجھ میں فوراً کیسے آ ہے؟ کیا لغویت ہے! انہوں نے سوچا۔ مگر تجسس انہیں غور کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ پوری طرح سمجھ گئے۔ جو حروف کاٹے گئے تھے" وہ دونوں ناموں مشترک تھے اور یہ بات انہیں دلچسپ لگی کہ ان کے نام کے تمام حروف کٹ گئے تھے۔ مدیحہ حامد کے نام میں سے ان کا نام پوری طرح کٹ جاتا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچتا تھا۔ اور ا نام نفی کرنے کے بعد مدیحہ حامد کے نام میں صرف "ہ" بچتا تھا۔

مگر اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات کیا ہے؟ ایسا کیوں کیا گیا؟ یہ کوئی جادو ہے یا ٹونا؟ سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ بس یہ بات ان کے ذہن سے چپک کر رہ گئی کہ ان کے نام مدیحہ کا نام نفی کیا جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا..... حرف بھی نہیں۔

انہوں نے اس بات کو ذہن سے جھٹکا، ورق بند کیا اور سامنے والے صفحے پر مارکنگ کر 0/20.... مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ اور کیا جائے۔ یہ جو کچھ بھی پرچہ دینے کے 'آداب شاگردی کے خلاف تھا۔ انہوں نے سوچا، اس پرچے کو پر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔ مگر ردعمل کیا ہوگا؟ پرنسپل صاحب اس لڑ EXPELL بھی کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیں اور اس کا اور مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ ان کا تماشا بن جائے گا۔ سکینڈ سے وہ بہت ڈرتے تھے۔

اچانک ایک آسان ترکیب ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے درمیان سے پھاڑ کر دو ورقوں کو الگ کر لیا۔ مدیحہ کے نام، کلاس اور رول نمبر کے پیچھے والا صفحہ سادہ تھا۔ اور نو ہوئے حروف کا کھیل آخری سادہ صفحے کی پشت پر تھا۔ انہوں نے مارکنگ والا صفحہ پر کے درمیان رکھ دیا اور دوسرے صفحے کو پھاڑنے لگے۔ لیکن کسی اندرونی طاقت نے ا

روک دیا۔ اسے پھاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ایک دلچسپ پہیلی ہے۔ فرصت میں اس پر غور کریں گے۔ اسے بوجھنے کی کوشش کریں گے۔

انہوں نے اٹھ کر اپنی دراز کھولی، جو ہمیشہ مقفل رہتی تھی۔ وہ اس میں اپنی بے حد ذاتی چیزیں رکھتے تھے۔ اس صفحے کو انہوں نے ڈیسک کی اس دراز میں رکھا اور دراز کو لاک کر دیا۔

اب وہ پرسکون تھے!

☆

اگلے روز حمید احمد سیکنڈ ائر کی کلاس میں ٹیسٹ کے پرچے واپس دے رہے تھے۔ وہ نام پکارتے۔ سٹوڈنٹ آتا تو وہ اس کا پرچا واپس کرتے اور کچھ تبصرہ کرتے.... ویل ڈن مسعود، کاظم، تھوڑی سی محنت اور کر لو۔ شاباش رابعہ، جمشید، تم نے کتاب سے ہٹ کر جواب دیا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔

پھر انہوں نے مدیحہ کا نام پکارا۔ اگلے ہی لمحے مدیحہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مدیحہ کی طرف پرچا بڑھانے کے بجائے دھیمی آواز میں کہا۔ "سادہ پرچہ دینے کی کیا ضرورت تھی مدیحہ! اس سے اچھا تھا کہ تم کچھ بھی نہ دیتیں۔ میں تمہیں ABSENT لکھ لیتا۔ زیرو سے ABSENT بہرحال بہتر ہوتا ہے۔"

مدیحہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "مجھے یاد ہے سر۔ میں نے خالی پرچا نہیں دیا تھا۔ میں نے لکھا تھا۔"

"یہ واحد پرچا ہے، جو سنگل ورق پر ہے۔"

"سر! میں نے تو کاپی سے جڑواں ورق نکالے تھے۔"

"تو تمہارے خیال میں، میں نے کوئی گڑبڑ کی ہے؟" حمید احمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "دوسرا صفحہ پھاڑ کر پھینک دیا، جس پر تمہارا جواب تھا۔ مگر یہ دیکھو۔" انہوں نے ورق دونوں طرف سے اسے دکھایا۔ "اگر تم نے کچھ لکھا ہوتا تو یہ دونوں صفحے سادہ کیوں ہوتے۔"

"میں آپ پر تو کوئی شک کر ہی نہیں سکتی سر۔ آپ میرے دوست ہیں دشمن نہیں۔" مدیحہ کے لہجے میں خلوص تھا۔ "اگر میری بات سے ایسا لگا ہو تو میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے دوسرے ورق پر لکھا ہو۔ اور کاپی سے علیحدہ کرتے وقت وہ

ورق کاپی میں رہ گیا ہے۔"

"تو کاپی میں دیکھ لو۔ وہ اب بھی مل جائے تو میں تمہیں نمبر دے دوں گا۔"

"میں نے دیکھا تھا سر۔ وہ مجھے نہیں ملا۔"

"کچھ یاد ہے' تم نے کیا لکھا تھا؟"

"جی سر۔ جواب لکھا تھا سوال کا۔" مدیحہ نے کہا۔ "میں اس کا خلاصہ سنا دیتی ہوں۔"

اور حمید احمد حیران رہ گئے۔ لڑکی نے خلاصہ ہی اتنا بھرپور سنایا تھا کہ وہ مکمل جواب کر سکتے تھے۔ جواب سننے کے بعد انہوں نے کہا۔ "سوری مدیحہ۔ اس کے باوجود میں صفحے پر تمہیں نمبر نہیں دے سکتا۔ یہ تمہاری غائب دماغی کی سزا ہے۔"

"کوئی بات نہیں سر! I DESERVED IT"

"سادہ صفحہ ہی دینا تھا تو اس پر نام بھی نہ لکھتی اپنا۔" حمید احمد نے معنی خیز لہجے میں انہوں نے پرچا مدیحہ کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کو اپنا.... اپنے وجود کا احساس دلانا بھی ضروری تھا سر۔" مدیحہ نے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پرچا لے کر واپس چلی گئی۔

☆

مدیحہ بہت ڈسٹرب تھی!

اس کے تصور میں پہلے ہی خلل پڑ چکا تھا۔ نسرین سے گفتگو کے بعد وہ اور بڑھ گیا۔ تصور میں خود کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنا یا حمید احمد کا تصور قائم کرنے کی کوشش کر اس کے تصور میں ایک ایسی عورت آجاتی' جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مظلومیت سے اسے دیکھتی اور پھر التجا بھرے لہجے میں کہتی۔ "مدیحہ.... میرا گھر نہ دیکھو.... حمید احمد کو مجھ سے مت چھینو۔"

"میں انہیں چھین کب رہی ہوں۔" مدیحہ مدافعانہ لہجے میں کہتی۔ "میں تو بس ان محبت کر رہی ہوں۔"

"لیکن یہ محبت انہیں مجھ سے چھین لے گی۔ کیونکہ تم نوخیز ہو.... جوان ہو۔"

"ہم ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں۔"

"یہ کہنا آسان ہے۔ کرنا ناممکن ہے۔ جب ایسا ہوگا تو تم مجھے برداشت نہیں کرو

میں بھی کروں گی تو مجبوراً ہی کروں گی۔ شوہر کو کوئی شیئر نہیں کرتا۔"

"یقین کریں۔ میں آپ کو اپنی بہن سمجھوں گی۔"

"عملی زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ دیکھو.... میرا تو کچھ نہیں۔ لیکن میرے بچوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔" عورت کہتی.... اور اس کے ساتھ ہی تصور میں کئی چھوٹے بڑے بچے آجاتے۔ وہ انہیں کبھی گن نہیں سکی۔ وہ بچے روتے.... گڑگڑاتے۔

"ہمارے ڈیڈی کو واپس کر دو آنٹی۔ اب وہ ہمارے پاس نہیں آتے۔ ہم سے محبت نہیں کرتے۔ ہم پر رحم کرو آنٹی۔"

وہ ان سے نظریں چرانے کے لئے سر جھٹکتی تو تصور ٹوٹ جاتا۔ اور اچانک اسے احساس ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ وہ آنسو پونچھتی اور بیٹھ کر سوچتی رہتی۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ جب مذہب نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے دی ہے تو ایک گھر میں چار بیویاں کیوں نہیں رہ سکتیں۔ یہ کیسی بات ہے۔ یہ تو مذہب سے متصادم ہے۔ اور مذہب سے متصادم ہے تو فطری تو نہیں ہوئی۔ مگر فطری نہ ہوتی تو سب لوگ یہی بات نہ کہتے۔ اب تک مختلف موقعوں پر وہ بہت سی عورتوں کے منہ سے یہ بات سن چکی ہے۔ بلکہ تایا ابا نے دوسری شادی کی تو اس نے خود تماشا دیکھا۔ کتنا فساد برپا ہوا تھا۔ تایا نے دونوں تائیوں کو الگ الگ رکھا تھا۔ اس کے باوجود بڑی تائی ہمیشہ کوشش کرتی رہیں کہ تایا دوسری بیوی کو طلاق دے دیں۔

اور جن دنوں یہ معاملہ ہوا' ممی مسلسل پاپا کو دھمکیاں دیتی رہیں.... تم بھی بھائی کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ میں بھابی جان جیسی نہیں ہوں۔ خون پی جاؤں گی تمہارا بھی.... اور اس آنے والی بدنصیب کا بھی۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔

اور پاپا گھگھیا گھگھیا کر کہتے۔ "تمہارے ہوتے ہوئے میں ایسی حماقت کیوں کرنے لگا۔ میں کوئی پاگل ہوں؟"

"پاگل تو تمہارے بھائی جان بھی نہیں ہیں۔"

"میرا پہلا تجربہ ایسا ہے کہ دوسرے تجربے کی ہمت ہی نہیں۔" پاپا نے بھنا کر کہا۔

اس پر جو ممی شروع ہوئیں تو پاپا کان دبا کر نکل لئے۔

اس نے اس وقت بھی اس پر سوچا تھا۔ اللہ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی۔ مگر

مرد دوسری بھی نہیں کر سکتا۔ آخر کیوں؟ اس نے یہ بات ممی سے ڈسکس کرنے کی کی تھی۔ مگر پٹتے پٹتے بچی تھی۔

اور اب وہ خود اسی طرح کی صورتحال سے دوچار تھی۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہ اور یہ مسئلہ اسے اس حد تک ڈسٹرب کر رہا تھا کہ اس کا تصور اس سے پوری طرح تھا۔ اور وہ تصور میں خود کو دلہن کے روپ میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس مسئلے کا حل یہی تھا کہ وہ حمید احمد سے بات کرے۔ ان سے پوچھے۔ وہ ان کے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ اسے ان سے تعارف کا مطالبہ کرنا ہوگا۔

بہر کیف ایک بڑی بات ہوئی۔ اس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ ایک بہت بڑا فیـ لیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اگر حمید احمد کے بیوی بچے ہیں تو وہ ان کے راستے میں کبھی نہیں گی۔ انہیں اپنی محبت کے بارے میں بتائے گی بھی نہیں۔ خاموشی سے ان سے محبـ رہے گی.... کئے جائے گی.... پہلے کی طرح۔ مآل سے محروم سہی۔ رائیگاں سہی۔

اچانک اسے پرچے کا خیال آ گیا!

اس نے کاپی چھان ماری تھی۔ وہ کاغذ اس میں تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ایک صفـ کر دیکھا تھا۔ تو پھر وہ کہاں گیا؟ ایک ہی امکان تھا۔ یقینی امکان۔ اس نے جو جڑواں ور سے علیحدہ کر کے سر کو دیا تھا' وہ ورق اسی کا حصہ تھا۔ کیونکہ یہ اسے پوری طرح یاد تھا نے سر کو جڑواں اوراق دیئے تھے۔ اور سر نے جب وہ دیکھا اور پڑھا ہوگا تو اسے شر سے بچانے کے لئے اس ورق کو علیحدہ کر کے تلف کر دیا ہوگا۔

ہائے.... کیا سوچا ہوگا سر نے.... کیا سمجھا ہوگا؟ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی چلو اچھا ہی ہوا۔ اس طرح میری بات تو ان تک پہنچی۔ وہ سمجھ تو گئے ہوں گے۔ اس طمانیت سے سوچا۔

اور اس معاملے میں ایک حوصلہ افزا پہلو بھی تھا۔ سر نے وہ صفحہ تلف کیا شرمندگی سے بچانے کے لئے۔ تو ان کے دل میں اس کے لئے کوئی نرم گوشہ بھی ہے۔

یہ سوچ مکمل ہوئی تو وہ پھر پہلی سوچ پر پہنچ گئی۔ اسے سر سے بات کرنی ہے۔ مگر سٹاف روم کے سوا اور کہیں یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن وہاں اور لوگ بھی ہوں گے۔ کا

ایسا ہو کہ وہ اکیلے ہوں۔ مگر ایسا نجانے کب ہو.... کتنے دن لگ جائیں۔

لیکن اسے یہ موقع جلد ہی مل گیا!

☆

حمید احمد سٹاف روم میں اکیلے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ بڑے سکون سے مطال[عہ کر] رہے تھے۔ کچھ عرصے سے وہ ارادہ کر رہے تھے کہ علم سیاسیات پر ایک کتاب تصنیف کر[یں] یہ مطالعہ بھی اسی سلسلے میں تھا۔

وہ مطالعے میں ایسے مستغرق تھے کہ پہلی دستک انہیں سنائی ہی نہ دی۔ کچھ جگہ کی با[ت] بھی ہوتی ہے۔ جہاں وہ بیٹھے تھے' وہاں پہلے کبھی انہوں نے دستک نہیں سنی تھی۔ لہٰذا ا[س کی] توقع بھی نہیں تھی۔ اور توقع نہ ہو تو پتہ مشکل ہی سے چلتا ہے۔

بہر حال دوسری دستک کے ساتھ ایک مترنم آواز ابھری۔ "میں اندر آسکتی ہو[ں] سر؟"

انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ مدیحہ حامد تھی۔ "یس، کم ان۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھو۔ کیا بات ہے؟"

مدیحہ بیٹھ گئی۔ اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پر سکون کرنے کی کوش[ش] کی۔ وہ بہت زیادہ نروس ہو رہی تھی۔

حمید احمد سوالیہ نظروں سے اسے تکتے رہے۔ انہیں بھی محسوس ہو گیا تھا کہ وہ نرو[س] ہے۔ اور یہ ان کے لئے بہتر ہی تھا۔ "جی؟" انہوں نے لہجے کو مہر و مروت سے پاک رکھا۔

مدیحہ نے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔ لیکن اب بھی بولی [کچھ] نہیں۔ اس کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ پہلی بار تنہائی میں وہ ان کے اتنے قریب بیٹھی تھ[ی]۔

"کیا بات ہے مدیحہ؟ کوئی پڑھائی کا مسئلہ ہے؟" حمید احمد نے خود ہی کریدا۔

"جی نہیں سر!"

حمید احمد جانتے تھے کہ بات کچھ اور ہے۔ مگر انہوں نے یہ ظاہر کیا' جیسے انہیں یہ سن[کر] حیرت ہوئی ہے۔ "تو پھر؟ کوئی ذاتی مسئلہ ہے؟"

"جی ہاں سر۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر حمید احمد کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے جلدی سے اضافہ کیا۔ "آپ نے کبھی ایک ادھوری بات کی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ پوری کر دیں آپ۔"

اب کے حمید احمد سچ مچ حیران ہوئے۔ "ادھوری بات! کون سی بات؟"

"میں آپ کے نامکمل تعارف کے حوالے سے کہہ رہی ہوں سر۔"

"وہ ایسا نامکمل بھی نہیں تھا۔" حمید احمد نے خشک لہجے میں کہا۔ "اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟"

"فرق تو پڑتا ہے سر۔ شخصی خاکہ نامکمل رہ جاتا ہے۔"

"اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟"

"آپ نے کہا تھا سر کہ آپ ہمارے بہترین دوست بھی ہیں۔"

حمید احمد نے اپنے کیریر میں اپنی ہر کلاس سے یہ بات کہی تھی۔ مگر اب پہلی بار وہ یہ بات کہہ کر پچھتا رہے تھے۔ اب کیا کرتے۔ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے۔ "تم کیا جاننا چاہتی ہو میرے بارے میں؟" انہوں نے پوچھا۔ وہ "کیوں جاننا چاہتی ہو؟" بھی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں معلوم تھا کہ جواب میں انہیں اپنا ہی دیا ہوا "بہترین دوست" کا حوالہ ملے گا۔

"آدمی ساتھ وقت گزارتا ہے تو جانتا رہتا ہے۔"

"آپ اپنے گھر اور اپنے بیوی بچوں کے بارے میں بتا دیں۔" مدیحہ نے کہا اور کہتے ہی جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔" حمید احمد نے گہری سانس لی۔ "میں ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ میرا بس ایک بیٹا ہے۔"

مدیحہ کے دل میں مایوسی قطرہ قطرہ گرنے لگی "اور سر؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

حمید احمد کی نظریں جھک گئیں۔ لہجے میں دکھ آگیا۔ "میری بیوی کا بیٹے کی پیدائش کے دوران میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔"

مدیحہ کا دل روشنی سے بھر گیا۔ دل پر سے جیسے پتھر کی کوئی بھاری سل ہٹ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے دل میں تند ملامت ابھری۔ کوئی کسی کی موت

کا سن کر خوش بھی ہو سکتا ہے۔ "سوری سر۔ مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو نو سال ہو گئے۔" حمید احمد نے نظریں اٹھا ہوئے کہا۔

"پھر آپ نے دوبارہ شادی نہیں کی؟"

اس بار حمید احمد نے مدیحہ کو بہت غور سے دیکھا۔ یہ وہ پل تھا' جس میں ان کی پرانی ا دور ہو گئی۔ مدیحہ کس سے مشابہ تھی' ان کی سمجھ میں آ گیا۔ اور ان کی سمجھ میں آیا تو ا ایک سحر سا طاری ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ "نہیں۔"

مدیحہ ان کی تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی۔ وہ اپنی ہی الجھن میں تھی.... زیادہ سے ز معلوم کرنا.... "کیوں سر؟"

حمید احمد اس وقت مسحور تھے۔ ورنہ اسے جھڑک دیتے۔ مگر اس کیفیت میں وہ اس کار انداز میں جواب دے سکتے تھے۔ "جتنی مجھے بیوی کی ضرورت تھی' اس سے کہیں میرے نوزائیدہ بچے کو ماں کی ضرورت تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ اسے ماں نہیں مل سکتی۔"

"کیوں سر؟"

"اس لئے کہ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اور اب اسے جو بھی ملتی' وہ سوتیلی ماں ہوتی۔"

مدیحہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ حمید احمد اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نگا میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ مدیحہ کو ڈر تھا کہ اس نے انہیں غور سے دیکھا تو انہیں اس احساس ہو جائے گا۔ اس سے نگاہیں جھکا لیں۔ "یہ ضروری نہیں ہے سر!" اس نے آہستہ کہا۔

"تم شہریت کی سٹوڈنٹ ہو اور میں شہریت پڑھاتا ہوں۔" حمید احمد تلخ لہجے میں بو "یہ بات سمجھتا ہوں۔ پیدائشی طور پر کوئی عورت سوتیلی ماں نہیں ہوتی۔ لیکن اردگر لوگ' رشتے دار اسے سوتیلی ماں بنا دیتے ہیں۔ وہ اس کے بعد بھی نہ بنے تو بچے کو ضر کرا دیا جاتا ہے کہ وہ سوتیلی ماں ہے۔ کوئی عورت بچے کو اپنی اولاد سمجھے اور اس کی بہتر لئے اس پر سختی کرے تو اس کی نیت کو سمجھے بغیر ہر شخص حقارت اور نفرت سے بھی دیکھ ہے نا آخر سوتیلی ماں اور وہ بے چاری ہر وقت یہی طعنہ سنتی رہے اور بچہ بھی یہی سمجھے کر سکتی ہے یا تو بچے سے بے نیازی برتنے لگے گی یا سچ مچ سوتیلی ماں بن جائے گی۔" انہ

گہری سانس لی۔ "یہ سب میں جانتا تھا۔ اسی لئے میں نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا۔"

مدیحہ کا دل ان کے لئے تڑپنے لگا۔ کیسے پالا ہو گا انہوں نے اس بچے کو۔ کیا گزری ہو گی ان پر۔ اس نے یہ بات کہہ بھی دی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔" حمید احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلی۔ "میں اپنے بچے کو ماں نہیں دے سکتا تھا۔ مگر اپنے لئے تو ماں تلاش کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بچے کو دادی دے دی۔ ایسا رشتہ جسے کوئی خراب نہیں کر سکتا۔ میرے بچے کو ممتا اور محبت بھی مل گئی اور اچھی تربیت بھی۔"

"میں سمجھی نہیں سر۔" مدیحہ نے بلا ارادہ ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

حمید احمد اچانک ہی جیسے ٹرانس سے باہر آ گئے۔ "میں نے کہا نا' میں نے اپنے لئے ماں تلاش کر لی' جو میرے بچے کی دادی بن گئی۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ پھر انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تعارف مکمل ہو گیا۔ اب مجھے کبھی پریشان نہ کرنا۔ اب میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔"

"شکریہ سر! آج ہم دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے۔"

"مدیحہ! تمہیں شاید میری پہلے دن والی بات ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔" حمید احمد نے کہا۔ "میں نے کہا تھا' استاد معلم ہونے کے ساتھ اپنے سٹوڈنٹس کے لئے باپ کی جگہ بھی ہوتا ہے اور ان کا بہترین دوست بھی ہوتا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ سٹوڈنٹس بھی استاد کے بہترین دوست ہوتے ہیں۔ میں تمہارا بہترین دوست ضرور ہوں۔ لیکن تم میری بہترین دوست نہیں ہو۔"

مدیحہ کا چہرہ بے رنگ ہو گیا۔ "پھر بھی میں خود کو آپ کا بہت اچھا دوست سمجھتی ہوں۔ آپ مجھے یہ اعزاز دیں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

حمید احمد نے اس کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا تو انہیں بڑی بے رحم سی خوشی کا احساس ہوا۔ "میں یہ اعزاز تمہیں کیسے دے سکتا ہوں؟" انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم میری مدد' میری رہنمائی نہیں کر سکتیں' جو کہ دوستی کی شرط ہے۔ تم نے تو ابھی زندگی کا آغاز بھی نہیں کیا ہے۔"

"پھر بھی سر! شاید میں کبھی آپ کے کام آ سکوں۔" مدیحہ نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

حمید احمد اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیئے۔ مدیحہ بھی اٹھ گئی۔ "یہ تقریباً
ہے۔" حمید احمد نے چلتے چلتے کہا۔

☆

اس دن حمید احمد اپنے آپ میں گم تھے!

انہیں شرمندگی بھی تھی اور خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ سلمہ کا اور ان کا ساتھ صر
برس کا تھا۔ لیکن انہوں نے سلمہ سے محبت کی تھی۔ شدت اور سچائی کے ساتھ۔
برس ان کی زندگی کے سب سے خوب صورت برس تھے۔ اور وہ اسے یوں بھول گئے
انہیں اس کا چہرہ بھی یاد نہیں تھا۔ اگر یاد ہوتا تو وہ اتنے دن اس لڑکی مدیحہ کو دیکھ
نہیں۔ پہچان لیتے کہ وہ کس سے مشابہ ہے۔ اسے دیکھ کر انہیں کس کی یاد آتی ہے
خیال آتا ہے۔

ہاں، اس لڑکی مدیحہ میں سلمہ کی مشابہت تھی۔ وہ سلمہ کی ہم شکل ہرگز نہیں تھی۔
اس کے چہرے کا اوپری حصہ بالکل سلمہ جیسا تھا۔ اس کی پیشانی، اس کی آنکھیں اور
بھنویں، اس کے رخساروں کا ابھار، ہوبہو سلمہ جیسا تھا۔ لیکن سلمہ بہت خوبصورت تھی۔

زیادتی نہ کرو۔ یہ لڑکی بہت زیادہ حسین ہے۔ اندر کی آواز نے کہا۔

ممکن ہے۔ حمید احمد بڑبڑائے۔ میں اس لئے فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس لڑکی
کبھی غور سے نہیں دیکھا اور جتنا دیکھا، اس نظر سے نہیں دیکھا۔

تو وہ مشابہت مکمل نہیں تھی، جزوی تھی۔ شاید اسی لئے وہ اس مشابہت کے بارے
الجھتے رہے، اسے سمجھ نہیں پائے۔ شاید یہ مشابہت کبھی ان کی سمجھ میں نہ آتی "اگر اس
لڑکی نے ان کا پرانا زخم نہ کریدا ہوتا۔ اسے سلمہ کی موت کے بارے میں بتاتے بتاتے ان
ہی سلمہ کا چہرہ ان کے تصور میں ابھرا اور اس کے ساتھ ہی وہ مشابہت ان کی سمجھ میں
اب انہیں کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ اس کے بعد وہ اسے گھورتے رہے تھے۔ بس خدا کا شکر
وہ نظر نیچی کئے بیٹھی رہی تھی۔ ورنہ نجانے کیا سمجھتی۔

وہ شاید آگہی کا دن تھا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا کہ اتنے برسوں میں وہ سلمہ کو یاد کرنے
لاشعوری طور پر گریز کرتے رہے۔ اور اس کی وجہ بھی تھی۔ جب سلمہ کا انتقال ہوا
تیس سال کے تھے۔ اور ان کے حصے میں ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے صرف تین

آئے تھے۔ صرف تین سال۔ تیس سال کی عمر میں کسی مرد کے لئے بیوی کی موت کے بعد
دوبارہ شادی نہ کرنا.... تجرد کی زندگی گزارنا.... آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر ایک
صحت مند اور تندرست مرد کے لئے۔ مگر انہیں یہی زندگی گزارنا تھی۔ تو سلمہ کو یاد
کر کے وہ اپنے لئے مشکل ہی کھڑی کرتے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو کام میں، گھر کے اور وحید
کے معاملات میں اتنا الجھا لیا تھا کہ سوچنے کی مہلت بھی نہیں تھی اور آدمی دن بھر خود کو
خوب اچھی طرح تھکائے تو رات کو بے سدھ ہو کر سوتا ہے۔

مگر آج وہ لڑکی اپنے سوالات کی ڈور سے انہیں باندھ کر دکھ کی اس گلی میں لے گئی تھی،
جہاں انہوں نے آخری بار نو سال پہلے وقت گزارا تھا۔ اور اب اس سے مفر نہیں تھا۔ آج
انہیں وہ وقت دوبارہ جینا تھا۔ اب وہ یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ یادوں میں کھو گئے!

☆

"سوری مسٹر حمید۔ ہم آپ کی وائف کو نہیں بچا سکے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

وہ حمید احمد کے لئے بہت بڑا شاک تھا۔ یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ آخری وقت
میں بالکل ہی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے سب نارمل تھا۔ ڈاکٹر بھی مطمئن
تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور پھر جب پیچیدگی شروع ہوئی تو ڈاکٹرز بھی کچھ نہ
کر سکے۔ اور نازک اور صحت مند سلمہ زندگی کی جنگ ہار گئی۔

حمید احمد نے خالی خالی نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ "تو اب کیا ہو گا؟" انہوں نے
خالی الذہنی کے عالم میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر کی نگاہوں میں تشویش جھلکی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں۔"

"میں..... میں تو ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"پلیز..... آپ خود کو سنبھالیں۔ آپ کا بیٹا ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔"

اس بار حمید احمد پوری طرح ہوش میں آ گئے۔ یہ تو خوش خبری ہے! انہوں نے سوچا۔
اللہ کا شکر ہے۔ اس صورت حال میں بھی یہ ہے تو خوش خبری، مژدہ ہو کہ تمہارے رب
نے تمہاری نسل آگے بڑھانے کے لئے عنایت فرما دی ہے۔ ورنہ ایک ماں کو اور تمہیں
چھوڑ کر پاکستان آنے والی اس ٹرین میں تمہارے سب لوگ کاٹ ڈالے گئے تھے اور تمہاری

ماں پاکستان آنے کے بعد صرف تمہارے لئے زندہ رہی۔ وہ ڈرتی رہی کہ تمہیں کچھ ہو نہ جائے۔ تمہارے باپ کی نسل ختم نہ ہو جائے تو آج اللہ نے تمہیں نسل آگے بڑھانے کا ذریعہ عطا فرمادیا ہے۔ یہ اس کی عنایت ہے کہ تمہیں اس نے بیٹا دیا۔

حمید احمد کے ہونٹوں پر مضمحل سی مسکراہٹ چمکی۔ مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ "اب کیا ہوگا" اس بار انہوں نے سمجھتے بوجھتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی۔ "چل کر اپنے بیٹے کو دیکھ لیں۔"

انہوں نے بیٹے کو دیکھا' اس کے کان میں اذان دی اور پھر اسے بہت غور سے دیکھا۔

"آپ کے عزیز رشتے دار نہیں ہیں؟" ڈاکٹر کے سوال نے انہیں چونکا دیا۔

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب کو پاکستان کی بڑی آرزو تھی۔ انہیں پاکستان کی آب و ہوا نہیں ملی۔ پاکستان کی فضا میں ایک سانس بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہاں مٹی انہیں پاکستان کی ملی۔"

ڈاکٹر نے ہمدردی سے انہیں دیکھا۔ "پڑوسی وغیرہ۔"

انہوں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ابھی تین ماہ پہلے ہی تو وہ اپنے اس مکان میں آئے تھے۔ ابھی تو پڑوسیوں سے ٹھیک طرح سے ملنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

خیر.... آپ فکر نہ کریں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلا مرحلہ تو آپ کی وائف کی تجہیز و تکفین کا ہے۔"

حمید احمد چونکے۔ ارے.... یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی تو ہونا تھا۔ ہوش میں آؤ۔ انہوں نے خود کو خاموشی سے ڈانٹا۔ بچے تو نہیں۔ پانچ سال کے تھے تو تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرنے والوں کو کیسے دفن کیا جاتا ہے۔ تو اب سمجھ میں کیوں نہیں آرہا۔

"آپ بچے کی فکر نہ کریں۔ جب تک کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔" نرسیں اس کی دیکھ بھال کرلیں گی۔ آپ یہ چیزیں لادیں۔" ڈاکٹر نے ایک پرچہ لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے وہ چیزیں لے جا کر دیں۔ پھر محبوب بیوی کی لاش لے کر گھر گئے۔ اس دن صحیح معنوں میں پہلی بار وہ اپنے پڑوسیوں اور محلے داروں سے متعارف ہوئے۔ پہلی بار انہیں پتہ چلا کہ دکھ کتنا اچھا تعارف کرنے والا ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔ انہیں

پتہ بھی نہیں چلا کہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ بس سب کچھ ہو گیا۔ اس مرحلے سے تو دوسرے لوگ ہی آدمی کو ہاتھوں ہاتھ گزارتے ہیں..... جانے والے کو بھی اور رہ جانے والے کو بھی۔

وہ بیوی کو دفنا کر آئے تو لگتا تھا کہ اپنی نہیں' کسی اور کی ٹانگوں پر چل رہے ہیں۔ گھر پہنچے تو کڑوی روٹی حاضر تھی۔ کڑوی روٹی کس سے کھائی جاتی ہے۔ مگر لوگ کھلا ہی دیتے ہیں۔ یہ یاد دلانا ہوتا ہے کہ تم زندہ ہو اور تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اور کھائے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔

پھر پڑوس کی عورتیں بھی آگئیں۔ "بھائی.... بچے کے بارے میں تو بتاؤ۔"

"بیٹا ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"تو اسے لائے کیوں نہیں۔"

حمید احمد گڑبڑا گئے۔ اس بارے میں تو ابھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ "وہ ہسپتال میں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اور بات کچھ ایسی ہے کہ چھ سات دن تک وہ اسے ڈسچارج کریں گے۔" انہوں نے سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی مہلت حاصل کرنے کے لئے کہا۔

"بھائی۔ فکر نہ کرنا۔ ماں کا بدل تو کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن ہم ہیں نا۔ دیکھ بھال کرلیں گے۔" ایک خاتون بولیں۔

سوچنے کی مہلت تو مل گئی تھی۔ لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ دکھ بانٹنے والے انہیں تنہا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ ان کا خلوص تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ تنہائی میں زخم سے بہت شدید ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ آدمی ہر لمحہ جیتے جی مرتا ہے۔ غمگسار اسے اس سے بچانے کے لئے ہی تو ہوتے ہیں۔

شام کو وہ ہسپتال گئے۔ لوگ تو وہاں بھی ان کے ساتھ جاتے۔ مگر انہوں نے بڑی مشکل سے انہیں ٹالا۔ ہسپتال میں وہ ڈاکٹر ڈیوٹی آف کر کے جا چکی تھی۔ بچہ نرسوں کی تحویل میں تھا۔ وہ اسے ملے۔ "بیٹے وحید احمد' پریشان نہ ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے بچے سے کہا۔ اور اچانک انہیں پتہ چلا کہ وہ بچے کا نام رکھ چکے ہیں... وحید احمد۔

ہسپتال سے نکل کر وہ ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ وہاں وہ پرسکون ہو کر سوچ سکتے تھے۔ انہیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

اس روز بھی انہوں نے یہی سوچا تھا۔ خود سے یہی کہا تھا۔ بچے کی ماں مر جائے
بچے کو ماں کبھی نہیں دے سکتے۔ آپ کوشش کریں بھی تو لوگ' ان کی زبانیں اور
ماں کو ماں نہیں رہنے دیتے۔ سوتیلی ماں بنا دیتے ہیں۔ اور یہ سوتیلی ماں کا رشتہ کڑ
سے بھی کڑوا ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے؟ بچے کو کسی پڑوسن کی گود میں ڈال دیا جائے؟ نہیں... یہ لگ
یہ بچہ جو آنے والی نسلوں کا امین ہے، بہت اہم ہے۔ اس کے لئے کوئی عارضی نہیں
بندوبست کرنا ہو گا۔

اور اگر وہ خود ہی اپنے بچے کی پرورش کریں؟ کیا یہ ممکن نہیں؟ یہ سوچتے ہی ان
طاری ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بچے کا پیشاب' پاخانہ' بھوک پیاس۔ یہ تو فل ٹائم جاب
اور اس میں کتنے ہی ایسے معاملات ہوتے ہوں گے' جو صرف عورت ہی سمجھ سکتی ہے
ماں ہی نمٹا سکتی ہے انہیں۔ اگر اماں زندہ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ اور اماں کو کتنی ار
پوتے کی۔ اور انہوں نے کس طرح انہیں پالا پوسا تھا... بے حد محبت سے' ایک
فرض سمجھ کر۔ وہ ہر وقت ڈرتی رہتی تھیں کہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔ ایسا ہو گا تو ان
نسل ختم ہو جائے گی۔ اماں کو ہر وقت یہی فکر رہتی تھی۔ خود بھوکی رہتیں اور انہیں کھ
خود تکلیف اٹھاتیں اور انہیں آرام پہنچانے کی فکر کرتیں۔ شائد اسی لئے وہ زیادہ نہ جی
ہندوستان سے وہ انہیں پانچ سال کا لے کر آئی تھیں اور اماں کا انتقال ہوا تو وہ سولہ سا
تھے۔

اس وقت اماں ہوتیں تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اماں سب سنبھال لیتیں۔ لیکن
تو پہلے ہی انہیں چھوڑ گئی تھیں' اس وقت جب وہ زندگی میں کچھ بننے کی جدوجہد
تھے۔ اور اماں کے سوا ان کا کوئی تھا ہی نہیں۔ گیارہ برس کی تنہائی کے بعد انہیں
لیکن وہ بھی تین سال کے ساتھ کے بعد انہیں اکیلا چھوڑ گئی۔

اماں کے خیال کے بطن سے ایک اور خیال نے جنم لیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے بچے
نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ تو ناممکن نہیں کہ خود انہیں ماں مل جائے۔ انہیں فوراً
ہو گیا کہ یہ عملاً ممکن نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اس پر غور کیا۔ وہ عمر کے اس حصے
ان کے لئے کوئی ماں سوتیلی ماں نہیں بن سکتی۔ کوئی بنا بھی نہیں سکتا۔ اور پھر سوتیلی

ہوتی ہے جو بچے کے باپ سے شادی کرے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اور ان کی جو ماں ہو گی' وہ بوڑھی بھی ہو گی۔ ان کے گھر میں رہ سکے گی.... سکینڈل کے خوف کے بغیر۔ اور وہ ان کے بیٹے کی دادی ہو گی۔ بڑی محبت سے اس کی پرورش کرے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ بچے کو ترسی ہوئی ہو۔

ذرا دیر سوچنے کے بعد وہ اشتہار لکھنے بیٹھ گئے۔ ضرورت ہے ایک بوڑھی ماں کی جو دنیا میں بالکل اکیلی ہو۔ جسے بیٹے کی نہیں' پوتے کی آرزو ہو جو اپنے پوتے کو پالنے کی طاقت بھی رکھتی ہو۔ اس کے صلے میں اسے اس دنیا میں بس ایک گھر ملے گا' جس میں گھروں کے سے دکھ سکھ ہوں گے' جہاں زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ایک تیس سالہ بیٹے کی محبت اور نوزائیدہ پوتے کی معصوم ادائیں ملیں گی۔ اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول کر فیصلہ کرنے کے بعد فون نمبر.... پر رابطہ کریں۔

انہوں نے اشتہار کی نوک پلک درست کی۔ کالج کا فون نمبر اشتہار میں دیا اور ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی اشتہار کی ایجنسی کا رخ کیا۔ ایجنسی والے نے وعدہ کیا کہ اشتہار اگلے روز اشتہار شائع ہو جائے گا۔

اگلے روز اشتہار شائع ہوا۔ انہوں نے دیکھا اور اپنے کالج چلے گئے۔ پرنسپل صاحب سے وہ بات کر چکے تھے۔ انہوں نے سب کچھ سننے کے بعد ان کے فیصلے کو سراہا تھا۔

اب وہ فون کے پاس بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ گھنٹی بجتی تو وہ سوچتے کہ فون ان کے لئے ہے لیکن ہوتا نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اشتہار شائع ہوتے ہی فون کی گھنٹی مسلسل ان کے لئے بجتی رہے گی مگر دو بج گئے اور ان کے لئے ایک فون بھی نہیں آیا۔

سوا دو بجے پرنسپل صاحب گھر جانے کے لئے اٹھ گئے۔ "آپ کا کیا ارادہ ہے حمید صاحب۔"

"انتظار کرنا چاہتا ہوں جناب!" حمید احمد کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تو آپ بیٹھیں۔ میں چپراسی کو کہے جاتا ہوں۔ وہ رک جائے گا۔ اس سے آپ کھانا بھی منگوا سکتے ہیں۔"

"شکریہ جناب!"

"کوئی بات نہیں۔ جب آپ جائیں گے تو وہ آفس بند کر دے گا۔ اسے اوور ٹائم مل

جائے گا۔"

حمید احمد بیٹھے رہے۔ چار بج گئے۔ اب فون یوں خاموش تھا' جیسے اس کی گھنٹی
گی ہی نہیں۔ حمید احمد کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر سوا چار بجے فون کی گھنٹی بج
نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے وہ آواز تھی' جسے سننے کے لئے انہوں نے اتنا
تھا۔ وہ بہت میٹھی شفیق آواز تھی۔ "مجھے حمید احمد سے بات کرنی ہے۔"

"جی' میں بول رہا ہوں۔"

"ابھی تمہارا اشتہار پڑھا بیٹے۔"

حمید احمد کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ لفظ بیٹے ان کے کانوں میں گونجتا رہا۔ "جی!
نے بڑی مشکل سے کہا۔

"تم سے ملنے کے لئے کہاں آؤں؟"

"آپ کیوں آئیں گی' میں آؤں گا آپ سے ملنے۔ مجھے پتا سمجھا دیں۔"

بیس منٹ بعد حمید احمد بلقیس بیگم کے روبرو بیٹھے تھے۔ انہوں نے پہلی ہی
بلقیس بیگم کو ماں مان لیا اور بلقیس بیگم کا بھی یہی حال تھا۔ انہیں ایسا لگا کہ وہ ان کے
میں بسنے والا وہ بیٹا ہے جس کی وہ زندگی بھر آرزو کرتی رہی ہیں۔

بعد میں یہ بات ثابت بھی ہوگئی!

لیکن اس وقت وہ حمید احمد کے ساتھ ہسپتال گئیں۔ انہوں نے ننھے وحید کو گو
کر خوب پیار کیا۔ وہ اسی دن بچے کو لے کر حمید احمد کے گھر آگئیں۔ حمید احمد نے محلے
کا تعارف سگی خالہ کی حیثیت سے کرایا۔

سب مسئلے حل ہوگئے۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔

اس کے بعد جو پہلا اتوار آیا تو ماں بیٹے ایک دوسرے کو کھوجنے اور سمجھنے بیٹھے تا
دوسرے کے بارے میں سب جان لیں اور اچانک ہی وہ رشتہ دریافت ہو گیا' جو
درمیان تھا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا۔

اس روز بلقیس بیگم نے حمید احمد سے کہا۔ "اپنے بارے میں بتاؤ بیٹے!"

"میں پانچ سال کا تھا اماں' جب پاکستان آیا۔" حمید احمد نے گہری سانس لے کر کہ
چچا' تایا' پھوپیاں' خالائیں' سب ساتھ ہی تھے۔ ٹرین پر حملہ ہوا تو ہمارا پورا خاند

گیا۔ میرے اور اماں کے سوا کوئی نہیں بچا۔"

"سچ مچ میرے بیٹے ہو۔" بلقیس بیگم نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "پھر....؟"

"ہم کچھ دن کیمپ میں رہے۔ پھر کراچی آگئے۔ کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ کہیں بھی پڑ کر سو
تے۔ ایک دن اماں کو ان کے پرانے پڑوسی مل گئے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے
۔"

"کہاں؟"

"ابی سینیا لائن میں سرکاری بیرکس تھیں۔ وہاں ایک کوارٹر تھا۔"

بلقیس بیگم بری طرح چونکیں "کوارٹر نمبر کیا تھا؟"

"تین بٹا آٹھ" حمید احمد نے بتایا۔ "لیکن آپ کیوں چونکیں۔"

"ہم بھی دس سال وہاں رہے۔ خیر' پھر کیا ہوا؟"

"ہم کوئی ڈیڑھ سال وہاں رہے۔ برآمدے میں پڑ کر سو جاتے تھے۔ وہ بہت سخت وقت
۔ ہماری وجہ سے گھر میں جھگڑے ہونے لگے۔ ہمارے پاس کوئی ٹھکانہ ہوتا تو ہم وہ جگہ
ڑ دیتے پھر مجھے ایک مہربان شخص مل گیا۔ اس کی امداد سے ہم نے بیرکس کے سامنے والی
ڑی پر جھگی ڈال لی۔ اماں گھروں میں کام کرنے لگیں۔ زندگی گزرنے لگی۔" حمید احمد کی
ھوں میں پرانے دکھ مچلنے لگے۔ انہوں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "اماں' آپ
ں کہاں رہتی تھیں؟"

"ہم دو نمبر بیرک میں تھے۔"

"کوارٹر کون سا تھا اماں؟"

"دو بٹا تین۔"

حمید کا چہرہ جوش اور ہیجان سے تمتما اٹھا۔ "کمال ہے۔ وہاں تو صابر ماموں رہتے تھے۔"

اب کے بلقیس بیگم بری طرح چونکیں۔ "انہیں تم کیسے جانتے ہو؟"

"ارے اماں' آج میں جو کچھ ہوں' انہیں کے دم سے ہوں۔" حمید احمد کی آواز بلند
گئی۔ "انہوں نے ہی تو ہمیں جھگی ڈالنے کے لئے پیسے دیئے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے
ول میں داخل کرایا۔ میٹرک تک میری تعلیم کے اخراجات وہی برداشت کرتے رہے۔
ول کی فیس' کتابیں' کاپیاں' یونیفارم سب۔ وہ مجھے بیٹا کہتے تھے۔ بہت محبت کرتے تھے

مجھ سے۔ کہتے تھے میرا بس چلے تو تمہیں اپنے گھر لے جا کر رکھوں لیکن اپنی بیوی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا۔ دراصل وہ بے اولاد تھے اور اماں' وہ کہتے تھے.... میں سب کو اپنی طرح سمجھتا ہوں حمید۔ لیکن ایک تم ہو' جسے بیٹا بنانے کو میرا دل مچلتا ہے۔ دیکھو' پڑھو کوئی بڑے آدمی بننا۔ اور اماں' مجھے ہمیشہ یہ بات یاد رہی۔" حمید احمد اپنی رو میں کہے تھے مگر اس احساس نے انہیں روک دیا کہ وہ کوئی اہم بات نظر انداز کر رہے ہیں انہوں نے بلقیس بیگم کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "آپ نے کہا آپ دو بٹا تین میں رہتی تھیں.... تو کیا....؟"

آنسوؤں نے بلقیس بیگم کو کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

حمید احمد بھی آب دیدہ ہو گئے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھے اور ان کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں تھام لئے۔ "تو آپ تو سچ مچ میری اماں ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "بس ہم ملے سکے تھے' آج ملے ہیں۔"

بلقیس بیگم نے ان کی پیشانی چوم لی۔ "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ملا دیا لیکن ان سے اتنے قریب تھے تو اتنے بے خبر کیوں رہے۔ آٹھ سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا پتا نہیں چلا؟"

"نہیں اماں' میں میٹرک میں تھا تو میری اماں چل بسیں۔ اس وقت آپ لوگ ادھر میں ہی تھے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہماری جھونپڑی میں آگ لگ گئی۔ کچھ بھی نہ بچا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ پھر میں نے وہ جگہ ہی چھوڑ دی۔ میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا ماموں نے آٹھ سال میرا بوجھ اٹھایا تھا۔ میں انہیں اور تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا اور ان دنوں وہ بہت دیر سے گھر آنے لگے تھے۔"

"ہاں۔ وہی لالو کھیت والا مکان بنوا رہے تھے۔ وہی جہاں سے تم مجھے لے کر آئے" بلقیس بیگم نے بتایا۔

"بس اماں' میں اکیلا تھا۔ وہاں سے چلا آیا۔ کچھ راتیں فٹ پاتھ پر بھی گزاریں بے سروسامانی میں۔ میٹرک کا امتحان دیا۔ پھر مجھے نوکری مل گئی چپراسی کی۔ رہنے کو کوارٹر بھی مل گیا۔ میں نے نائٹ کالج میں داخلہ لیا اور پڑھائی جاری رکھی۔ دن میں ملازمت

اور رات کو پڑھائی کرتا۔ ماموں کو میں کبھی نہیں بھولا۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ کچھ بن کر رہوں گا تو ماموں کے احسانات کا حق ادا ہو گا۔ میں نے ایف اے میں بھی پوزیشن لی بی اے میں بھی۔ پھر ایم اے کیا۔ اس کے بعد کالج میں پڑھانے لگا۔"

"ان کی روح بہت خوش ہو گی تمہاری کامیابی سے۔" بلقیس بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے سچ مچ حق ادا کر دیا ان کا۔"

"کہاں حق ادا کیا اماں۔ حق تو یہ تھا کہ میں انہیں تلاش کرتا۔ آپ ملتیں تو آپ کو اکیلا نہ رہنے دیتا۔"

"تو یہ اب ہو گیا۔ دیر آید درست آید۔"

"اب تو آپ نے وہ احسان کیا ہے مجھ پر کہ جس کا حق میں ادا کر ہی نہیں سکتا۔"

"نہیں بیٹے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مجھے کتنی بڑی دولت ملی ہے۔" بلقیس بیگم نے کہا۔ "بیٹا اور پوتا ایک ساتھ مل گئے مجھے۔ یہ تم پر میرا احسان نہیں ہے' یہ ایک بہت بڑی ممکن خوشی ہے' جو اللہ نے مجھے تمہارے ذریعے دی ہے...."

"کہاں کھوئے ہوئے ہو بیٹے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔"

حمید احمد چونکے اور یادوں کے بھنور سے نکل آئے۔ چائے واقعی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆

مدیحہ نے پہلے دیکھ لیا تھا کہ محبت میں بے طلبی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کے دم کو کتنی عظمت، کتنی بلندی اور کیسی خوبصورتی ملتی ہے اور اب وہ دیکھ رہی تھی کہ ط ہاتھوں محبت پر کیا گزرتی ہے۔

بے طلب محبت میں لذت تھی، بے خودی تھی، سرشاری تھی۔ اس میں دھیماپن جب سے طلب جاگی تھی، سب کچھ بدل گیا تھا۔ طلب خواہش تھی اور خواہش میں اور دیوانگی تھی۔ کچھ کرنے کی آگ بھڑکتی تھی۔ کچھ کیا جائے.... ایسا کیا جائے جائے۔ کچھ ایسا ہو کہ اس کی قربت میسر آجائے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے تکتے رہ سے باتیں کریں اور وہ صرف ہمارا ہو.... صرف ہمارا۔

طلب اور بے طلبی میں سب سے بڑا فرق سود و زیاں کا تھا۔ بے طلبی میں فائدہ تھا۔ دل و دماغ پر سکون ہوتے تھے۔ مشکل سے مشکل کام آسان لگتا تھا۔ کچھ کرنے کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وجود کی تمام طاقتوں، تمام صلاحیتوں کو ارتکاز میسر ہوتا بات پر غور کرو تو ہر پہلو سے واضح اور صاف طور پر سمجھ میں آجاتی تھی۔ لگتا تھا کہ کریں تو پہاڑ کو اٹھا کر ایک طرف رکھ سکتے ہیں۔ خود اعتمادی بھی بہت ہوتی ہے۔ دو آپ بہت اچھا، شفاف اور پاکیزہ لگتا ہے۔ یقین ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بغیر لفظوں کے ارتکاز کے ذریعے اپنی بات میلوں دور بیٹھے دوسرے شخص تک پہنچا سکتا ہے۔

اور طلب میں نقصان ہی نقصان تھا۔ وجود کے تمام عناصر بے چین اور انتشار تھے۔ ہر چیز پر خواہش قابض تھی۔ خواہش کی آگ تھی، جو سب کچھ جلا رہی تھی۔ کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور تو اور، خواہش بھی پوری طرح سمجھ آتی تھی۔ کچھ کرنے کی نہ آمادگی موجود تھی نہ لگن۔ ایک بے کاری سی مسلط تھی ہو گیا تھا۔ اپنا آپ بہت برا، بہت مشکوک لگتا تھا۔

بس پچھلی بار حمید احمد سے بات کر کے اسے کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ اسے یہ اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ کوئی معیوب خواہش نہیں کر رہی ہے۔ اگر حمید احمد کی بیوی موجود ہوتی تو یہ محبت اس کے لئے بڑی اذیت کا سبب بن جاتی۔ اس نے فیصلہ تو کر لیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ سب کچھ ختم کر دے گی لیکن وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، یہ محبت ختم ہونے والی نہیں۔

بہرکیف اب اس کی کیفیت اچھی نہیں تھی۔ وہ بے چین اور مضطرب رہنے لگی تھی۔ نیند اسے مشکل سے آتی تھی.... اور آتی بھی تھی تو وہ اچھی نیند نہیں تھی۔ وہ چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھی۔ پڑھائی اس کی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

اصل میں طلب سے زیادہ اسے نفاق سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ نفاق تو یوں بھی آدمی کو مفلوج کر دیتا ہے لیکن وہ نفاق جس سے آدمی خود بے خبر ہو، بہت ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہاں معاملہ یہی تھا۔ شعوری طور پر تو وہ مطمئن تھی کہ اس کی طلب معیوب یا غلط نہیں لیکن اس کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ وہ جو کچھ چاہتی ہے درست نہیں۔ معیوب ہے۔ آنے والے وقتوں میں یہ بات اس پر کھل جانی تھی۔

اب اس وقت مسئلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک بے تابی تھی، جس نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اسے جلد بازی پر اکسا رہی تھی۔ اس کی دانست میں حمید احمد کی ازدواجی پوزیشن معلوم ہونے کے بعد اسے یہ حق مل گیا تھا کہ وہ ان پر اپنے جذبات کا اظہار کر دے۔ وہ بے تابی اسے یقین دلاتی تھی کہ اظہار کے بعد اس کا بوجھل پن ختم ہو جائے گا اور وہ ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔

لیکن تعارف کے بہانے معلومات حاصل کرنے کے مقابلے میں یہ مرحلہ بہت دشوار تھا۔ وہ یہ تصور بھی کرتی تو اسے حجاب آتا۔ وہ حمید احمد سے یہ کیسے کہے گی کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ یہ بات تو تنہائی میں ہی کہی جا سکتی ہے اور تنہائی کیسے ملے گی اسے۔ اور کیا یہ بات وہ کالج میں کرے گی۔ کالج کے علاوہ تو کہیں موقع مل بھی نہیں سکتا۔

پھر وہ خوف زدہ بھی تھی.... حمید احمد کے ممکنہ رد عمل سے۔ ممکن ہے، وہ خفا ہوں۔ اسے ڈانٹیں، برا بھلا کہیں۔ تماشا نہ بن جائے کہیں۔ تماشا بننے سے وہ ہمیشہ سے ڈرتی آئی تھی اور اس سے بڑا خوف یہ تھا کہ کہیں ہمیشہ کے لئے بات خراب نہ ہو جائے۔ یہ معاملہ اس کے

لئے بہت اہم تھا۔ یہ سوچنا ضروری تھا کہ بات کس انداز میں کی جائے۔ اسے ز
بہرحال بچنا تھا اور ابھی تک حمید احمد کا ردعمل کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

مگر بے تابی بڑی چیز ہے۔ وہ ہر خوف کو نگل لیتی ہے۔ اس کے سامنے کوئی
مصلحت نہیں ٹھہرتی۔ بات بس موقع ملنے کی تھی۔

اور ایک دن موقع اسے مل ہی گیا!

☆

اس روز صبح سے بوندا باندی ہو رہی تھی!

وحید کی گاڑی آگئی تھی وہ سکول جا چکا تھا۔ حمید احمد ناشتے کے بعد چائے کے گھ
رہے تھے۔ اسی وقت اماں تھالی میں پان رکھے آگئیں۔ انہوں نے تھالی ان کے سامنے

"تم آج بھی کالج جاؤ گے؟" انہوں نے پوچھا۔

حمید احمد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "کیوں.... آج کیا خاص بات ہے؟"

"بارش کے آثار ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں اماں۔ ہلکی بوندا باندی ہے۔ رک جائے گی ذرا دیر میں۔"

"آسمان نہیں دیکھا، اس لئے کہہ رہے ہو؟" اماں نے کہا۔ "گھٹا برسے گی ا
برسے گی۔"

"برسے گی تو برسے۔ میں نے اماں! آج تک چھٹی نہیں کی کبھی۔"

اماں نے محبت سے انہیں دیکھا۔ "ویسا ہی مزاج ہے تمہارا.... ان کے جیسا
کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے۔"

"اپنے کام سے محبت کی بات ہے اماں!" حمید احمد نے پان منہ میں رکھا اور اٹھ
ہوئے۔ "میں جا رہا ہوں اماں!"

اماں دروازے تک ان کے ساتھ گئیں۔ "شام کو پکوان بناؤں گی' بارش تو آج
ہے۔"

"چلیں' مزہ آئے گا۔"

اماں نے روز کی طرح ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "جاؤ.... اللہ خیر سے گھر لائے۔"
بس سٹاپ گھر کے سامنے ہی تھا۔ حمید احمد وہاں پہنچے ہی تھے کہ بارش اچانک تیز

انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ سیاہ ہو رہا تھا۔ گھٹا بے حد سیاہ تھی اور ہر طرف تھی۔
کہیں آسمان کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اماں ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔
انہوں نے سوچا' بارش جم کر ہی ہو گی۔

چند منٹ گزرے تو بارش اور تیز ہو گئی۔ لگتا تھا آسمان پھٹ پڑا ہے۔ انہوں نے سوچا
آج چھٹی کر ہی لی جائے۔ سکول کی چھٹی بھی ہو جائے گی۔ وحید بھی آجائے گا' اچھی تفریح
رہے گی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس ارادے پر عمل کرتے' ویگن آگئی۔ اور وہ بھی آدھی
خالی۔ ورنہ روز وہ کھڑے ہو کر ہی جاتے تھے۔

وہ ویگن میں بیٹھ گئے۔

وہ کالج پہنچے تو پتہ چلا کہ وہاں چوکی دار کے سوا کوئی نہیں ہے۔ چپراسی بھی نہیں آیا تھا۔
بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے رہے۔ ذرا دیر میں کپڑے
سوکھ گئے تو وہ لائبریری میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کتاب نکالی اور اس میں کھو گئے۔ باہر
کیا ہو رہا ہے، انہیں معلوم ہی نہیں تھا۔

انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ وہ کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھے۔
اچانک کسی نے ان کے سامنے ٹرے رکھی اور کہا۔ "لیجئے سر.... گرما گرم کافی پیجئے....
پکوڑے کھائیے اور مطالعے اور برسات' دونوں کے لطف کو دوبالا کیجئے۔"

انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ آنے والے کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے!

☆

مدیحہ کالج کے لئے تیار ہوئی تو بارش بہت تیز ہو چکی تھی۔ اس نے نسرین کو فون کیا۔
کرن نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس موسم میں کالج ہرگز نہیں جائے گی۔ مدیحہ جانتی تھی کہ
کالج جانا بے کار ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہو گا لیکن وہ اپنی طبیعت کو کیا کرتی۔ بارش اس کی
کمزوری تھی اور بارش کے دوران میں ڈرائیو کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ بارش میں وہ گھر
میں ٹک کر بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔

اس روز سب لوگ گھر میں ہی تھے۔ مگر اپنے اپنے کمرے میں بند تھے۔ کچھ کو سونے کا
موقع مل گیا تھا اور کچھ اپنے اپنے کمرے کی کھڑکی سے بارش کا لطف لے رہے تھے۔ مدیحہ
نیچے گئی اور اس نے ڈرائیور کو گاڑی پورچ میں لانے کی ہدایت کی۔ پھر وہ کچن میں چلی گئی۔

نسیمہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "بی بی، آپ یہاں!"

"ہاں۔ کافی بناؤں گی۔"

"مجھے کہہ دیتیں۔ میں بنالاتی۔" نسیمہ نے کہا۔ "آپ جائیں، میں کافی لاتی ہوں۔"

"نہیں۔ میں خود بناؤں گی۔" مدیحہ نے جواب دیا۔ "تم ایسا کرو کچھ پکوڑے تل دو۔"

نسیمہ پکوڑوں کی تیاری میں لگ گئی۔ مدیحہ نے دودھ میں کافی کا پاؤڈر ملایا اور بڑے انہماک سے اسے پھینٹنے میں مصروف ہوگئی۔ اسے اس بات پر بڑا ناز تھا کہ وہ کافی بنانے کے فن سے واقف ہے۔ کبھی خاص موڈ ہوتا تو وہ کافی خود ہی بناتی تھی۔

پکوڑے تیار ہوگئے تو اس نے نسیمہ کو ہدایت کی کہ وہ انہیں اخبار میں لپیٹ کر پیپر بیگ میں رکھ دے۔ اس نے چٹنی بھی رکھوالی۔ پھر اس نے تھرماس میں کافی بھری۔ تھرماس اور پیپر بیگ کو لے کر باہر نکل آئی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔

وہ گاڑی لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ یونہی ڈرائیو کرتی ہوئی کلفٹن جائے گی۔ وہاں کچھ دیر رکے گی، پکوڑے کھائے گی، کافی پئے گی اور پھر ڈرائیو..... آگے جا کر اس کا کالج کا موڈ بن گیا۔ کالج میں کوئی نہیں ہوگا تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ چوکیدار بابا سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ وہ ہر مہینے اسے کچھ نہ کچھ دیتی تھی۔ عید بقر عید پر بھی خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اسے بیٹیوں کی طرح چاہتا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچتی رہی۔ کیسا مزہ آئے گا۔ بابا کے کوارٹر میں سکون سے بیٹھ کر وہ ان کے ساتھ پکوڑے کھائے گی۔ پھر کافی پیئے اور پلائے گی۔ اس کے بعد کالج میں گھومتی پھرے گی جیسے وہاں کی ملکہ ہو۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر سامنے لان میں بارش کا نظارہ کرے گی۔ دل بھر جائے گا تو واپس چل دے گی۔

کالج کا گیٹ کھلا تھا۔ وہ گاڑی اندر لے گئی۔ اس نے گاڑی چوکیدار کے کوارٹر کے شیڈ کے نیچے کھڑی کردی۔ وہ پیپر بیگ اور تھرماس لے کر گاڑی سے اتری تو چوکیدار اپنے کوارٹر سے نکل آیا۔ شاید اس نے گاڑی کی آواز سن لی تھی۔

مدیحہ نے اسے سلام کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے کوارٹر میں گھس گئی۔ "کیسے ہو بابا؟" اس نے پلنگ پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہم ٹھیک ہے بی بی۔ پر آپ اتنا بارش میں کیونکر آگیا؟"

"گاڑی میں بیٹھ کر آگیا بابا!" مدیحہ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ "اور کالج میں تو کوئی نہیں آیا ہوگا، ہے نا؟"

"کوئی نہیں آیا بی بی۔ بس حمید صاحب آیا ہے۔"

مدیحہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ "کون صاحب؟" تصدیق بھی ضروری تھی۔

"وہ پڑھانے والا۔ بھیگا ہوا آیا تھا۔ خود کو سکھایا پھر لیبریری میں بیٹھ گیا۔"

مدیحہ گنگ تھی۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنا مبارک دن ہے۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔

☆

"ارے تم!" حمید احمد نے بے ساختہ کہا لیکن ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"میں تو اس وقت کہیں بھی ہوسکتی تھی سر!" مدیحہ بھی مسکرائی۔ "بارش میں ڈرائیو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ میں اس طرف نکل آئی۔"

"اکیلے؟"

"یس سر!"

"تمہیں معلوم تو ہوگا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"سوچا تو یہی تھا.... مگر یہاں آپ مل گئے۔"

"میں نہ ہوتا تو؟"

"چوکیدار بابا کے ساتھ بیٹھ کر پکوڑے کھاتی، کافی پیتی اور تھوڑی دیر بعد واپس چلی جاتی۔"

"یہ پکوڑے اور کافی...." حمید احمد پھر مسکرائے۔

"میں گھر سے لائی ہوں، لیجئے نا۔" مدیحہ نے کہا۔ "اور سر! آپ مسکرائے کیوں؟"

"آدمی کچھ بھی کرے، نصیب پر یقین کرنا پڑتا ہے۔" حمید احمد نے کہا۔ "اماں مجھے ...ل رہی تھیں۔ کہتی تھیں، پکوان تلیں گی۔ ہم وہاں برآمدے میں بیٹھتے اور صحن کے کڑھاؤ ...ا آسمان کو پکوڑے تلتے دیکھتے ہوئے پکوان کھاتے۔ مگر میں نے انکار کردیا، میں کبھی چھٹی

نہیں کرتا۔"

"آپ کے نصیب کا یہاں جو تھا' لیجئے نا۔"

"یہاں نہیں۔ برآمدے میں بیٹھیں گے اور لان میں بارش ہوتی دیکھیں گے۔"

چند منٹ میں برآمدے میں محفل جم گئی۔ چوکیدار ایک ڈیسک نکال لایا تھا۔ دو کر لگادی تھیں۔ حمید احمد کا موڈ ایک دم بدل گیا تھا۔ اب مطالعہ کرنا انہیں بدذوقی لگ ر اس لڑکی نے آتے ہی سماں بدل کر رکھ دیا تھا۔

بارش کا وہ زور تو نہیں رہا تھا پھر بھی خاصی تیز ہو رہی تھی۔ لان میں بارش ہوتے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ گھاس پر' درختوں کے پتوں پر' برآمدے کی چھت پر بارش گرنے کی آواز کی اپنی ایک خوبصورتی تھی۔

پکوڑے ختم ہوگئے اور پتا بھی نہیں چلا۔ حمید احمد نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولے" مزے دار کافی ہے۔"

"میں نے خود بنائی ہے سر! کافی بنانا بھی ایک آرٹ ہے۔" مدیحہ نے فخریہ لہجے میں

حمید احمد اس وقت عجیب کیفیت میں تھے۔ انہوں نے کبھی خود کو اتنا آزاد محسوس کیا تھا.... پرندوں کی طرح' ہواؤں کی طرح آزاد۔ "ہر چیز.... دنیا کا ہر کام آرٹ ہے اور سائنس بھی۔" انہوں نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "فرض سمجھ کر کرو تو سا اور محبت سے کرو تو آرٹ۔"

مدیحہ نے ستائشی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ "یہ بات میں سوچتی تھی مگر مجھے کہنی آتی تھی۔"

حمید احمد نے یوں چونک کر اسے دیکھا' جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو لمحے وہ اسے بہت غور سے دیکھتے رہے۔ "تم ہمیشہ بارش میں یونہی گھر سے نکل کھڑی ہو مدیحہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی سر!"

"مگر یہ تو خطرناک ہے۔"

"کیسے سر؟" مدیحہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"سڑکوں پر اتنا پانی کھڑا ہوتا ہے۔ گاڑی بند بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہوتی رہی ہے سر!"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب ایسا ہو تو تم اپنے گھر سے بہت دور ہو۔"

"ایسا بھی ہوا ہے سر!"

"تب تم کیا کرتی ہو؟"

"گاڑی لاک کر کے پیدل چل پڑتی ہوں۔ تھک جاؤں تو کوئی رکشا ٹیکسی تلاش کرتی ہوں۔ وہ نہ ملے تو گھر فون کر دیتی ہوں کہ مجھے فلاں جگہ سے پک کر لیا جائے۔"

حمید احمد سوچتے رہے۔ پھر پر خیال لہجے میں بولے۔ "بہت آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔"

"جی سر!"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"ہمارے گھر میں سب کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے مگر میں نے کبھی ان سے استفادہ نہیں کیا۔ مجھے پابندیاں اچھی لگتی ہیں۔"

حمید احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تو پھر یہ بارش میں...."

"ہمارے گھر میں یہی ایک پابندی ہے سر۔ باقی جس کا جو جی چاہے کرے' کوئی روکنے والا نہیں۔ میں بچپن سے بارش کی شیدائی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خوب بھیگوں' پانی میں چھپ چھپ کر چلوں۔ کچھ ڈر لگے' کچھ خوشی ہو۔ مگر ہمیں نکلنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اب میں گاڑی اسی امید پر لے کر نکلتی ہوں کہ وہ کہیں بند ہو جائے گی اور مجھے پیدل چلنے کے ایڈونچر کا موقع مل جائے گا۔ سچ یہ ہے سر! کہ مجھے اس میں ڈر بھی بہت لگتا ہے۔ کسی ایسے ویسے شخص سے ٹکراؤ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن سر! میں کیا کروں۔ میں بارش کو Resist کر ہی نہیں سکتی۔ بس اللہ سے تحفظ مانگتی رہتی ہوں۔"

اس لہجے میں وہ حمید احمد کو چھوٹی سی بچی کی طرح لگی۔ اور آخری بات انہیں بہت زیادہ عجیب لگی۔ ایسے آزاد خیال لوگ اور اللہ کا نام' دعا! مگر یہ لڑکی عجیب تھی۔ جب وہ اس کے بارے میں کوئی تاثر قائم کرتے، فوراً ہی اس کی نفی ہو جاتی۔ "تم عجیب لڑکی ہو۔" انہوں نے کہا۔ "جو نظر آتی ہو، اس کی بنیاد پر کوئی تاثر لیتا ہوں۔ پھر ذرا غور سے دیکھوں تو پتہ چلتا ہے کہ تم ویسی نہیں ہو' اس سے مختلف ہو۔"

"بس تو آپ مجھے بہت غور سے دیکھا کریں سر!" مدیحہ نے بے ساختہ کہا۔ پھر کافی دوں سر!"

"ہے تو دے دو۔"

مدیحہ نے ان کی پیالی بھر دی۔ ابھی وہ خود کو اصل بات کے لئے تیار کر رہی تھی تو نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اتنے خوبصورت ماحول میں اتنا اچھا موقع شاید نہیں مل سکے گا۔

مگر وہ بات نہ کر سکی۔ اسے موقع ہی نہیں ملا۔ حمید احمد نے اس سے اپنے سبجیکٹ گفتگو شروع کر دی۔ پھر وہ بھی اس میں الجھ گئی۔ اچھا خاصا علمی بحث کا نقشہ بن جیسے بات آگے چلی، حمید احمد کے انداز میں اس کے لئے احترام بڑھتا چلا گیا۔

"سر.... میں تو یہ بھی نہیں مانتی کہ یہ سبجیکٹ ہمارے لئے ہے۔" وہ تھی۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی بنیاد میں ہماری معاشرت مغربی معاشرت سے بال ہے۔ شخصی آزادی کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بنیادی انسانی حقوق لیجئے، مغرب میں آدمی کچھ کہنے، کچھ لکھنے، کچھ کرنے کے لئے مادر پدر آزاد ہے۔"

"آزادی تو ہمارے ہاں بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا پرچار تو کیا جاتا ہے"

"لیکن دی نہیں جاتی۔ دی نہیں جا سکتی۔ ہم چاہے یہ بات بھول چکے ہوں لیکن یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی بنیاد شخصی آزادی پر نہیں، اخلاقی اقدار پر ہے۔ ہمیں کچھ لکھتے، کچھ کرتے وقت صرف یہ سوچنا چاہئے کہ وہ اخلاقی طور پر درست ہے یا نہیں

"مگر ایسا ہوتا تو نہیں۔" حمید احمد نے اعتراض کیا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی تقلید کر رہے ہیں اور وہ بھی مکمل نہیں چاہے، وہ ہم مغرب سے لے لیتے ہیں۔ اس کو اچھے برے کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے۔

کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر حمید احمد نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا ک مضمون لیا ہی کیوں؟"

"یہ تو ضروری ہے سر۔ ہم اپنے نظریات کا موازنہ دوسروں کے نظریات اپنے نظریات پر یقین بڑھے گا لیکن کچھ پڑھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اسے دیکھے جائے۔ آپ دیکھیں کہ اہل مغرب قرآن کا، اسلامی نظریات کا مطالعہ کرتے

مسلمان نہیں ہوتے۔ ہاں، کچھ باتیں اپناتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ فلاحی ریاست کا تصور انہوں نے کہاں سے لیا؟ قرآن سے..... اسلام سے۔"

حمید احمد نے گہری سانس لی۔ "تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی مدیحہ!" انہوں نے کہا "مجھے وہ سٹوڈنٹ بہت اچھے لگتے ہیں جو نصاب کو رٹنے کی بجائے اس سے سیکھنے اور نظریات کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ تمہارے پاس اور کون سے سبجیکٹس ہیں؟"

"اردو اور اسلامک سٹڈیز سر!"

"یہ کچھ عجیب امتزاج نہیں۔"

"جیسے میر اور غالب کو پسند کرنا۔" مدیحہ نے لطیف سے چٹکی لی۔ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "شعر و ادب کا تعلق زندگی کی لطافت، خوبصورتی اور محبت سے ہے۔ اسلامک سٹڈیز کا تعلق عملی زندگی اور اسلامی معاشرت سے ہے جبکہ سوکس مغربی معاشرت ہے۔"

"بہت خوب۔ یعنی مضامین کا انتخاب تم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"نہیں سر! انتخاب میں بے سوچے سمجھے کرتی ہوں.... محبت اور دلچسپی کی بنیاد پر۔ بعد میں سوچنے سمجھنے پر انتخاب کی درستی ثابت ہوتی ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" حمید احمد نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ "تم بہت برائٹ ہو لیکن ٹیسٹ میں وہ سادہ پرچہ...."

مدیحہ بہت خوش تھی کہ گفتگو نے خود ہی موقع فراہم کر دیا ہے۔ "ان دنوں میں ایک مسئلے میں الجھی ہوئی ہوں سر!" اس نے کہا۔ "آپ سے اس پر بات کر سکتی ہوں سر؟"

"کیوں نہیں۔ استاد اپنے شاگرد کا بہترین دوست ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے۔"

"نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ پھر بہترین دوست کیا رہا۔"

"مجھے دلیل سے سمجھائیں سر!"

"یہاں سے شروع کرو کہ استاد کو اپنے شاگرد کا بہترین دوست کیوں ہونا چاہئے۔" حمید احمد نے بڑے جوش سے کہا۔ "تاکہ اس کے سٹوڈنٹ اس سے ہر طرح کے مسائل پر بلا جھجک بات کر سکیں اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ یہ استاد کی ذمے داری ہے کہ اس کے سٹوڈنٹ سٹڈی میں اپنی اہلیت سے پیچھے نہ رہیں۔ بلکہ اہلیت سے بڑھ کر علم حاصل کریں۔

اب کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہے، جو اس کی پڑھائی کو متاثر کر رہا ہے تو یہ استاد کا بھی فر[ض] نا۔ اور اسے اس کو سلجھانے میں اپنے سٹوڈنٹ کی مدد کرنا چاہئے تاکہ وہ پوری یکسوئی [سے] پڑھائی پر توجہ دے۔"

"لیکن بعض مسئلے بے حد ذاتی ہوتے ہیں۔"

"اسی لئے تو میں استاد کے ساتھ بہترین دوست بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھو مسئلہ پڑھائی کی راہ میں رکاوٹ بنے' وہ استاد سے ڈسکس کیا جا سکتا ہے اور میرے خیال [میں] کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس سے پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔ گویا تم مجھ سے ہر مسئلے پر بات کر [سکتی] ہو۔"

مدیحہ مسکرائی۔ "شکریہ سر۔ آپ نے بات پوری طرح واضح کر دی۔" اس نے [گہری] سانس لی۔ وہ اب بھی ڈر اور جھجک رہی تھی۔ بالآخر اس نے کہا۔ "مجھے کسی سے محبت ہ[و گئی] ہے سر!"

حمید احمد ایک لمحے کو گھبرائے۔ انہیں اپنی میز کی دراز میں رکھا پرچہ یاد آ گیا۔ لیکن ا[گلے] ہی لمحے انہوں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ محقق بن گئے جو حقائق کو درست اور خا[نہ بند] کر کے ترتیب دیتا ہے تاکہ تجزیہ کر کے مسائل کی تہ میں پہنچا جا سکے اور ان کا حل ڈھ[ونڈا] جا سکے۔ "تمہیں مجھ سے سوچ سمجھ کر' ناپ تول کر بات کرنی ہو گی۔ اس کے باوجود کہ مسئلے کا تعلق جذبات سے ہے اور جذبات کا تعلق نہ سمجھ بوجھ سے ہوتا ہے' نہ ناپ [تول] سے۔" وہ لڑکی کی اعصابی کشیدگی اور جھجک کم کرنے کی غرض سے مسکرائے۔ "اب تمہیں محبت ہو گئی ہے یا محبت کرنے لگی ہو؟"

"پہلے مجھے محبت ہوئی' اب بالارادہ کرتی ہوں۔"

"اس میں مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ میرے وجود کی تمام قوتیں' میری تمام Resources اس مح[بت پر] مرتکز ہو گئی ہیں۔ کچھ اور سجھائی ہی نہیں دیتا مجھے۔"

"ہم..... یہ تو نقصان دہ ہے۔" حمید احمد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"مجھے نقصان کا احساس نہیں ہوتا۔"

"یہ اور بری بات ہے۔" حمید احمد نے مربیانہ انداز میں کہا۔ "خیر، ہمیں اس کا

تلاش کر کے اسے دور کرنا ہو گا۔ مگر پہلے اس کی اہمیت کا تعین کر لیا جائے۔ تم عمر کے اس حصے میں ہو جہاں آدمی بڑی آسانی سے محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی نے جوانی میں قدم رکھا ہوتا ہے۔ اسے یہ نیا نویلا اپنا آپ بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ یہ بات کسی اور سے سنے۔ اور وہ کوئی اور جنس مخالف میں سے ہو۔ دنیا میں زیادہ تر محبت اسی طرح ہوتی ہے۔"

"اس کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو اسے Real ہی کہوں گی۔" مدیحہ نے کہا "لیکن سر! پہلے ایک بات میں آپ سے پوچھ لوں۔ آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"

حمید احمد گڑبڑا گئے پھر ان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "نہ کبھی اتنی فرصت ملی' نہ کبھی کوئی ایسا موقع آیا۔ زندگی جدوجہد میں گزری ہے۔ دنیا میں اماں کے سوا میرا کوئی تھا ہی نہیں۔ میٹرک کرنے سے پہلے ہی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ پھر میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ملازمت کرتا رہا۔ کچھ بننے کی لگن تھی۔ مصروفیت اتنی تھی کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ محبت نام کی کوئی شے دنیا میں پائی جاتی ہے۔ پھر لیکچرار شپ ملی تو میں بے گھری کا مارا گھر بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ ایک کولیگ کی مہربانی سے گھر بننے سے پہلے ہی بس گیا....."

"آپ نے اپنی بیگم کو شادی سے پہلے....."

"ہاں۔ دیکھا بھی نہیں تھا۔" حمید احمد نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "شادی کے بعد بھی میں گھر بنانے کی جدوجہد میں لگا رہا اور گھر بنا تو چند ماہ بعد اجڑ بھی گیا۔ ہاں تین سال کے ساتھ میں، میں نے اپنی بیوی سے محبت کی۔ لیکن وہ ایسی محبت تو نہیں ہو سکتی کیونکہ میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔"

مدیحہ انہیں بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ "بڑی سخت زندگی گزاری ہے آپ نے۔"

"اللہ کے کرم کے سائے میں سختی کم ہو جاتی ہے۔ ویسے میں فٹ پاتھ پر بھی سویا ہوں..... تکئے اور چادر کے بغیر۔ زمانے کے سرد و گرم بھی دیکھے۔ زندگی کے کچھ روپ برتے' کچھ دیکھے۔ سیکھا دونوں سے۔ اب خوش اور مطمئن ہوں۔ جو چاہتا تھا' وہ بن گیا۔ جو چاہا' وہ مل گیا۔"

"اور اب محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"سچ بتاؤں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاعری میں' افسانوں میں' داستانوں میں پا
ہے۔ اسے پڑھ کر لوگ انسپائر ہوتے ہیں اور محبت کے گمان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"اور سر! اگر اب آپ کو کسی سے محبت ہو جائے تو؟"

"یہ ممکن ہی نہیں۔ یہ اسی دن طے ہو گیا تھا جس دن سلمہ.... میری بیوی کا انت
تھا۔ جب مجھے ضرورت تھی' تب نہیں ہوئی تو اب محبت کیا ہو گی۔"

"محبت سچی تبھی ہوتی ہے سر جب اس کی ضرورت نہ ہو۔" مدیحہ نے آہستہ سے
حمید احمد نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ "تم نے مجھ سے کیوں پوچھا تھا محبت کا؟"

"یہ جاننے کے لئے کہ آپ اسے سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟"

"بہت کچھ ایسا ہے جو میں نے نہیں کیا۔ لیکن میں اس کے بارے میں سمجھتا ہوں
احمد نے بے حد اعتماد سے کہا۔ "میں نے خدا کو نہیں دیکھا، لیکن مانتا ہوں' جانتا ہوں۔ یہی علم ہے۔ تم ایسا کرو کہ مجھے شروع سے بتاؤ.... سب کچھ۔ اور فیصلہ مجھ
دو۔"

مدیحہ نے لان میں گھاس پر بنے پانی کے چھوٹے چھوٹے تالابوں کو دیکھا۔ بوند
اس رم جھم میں وہ اپنے اندر کی بارش کا حال بیان کرنے لگی۔

☆

مدیحہ اس پر حیران تھی کہ اس نے سب کچھ کہہ دیا.... سب کچھ بتا دیا۔ مگر اس طرح کہ حمید احمد کو گمان بھی نہ ہو کہ اس کہانی کا دوسرا کردار وہ خود ہیں اور یہ سب کچھ غیر شعوری تھا۔ ایسا ہے تو وہ ان کے سامنے اظہار کس طرح کر سکتی ہے۔

حمید احمد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "میں جانتا ہوں مدیحہ! کہ تم جھوٹ بولنے والی نہیں ہو' وہ کہہ رہے تھے۔ "اور جو کچھ تم نے بتایا وہ گھڑا ہوا ہو بھی نہیں سکتا۔ اسے سننے کے بعد میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کیفیت کسی وہم کسی گمان میں نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بڑا سچا' بڑا عظیم جذبہ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ محبت نہ تمہیں ہوئی' نہ تم نے کی۔ یہ تو تمہیں عطا کر دی گئی۔ بغیر محنت' بغیر ریاضت کے تمہیں اتنا کچھ مل گیا۔" یہ کہتے ہوئے ایک پل کو ان کے دل میں حسرت سی جاگی.... یہ محبت مجھے بھی تو مل سکتی تھی۔

"میں تو یہ بھی کہتی ہوں سر! کہ مجھے بغیر اہلیت کے، ظرف کے بغیر اتنی بڑی چیز ملی اور مجھ سے سنبھالی نہیں گئی۔"

"اس سے میں اختلاف کروں گا۔ دینے والے نے پہلے تمہیں اہلیت اور ظرف عطا فرمایا۔ پھر محبت ودیعت فرمائی۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ جذبہ لافانی اور آسمانی ہے۔ مگر انسان اپنی جبلت' اپنے فطری تقاضوں کے حصار سے نہیں نکل سکتا۔ تو ایسے میں وہ اسے طلب کے' غرض کے دنیاوی تصور سے آلودہ کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ اب اس آلودگی کے نتیجے میں آئینہ تو دھندلا جائے گا۔ کیفیت بھی آسمانی سے زمینی ہو جائے گی۔"

"اب آپ مجھے مشورہ دیں سر!"

حمید احمد چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔ "میں تم سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ Try to go back to square "A" طلب کو بھلا کر بے طلب محبت کی طرف لوٹ جاؤ۔ وہاں عظمت ہے۔ آسمانوں کی رفعتوں تک پہنچانے والا تقدس ہے۔"

"یہ میں خود سے کہہ بھی چکی ہوں اور کوشش بھی کر چکی ہوں سر!" مدیحہ
"لیکن یہ میرے بس میں نہیں۔ اس معاملے میں پہلے لمحے سے اب تک میں اختیار ے
رہی ہوں۔ نہ میں اس محبت سے دامن چھڑا سکی' نہ اس طلب سے۔ یہ تو ایک رو ہے
بہائے لئے جا رہی ہے۔"

"تو پھر ایک ہی صورت ہے۔ تم اظہار کر دو' ہلکی ہو جاؤ۔"

"یہ تو میں چاہتی ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔"

"کیوں؟"

"ڈرتی ہوں سر! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"سب کچھ کھو جائے گا۔ سب کچھ چھن جائے گا۔" مدیحہ کے لہجے میں خوف تھا۔
جائے گا سب کچھ اور میں یہ نہیں چاہتی۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب کچھ تم
مانگے ملا ہے' بن چاہے چھن بھی سکتا ہے۔"

"میں ان کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی۔"

"ایسا ہونا تو نہیں چاہئے۔ اچھی چیز کسی کو بری نہیں لگتی۔" حمید احمد بولے۔ "او
بری لگے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس اچھی چیز کا مستحق نہیں۔ پھر ایسے کی نظر
گرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"میں کیا کروں سر!"

حمید احمد چند لمحے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ "ابھی تم نے خود ہی کہا
رو ہے جو تمہیں بہائے لئے جا رہی ہے۔ وہ رو ایسی ہے کہ تمہیں طلب میں مبتلا کر د
کوشش کے باوجود اس سے باز نہیں رہ سکتیں۔ تو پھر مسئلہ کیا ہے۔ بہے جاؤ' جب
اظہار کرانا چاہے گی تو تم چاہتے ہوئے بھی اس سے باز نہیں رہ سکو گی۔ پریشان ہونے
فائدہ۔

مدیحہ افسردہ ہو گئی۔ اتنا اچھا وقت' اتنے خوبصورت لمحے کم کم ہی ملتے ہیں۔ بارش
رکتی تو کتنا اچھا ہوتا اور بارش کل تک ہوتی رہتی تو....

"اب چلتے ہیں۔" حمید نے اسے آگے نہ سوچنے دیا۔ ورنہ خواہش رکتی کب ہے۔ وہ تو پہلے ہی جاتی ہے۔

"میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی سر!"

☆

"دادی اماں! ابو ابھی تک نہیں آئے۔" وحید نے کہا۔

بلقیس بیگم نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ایک بجا تھا۔ "اب تو وہ اپنے وقت پر ہی آئیں گے بیٹے۔ تم کھانا کھالو۔"

"ٹھیک ہے دادی اماں' دے دیں۔" وحید نے منہ لٹکا کر کہا۔ وہ بہت ناخوش نظر آ رہا تھا۔

بلقیس بیگم کچن کی طرف چل دیں۔ مگر وہ پریشان بھی تھیں اور انہیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ حمید کے نکلتے ہی بارش تیز ہو گئی تھی۔ اسے واپس آ جانا چاہئے تھا۔ مگر وہ ضدی لڑکا نہیں آیا۔ چھٹی نہیں کروں گا.... ہنہ۔ اور ایک گھنٹے بعد سکولوں کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وحید بھی گھر آ گیا تھا اور اسے امید تھی کہ ابو بھی واپس آ جائیں گے۔ تب سے وہ ایک ایک پل گن رہا تھا۔ اب بھوک سے مجبور ہو کر کھانا کھانے کے لئے آمادہ ہوا تھا۔

وہ کھانا لے کر گئیں۔ مگر وحید بڑی بے دلی سے کھا رہا تھا۔ "اچھی طرح کھالے بچے۔ تیرے ابو آئیں گے تو پکوان تلوں گی۔ پھر ساتھ بیٹھ کر کھانا۔" انہوں نے وحید کے آنے کے بعد ہی پکوان کی تیاری کر لی تھی۔ چٹنی پیس لی تھی۔ بیسن تیار کر کے رکھ لیا تھا۔ حمید کے آتے ہی وہ گرم گرم پکوڑے اتار لیتیں۔

وحید کے انداز میں اب بھی بے رغبتی تھی۔ "لا.... میں اپنے ہاتھ سے کھلا دوں۔" بلقیس بیگم نے کہا اور نوالے بنا بنا کر اسے دینے لگیں۔

"ابو کتنی دیر میں آئیں گے دادی؟"

بلقیس بیگم کو پھر حمید پر غصہ آنے لگا۔ صبح سے بارش اب جا کر رکی تھی۔ انہوں نے دروازے پر جا کر دیکھا تو باہر سیلاب کا سا سماں نظر آیا۔ اب ایسے میں واپس آنا آسان تو نہیں ہوگا۔ سامنے سڑک پر بھی اکا دکا گاڑی ہی آتی جاتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اتنی دیر کھڑی رہیں مگر بس یا ویگن تو ایک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ انہیں تشویش تھی کہ کہیں حمید کو پیدل نہ آنا پڑے۔

'اللہ' اسے اپنی امان میں رکھنا۔ انہوں نے دل میں دعا کی اور بلند آواز میں وحید
''بس ایک دو گھنٹے بعد آ جائیں گے تمہارے ابو۔ بس تم دعا کرو کہ انہیں آنے میں پر
ہو۔''

☆

''بس یہیں اتار دو مجھے' حمید احمد نے کہا۔ ''وہ سامنے ہی میرا گھر ہے۔''

''مجھے اپنا گھر نہیں دکھائیں گے۔ اپنے بیٹے سے نہیں ملائیں گے۔''

''کیوں نہیں۔ تمہیں چائے بھی پلوادوں گا۔ بس دیر ہو جانے کے خیال سے کہ
حمید احمد کے لہجے میں معذرت تھی۔

مدیحہ نے سامنے حمید احمد کے گھر کی طرف دیکھا اور گاڑی کچے راستے پر موڑ دی
پانی بھرا ہوا تھا۔ بعض جگہ زیادہ ہی گہرا تھا۔ وہ احتیاط سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ مگر اچا
لگا اور گاڑی ایک طرف جھک گئی۔ بائیں جانب والا پہیہ یقیناً کسی گڑھے میں پھنس گیا
اور اگلے ہی لمحے گاڑی بند ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' حمید احمد نے پوچھا۔

مدیحہ مسکرائی۔ ''وہی جو ہوتا ہے.... ایڈونچر۔''

مدیحہ نے گاڑی لاک کی اور اتر آئی۔ حمید احمد بھی اتر آئے تھے۔ ''تم گھر میں چا
مدد تلاش کرتا ہوں۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں سر! آپ کے گھر میں پھر کبھی آؤں گی۔'' مدیحہ بولی۔ ''اور مدد مل بھی گ
بات کی گارنٹی نہیں کہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی۔ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہ

''تو پھر اب کیا کرو گی؟'' حمید کے لہجے میں تشویش تھی۔

''گھر جاؤں گی۔ مکینک کو فون کر کے یہاں بھیجوں گی' وہ گاڑی پہنچا دے گا۔''

''اور گھر کیسے جاؤ گی؟''

''بتایا تو تھا آپ کو، ویسے ہی۔''

''مگر سڑکوں پر رکشا ٹیکسی بہت ہی کم ہیں۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں سر!''

''اور تمہیں جانا کہاں ہے؟''

''ڈیفنس سوسائٹی۔''

حمید احمد دہل گئے۔ ''وہ تو بہت دور ہے۔ اگر ٹیکسی نہیں ملی اور پیدل جانا پڑا تو۔''

''یہی تو ایڈونچر ہے سر!''

''میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہیں چھوڑنے چلوں گا۔''

مدیحہ نے اس پر رسماً بھی احتجاج نہیں کیا۔ قسمت اسے مزید چند خوبصورت ساعتیں عطا کر رہی تھی تو وہ کفران نعمت کیوں کرتی۔ وہ تو دعا کر رہی تھی کہ ٹیکسی نہ ملے اور حمید احمد کے ساتھ چلتی جائے.... آپ گھر میں تو بتا دیں۔'' اس نے کہا۔

''گھر چلا گیا تو میرا بیٹا مجھے نکلنے نہیں دے گا.... چلو.... آ جاؤ۔''

وہ مین روڈ کی طرف چل دیئے۔ مین روڈ پر بھی جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ کہیں کہیں تو فٹ پاتھ بھی غائب ہو چکا تھا.... ''آپ کا بیٹا کتنا بڑا ہے سر!''

''نو سال کا ہے۔''

اسی وقت ایک ٹیکسی کی آواز سنائی دی۔ حمید احمد نے پلٹ کر دیکھا اور رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مدیحہ فیصلہ کر رہی تھی کہ حمید احمد کو سب کچھ بتا دے گی۔ ٹیکسی رکی تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا اسے موقع نہیں ملے گا؟

ٹیکسی والے نے کھڑکی کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''کہاں جانا ہے بابو جی؟''

''ڈیفنس سوسائٹی۔''

ٹیکسی ڈرائیور سوچ میں پڑ گیا چند لمحے بعد بولا۔ ''میں آپ کو شاہراہ فیصل پر گورا قبرستان کے پاس چھوڑ سکتا ہوں۔''

حمید احمد مدیحہ کی طرف مڑے۔ ''وہاں سے تمہارا گھر کتنی دور ہے؟'' پھر خود ہی بولے۔ ''کتنا بھی ہو۔'' بڑا فاصلہ تو طے ہو چکا ہو گا۔ پتہ نہیں' دوسری ٹیکسی ملے یا نہ ملے۔ 'چلو بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے دروازہ کھولا۔ مدیحہ بیٹھ گئی پھر وہ بھی بیٹھ گئے۔

ٹیکسی چل دی۔

☆

ٹیکسی میں ایسی خاموشی تھی جیسے کہنے کو کچھ نہیں بچا ہو۔ ٹیکسی کے دونوں مسافر پچھلی سیٹ پر بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ یہ الگ بات کہ دونوں ایک دوسرے کے بارے

میں سوچ رہے تھے۔ البتہ انداز مختلف تھا۔

مدیحہ نے اپنی محبت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا' حمید احمد اس کے بارے میں سوچا کر
تھے۔ جو کچھ انہوں نے سنا تھا' اس نے ان کے اندر شدید احساس محرومی پیدا کر دیا تھا۔ بلکہ
انہیں احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے کتنی خشک اور بے کیف زندگی گزاری ہے۔ سختی کی
کوئی بات نہیں۔ زندگی میں تھوڑی سی لطافت بھی مل جائے تو سختی سختی نہیں لگتی۔ مگر
کچھ تو انہیں کبھی ملا ہی نہیں۔

آہ.... زندگی کے 39 برس گزر گئے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد صرف ایک سال انہ
نے خوشیاں دیکھیں۔ اپنا بھرا پرا گھر دیکھا۔ باپ کی شفقت' ماں کی ممتا اور رشتے دارو
محبت ملی۔ وہ سب کی آنکھوں کے تارے تھے۔ گھر کے پہلے بچے جو تھے۔ وہ یقیناً بہت خو
گوار وقت ہو گا۔ مگر اب تو بس ان کے ذہن میں اس کا دھندلا سا' مٹا مٹا سا خاکہ ہی رہ گیا ت

پھر انہوں نے ہجرت دیکھی۔ باپ کی' محبت کرنے والوں کی لاشیں دیکھیں۔ ا
منوں مٹی کے نیچے دفن ہوتے دیکھا۔ پھر بے گھری دیکھی۔ ماں کو جوانی میں اجڑتے د
جنہوں نے انہیں پناہ دی تھی' ان کے طعنے اور جھڑکیاں سنیں۔ محبت تو دور کی بات ا
بھی نہیں ملی۔ ہر لمحے عزتِ نفس بھی پامال ہوتی تھی۔ اماں یقیناً ان سے بہت محبت
تھیں۔ لیکن جہاں SURVIVAL ہی مسئلہ بن جائے' وہاں محبت کا اظہار ایسی عشرت
جاتا ہے، جس کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ سو اماں نے کبھی اپنی محبت ظاہر نہیں کی۔
انہیں چوما نہیں۔ کبھی آغوش میں نہیں بھینچا۔ ہاں وہ ان کے لئے پریشان اور فکر مند
تھیں۔ ان کی زندگی کا بس ایک نصب العین تھا۔ وہ زندہ رہیں' بڑے ہوں' شادی کری
اپنے ابا کی نسل کو آگے بڑھائیں۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ نہیں چاہئے تھا۔ اس کے ل
طعنے اور جھڑکیاں بھی سہہ سکتی تھیں اور بے عزتی بھی برداشت کر سکتی تھیں۔

پھر ان کی زندگی میں چند برسوں کے لئے صابر علی کی دبی دبی محبت آگئی۔ ان کے
محبت بھی بہت تھی۔ کوئی بغیر کسی رشتے اور تعلق کے ان کی فکر کرتا ہے۔ انہیں
بڑھتے' ترقی کرتے' کچھ بنتے دیکھنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اسے حرز جاں بنا لیا۔ انہوں نے
میں بہت محنت کی۔ کھیلنے کودنے کا انہیں نہ کبھی موقع ملا۔ نہ انہوں نے اس میں دلچ
بس انہیں ایک بات یاد رہی۔ انہیں پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے۔ دنیا میں عزت' کوئی مقام

کرنا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں وہ بیک وقت ماں سے اور صابر علی کی محبت سے محروم ہو گئے۔ اس
کے بعد انہوں نے توجہ اور محبت سے محروم گیارہ طویل برس گزارے۔ ان میں چھ سال
ایسے تھے' جن میں انہوں نے بے پناہ مشقت کی۔ اس عرصے میں آرام کی نیند ایک بہت
بڑی عیاشی تھی' جو انہیں کبھی کبھی ہی میسر آتی تھی۔ پھر لیکچرار شپ ملی تو رت کچھ بدلی لیکن
جدوجہد نہیں رکی۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے دکھ' بے گھری کا مداوا کرنے میں
معروف ہو گئے۔ پھر ان کی زندگی میں سلمہ آگئی۔

سلمہ بہت اچھی بیوی تھی۔ اس نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ ان کے آرام کا خیال رکھا۔ ان
کی فکر' ان کی پروا کی۔ انہیں جسمانی آسودگی فراہم کی لیکن اب وہ کہہ سکتے تھے کہ سلمہ نے
ان سے وہ محبت کبھی نہیں کی جو کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

اور اس کے بعد سلمہ بھی نہیں رہی۔ بس زندگی میں ایک خوشی آگئی' جس کا نام وحید
تھا۔ پھر اماں کی کھوئی ہوئی محبت انہیں دوبارہ مل گئی لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ
درحقیقت وہ بہت ناخوش' بہت ناآسودہ ہیں اس لئے کہ انہیں کبھی کوئی سچی خوشی ملی ہی
نہیں۔ آسودگی ملی تو وجود کے اس حصے تک محدود رہی' جسے جسم کہا جاتا ہے۔

اب انہوں نے ایک محبت کی روداد سنی تو انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کی تو عمر رائیگاں
گئی۔ پھر انہوں نے سوچا کہ جو ہوا سو ہوا۔ زندگی ایسی چیز نہیں کہ جسے پیچھے لوٹا کر دوبارہ
گزارا جا سکے لیکن اب وہ تصور تو کر سکتے ہیں۔ اگر انہیں اس طرح کی محبت ہو جائے۔ اگر وہ
بھی ایسی کیفیات سے گزریں۔ اگر انہیں بھی ڈر اور خوف لاحق ہو۔ کیسا تھرل ہو گا' کیسا اچھا
لگے گا۔

انہوں نے کن انکھیوں سے مدیحہ کو دیکھا۔ یہ لڑکی کتنی فکر مند' کتنی خوف زدہ' کتنی
الجھنوں میں گھری ہوئی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر کیسا اطمینان ہے۔ رخساروں پر خوشی کی
چمک ہے۔ آنکھوں میں کیسی سرشاری ہے۔

انہیں خود پر افسوس ہونے لگا۔ وہ اردو ادب کے شیدائی، شعر و شاعری کے
شوقین، مطالعہ کرنے والے اور اس چیز کا انکار کرتے رہے، جو شعر و ادب کا محور و مرکز
ہے۔ وہ حقیقت کو افسانہ قرار دیتے رہے۔ صرف اس لئے کہ انہیں اس کا تجربہ نہیں تھا۔

اب وہ سمجھ سکتے تھے کہ انہوں نے ادب کو فکشن سمجھ کر پڑھا' بڑا زیاں کیا۔

ان کی سوچ کا رخ بدلا۔ اب وہ صورتحال کو دوسرے زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مدیحہ کو اس بدلی ہوئی صورتحال میں دیکھا.... اور بہت غور سے دیکھا۔ وہ بہت لڑکی تھی۔ کم عمر تھی۔ مگر اپنی عمر سے بڑھ کر سوچتی اور باتیں کرتی تھی۔ اس کے پاس تھی۔ مطالعے کی گہرائی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس سے باتیں کرتے رہو اور وقت گزر احساس بھی نہ ہو۔ عام لڑکیوں کی طرح اس میں سطحیت نہیں تھی۔ وہ بہت شیریں بہت دل نشین گفتگو کرتی تھی۔ ظاہری حسن میں بھی وہ کم نہیں تھی۔ قدرت نوازتے وقت بڑی فیاضی برتی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔

اور اس پر محبت کی.... اور وہ بھی ایسی محبت کی خوب صورتی.... وہ کہہ سکتے لڑکی بے مثال ہے۔ اور یہ لڑکی اپنے محبوب پر اپنی ایسی خوبصورت اور پاکیزہ محبت کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ اسے خوف ہے کہ اس کے اظہار کے نتیجے میں یہ سب کچھ جائے گا۔ یہ اپنے محبوب کی نظروں سے گر جائے گی۔ اس کا محبوب اسے ٹھکرا د خوف کیوں؟ کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو ایسی محبت کو قبول کرنے سے انکار کرے گا۔ پیاری لڑکی کو ٹھکرا دے گا۔ ایسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خوش نصیب پر تو ہر شخص آئے گا۔ مجھے بھی.... ہاں' مجھے بھی!

سوچ کا رخ بدلا۔ انہوں نے سوچا' اگر اس طرح کی کوئی لڑکی اب سے پندرہ ان سے اس طرح کی محبت کرتی تو وہ کیا کرتے؟ اسے نظروں سے گرا دیتے؟ اسے ٹھکر ہرگز نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اسے قبول کرتے' سر آنکھوں پر بٹھاتے اور ا پانے کے بعد ان کے پاؤں زمین پر ہی نہ ٹکتے اور ان کی زندگی کتنی خوبصورت' کتنی کتنی بامعنی ہوتی۔ کتنی مختلف ہوتی۔ مگر ایسا ہوا ہی نہیں' انہیں محبت ملی ہی نہیں' محرومی ہے یہ۔

وہ چونکے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ ہر آدمی کا یہ معاملہ ہوتا ہے کہ بہت نہیں مل پاتا۔ اور وہ تو بہت خوش نصیب ہوتا ہے جسے محرومی کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ کے حصار میں محرومی کی اذیت سے محفوظ رہتا ہے۔ میں بھی محفوظ رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ محبت ایسی چیز ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو ملتی بھی ہے۔

مگر اب..... زندگی کے اس موڑ پر محرومی کا یہ احساس' جبکہ اس کا ازالہ بھی ممکن نہیں۔ یہ تو بہت بڑا عذاب ہے اور اگر یہ باقی عمر ساتھ رہا تو بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اب عمر کے اس حصے میں مجھے اس انداز میں سوچنے سے بچنا چاہئے۔

لیکن انہیں لگتا تھا کہ وہ اس محبت کو.... اور اپنی محرومی کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

انہوں نے ذہن سے ہر سوچ کو جھٹکا اور دھیان اِدھر اُدھر کرنے کے لئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

☆

مدیحہ' حمید احمد کے بارے میں سوچ رہی تھی!

وہ جیسے اس کے تصور میں تھے' اس سے کہیں بڑے انسان ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کتنے مخلص تھے' کتنی محبت کرتے تھے۔ وہ انہیں علم سے لے کر محبت تک سب کچھ دیتے تھے اور جواب میں کچھ بھی نہیں مانگتے تھے۔ وہ دوسروں کو خوشیوں کی راہ دکھاتے تھے۔ جبکہ خود محروم تھے۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے۔ جبکہ اپنا راستہ انہوں نے بڑی محنت مشقت سے بنایا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود کو چھپا کر رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے محروم انسان ہیں۔ وہ اپنے حال پر قانع تھے۔ زندگی سے انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔

مدیحہ کو فخر ہونے لگا کہ اسے ایسے عظیم انسان سے محبت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ آج ان پر اپنی محبت کا اظہار کر دے گی مگر اس کے بارے میں سوچ کر اسے اب بھی ڈر لگ رہا تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اس سے خفا ہو جائیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ زندگی یونہی گزار دی جائے اور خود انہوں نے ہی تو کہا تھا کہ یہ سب کچھ بن مانگے ملا ہے اور بن چاہے چھن بھی سکتا ہے۔ سچ تو ہے' جس نے محبت دی ہے' آگے بھی اسی کا فیصلہ' اسی کی مرضی چلے گی۔ جو وہ چاہے گا' ہوگا.... ہو کر رہے گا۔ اس سے تو بچا نہیں جا سکتا۔ یوں ہونا ہے تو ہونا ہے۔ ڈرنا کیا' بہنا ہے تو بہہ جاؤ۔ اب یہ مقدر لکھنے والے کی مرضی کہ تمہیں بھنور عطا کرے یا ساحل۔

پھر اسے خیال آیا کہ حمید احمد نے اور بھی تو بہت کچھ کہا تھا۔ اسے یاد تھا۔ انہوں نے اس

کی محبت کو بہت سچا اور عظیم جذبہ قرار دیا تھا اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اچھی چیز بری نہیں لگتی۔ تو پھر وہ اس کے اس جذبے کو کیسے رد کریں گے، جسے وہ خود سچا اور عظیم کہہ چکے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اچھی چیز کسی کو بری لگے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اچھی چیز کا مستحق نہیں۔ پھر ایسے کی نظروں سے گرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہ آخری بات بے حد حوصلہ افزا تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج کا موقع ضائع نہیں کرے گی۔

☆

مدیحہ اپنا ہینڈ بیگ کھول رہی تھی کہ حمید احمد نے اشارے سے اسے روک دیا۔ پھر انہوں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے سامنے کی طرف دیکھا۔ "وہ پل ہے نا۔" انہوں نے پل کی طرف اشارہ کیا۔

"جی سر!"

"ہمیں ادھر ہی جانا ہے۔"

"آپ واپس چلے جائیں سر۔" مدیحہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تو میں تمہیں گھر پہنچا کر ہی جاؤں گا۔ وہ دیکھ رہی ہو؟"

"جی سر!" اور وہ دیکھ رہی تھی۔ آگے ذرا دور تو سڑک نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد تک پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بارش تیز اور مسلسل ہوئی تھی۔ ایسے میں پانی تو اکٹھا ہونا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ وہ اس کے تصور سے زیادہ ہی تھا۔

"یہ ہے تمہارا ایڈونچر۔" ان کے لہجے میں تلخی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ "دیکھا ہے کہ ہے۔"

"میں اس طرح کی صورت حال میں آتی جاتی رہی ہوں سر۔ کم و بیش اتنا ہی پانی ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ "آپ خود کو کیوں پھنساتے ہیں۔"

"میں زیادہ پانی' تمہارے حساب سے کہہ رہا ہوں۔ تم کیا سمجھ رہی ہو۔ میں ادھر کبھی نہیں چلا۔" حمید احمد بولے۔ "چلو.... ذرا احتیاط سے' بہاؤ بہت تیز ہے۔"

پانی کا بہاؤ گورا قبرستان کی دیوار کی طرف سے مخالف سمت تھا.... اور واقعی کافی تیز تھا اور وہاں کوئی تھا بھی نہیں کہ انہیں پانی کی گہرائی کا اندازہ ہوتا۔ "میں آگے جاتا ہوں

پانی کا اندازہ ہو اور تم میرا ہاتھ تھام لینا۔" حمید احمد نے کہا۔ انہوں نے پائنچے چڑھا لئے تھے۔ چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا۔ پہلے پانی ٹخنوں سے ذرا اوپر تھا مگر آگے جا کر وہ گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ حمید احمد آگے تھے اور انہوں نے پیچھے آتی ہوئی مدیحہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ یعنی وہ ترچھے ہو کر چل رہے تھے۔ ان کا چہرہ گورا قبرستان کی طرف تھا اور رخ کالا پل کی جانب۔ "پاؤں جما کر چلنا اور قدم وہیں رکھنے کی کوشش کرنا۔ جہاں میرے قدم پڑے ہوں۔" انہوں نے مدیحہ کو ہدایت کی۔ "ڈھکنوں سے محروم مین ہول کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کو تو بڑا تجربہ ہے سر۔" مدیحہ نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" حمید احمد کا لہجہ خوشگوار تھا۔ "اسی لئے تو بارش مجھے اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ پہلے تو مجھے بارش سے نفرت تھی۔"

"ایسی خوب صورت چیز سے نفرت!" مدیحہ کو شاک لگا۔

"جو چیز بقا کے لئے خطرناک ہو' اس سے آدمی نفرت ہی کرتا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں سر۔"

"میرے پاس دو حوالے ہیں بارش کے.... جھگی والا اور فٹ پاتھ والا، اور میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ کون سا زیادہ خطرناک تھا۔ جھگی کے دنوں میں بارش ہوتی تو احساس ہوتا کہ جس چھت کی وجہ سے تحفظ کا احساس ہو رہا ہے' وہ بس برائے نام چھت ہے.... چھت کا گمان۔ آسمان سے برسنے والا پانی پوری مقدار میں نیچے پہنچتا ہے۔ بس درمیان میں ایک سیکنڈ کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نیچے سے پانی سیلاب کی طرح جھونپڑی میں گھس آتا ہے۔ حالانکہ جھونپڑی پہاڑی پر تھی۔ پہاڑی کیا، ٹیلہ کہو۔ بہر حال اللہ کا کرم تھا۔ ہمیں دو چارپائیاں میسر تھیں۔ بڑی چارپائی نیچے بچھاتے تھے۔ چھوٹی چارپائی کو اس کے اوپر بچھا کر اس پر دری ڈال دیتے تھے۔ ایک مچان سا بن جاتا تھا۔ اس مچان پر میں اور اماں بیٹھے اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ بجلی کڑکتی اور چمکتی تو گرد و پیش بہت خوفناک لگتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چھت ختم ہی ہو گئی۔ ایک بار تو جھونپڑی ہی بہہ گئی تھی اور ہمارا پلنگوں والا مچان کشتی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ پھر فٹ پاتھ کا تجربہ ہوا۔ اس تجربے میں' میں اکیلا تھا۔ اماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس میں یہ ہوتا کہ سوتے سوتے اچانک احساس ہوتا کہ آسمان پھٹ پڑا ہے۔

میں گہری نیند سوتا تھا۔ بوندا باندی کا تو احساس بھی نہیں ہوتا تھا مگر تیز بارش سے
آنکھ کھلتی تو عقل خبط ہو جاتی۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ سمجھ میں
آتے بھیگ چکا ہوتا۔ تب کہیں پناہ کی تلاش میں بھاگتا۔ بجلی چمکتی تو سامنے نظر آتی۔
مجھ پر ہی گرنے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ بہت خوف آتا تھا۔" انہوں نے گہری سانس
"اب سوچتا ہوں' تب بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ جھگی میں قید ہونے کا' دنیا سے کٹ جانے
احساس بہت خوف ناک لمحہ ہوتا تھا۔ جبکہ فٹ پاتھ کھلی اور بہت بڑی دنیا تھی۔ جھگی میں
کہیں بھاگ نہیں سکتے تھے۔ تن بہ تقدیر ساکت و صامت بیٹھے رہتے تھے۔ فٹ پاتھ پر
کبھی اِدھر بھاگتا، کبھی اُدھر، بعض اوقات کہیں پناہ نہ ہوتی۔ لگتا کہ اتنی بڑی دنیا بھی
تنگ ہو گئی ہے۔ عجیب بے بسی ہوتی تھی۔ جھگی میں کڑک اور چمک سے ڈر ضرور لگتا تھا
نہیں لگتا تھا کہ بس وہ ہمارے ہی لئے ہے اور اس برائے نام چھت اور بے نام دیواروں
بھی تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ جھگی میں بس ہم دونوں ہوتے تھے اور فٹ پاتھ پر مجھ جیسے
شمار بے گھر ایک جیسی تکلیف اٹھا رہے ہوتے تھے۔ جھگی میں بارش تھم جانے کے بعد
اماں سکون سے سو جاتے تھے۔ فٹ پاتھ پر بارش تھم جانے کے بعد بھی امان نہیں
سونے کے لئے کہیں کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ہر جگہ پانی کھڑا ہوتا تھا۔ بعض اوقات میں
دیوار سے ٹک کر کھڑے ہی کھڑے سو جاتا تھا۔" انہوں نے پھر گہری سانس لی۔ "اب
مجھ سے کہے کہ تمہارے پاس دو ہی Option ہیں۔ بولو' جھگی میں رہو گے یا فٹ پاتھ
تو اب بھی میں فیصلہ نہیں کر سکوں گا کہ دونوں میں سے کون سی جگہ بہتر ہے۔"

مدیحہ حیران تھی۔ زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے' اسے معلوم ہی نہیں تھا' ایسا کہ
صورتی بھی بری لگنے لگے۔ ایسی تکلیفیں' ایسا خوف' ایسی بے یقینی کہ آدمی کو معلوم ہی
ہو کہ اگلے پل اس کے لئے زندگی ہے یا موت اور اس خوب صورت زندہ شخص کی گہرائی
کوئی حد بھی ہے۔ کیا کچھ دیکھا' کتنا کچھ سہا ہے اس نے۔ اسے دیکھ کر اس سے باتیں کر
بھی کوئی سوچ نہیں سکتا۔ ہاں وہ خود ہی بتا دے تو الگ بات ہے۔

اسی لمحے ایک جھٹکے نے اسے چونکا دیا۔ بلکہ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ سوچوں کی میں
بے دھیانی میں وہ بہاؤ کے خلاف مدافعت کم کر بیٹھی تھی۔ اس کے قدم حمید احمد کے
ہوئے راستے سے ہٹ گئے پھر کسی قوت نے اسے بائیں جانب کھینچا۔ جھٹکا بہت شدید

ں کا داہنا ہاتھ حمید احمد کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ وہ لڑکھڑائی تو حمید احمد بھی لڑکھڑا گئے۔
اگلا لمحہ بے حد خوف ناک تھا۔ اسے احساس ہوا کہ پانی کے اندر اس کے پیروں کے نیچے
نت سڑک نہیں رہی ہے۔ اس کے بائیں پاؤں کے نیچے پانی ہی پانی تھا۔ پاؤں کے ٹکنے کے
لئے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی اور پانی اسے اندر کھینچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ مین ہول
بھنور ہے جو اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ منہ سے چیخ نکل گئی۔
سے اتنا احساس تھا کہ اس کا ہاتھ اب بھی حمید احمد کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کے پاس انہیں
بھنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس کے مین ہول کی طرف کھنچنے کی رفتار کم ضرور ہو گئی تھی اور
ں کا سبب وہ مدافعت تھی' جس کا محور و مرکز حمید احمد تھے مگر ابھی وہ محفوظ نہیں تھی۔
یونکہ وہ اس طرف اب بھی کھینچ رہی تھی۔ حمید احمد نہ ہوتے تو وہ اب تک مین ہول میں جا
لی ہوتی۔

جھٹکا بہت اچانک تھا۔ حمید احمد بھی لڑکھڑا گئے مگر انہوں نے بہت تیزی سے خود کو
سنبھال لیا۔ انہوں نے صورتحال کو سمجھ لیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کا انہیں ڈر بھی تھا۔ وہ
ہت تیزی سے اپنے جسم کو پوزیشن میں لائے۔ انہوں نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر پاؤں
جمانے کی کوشش کی۔ بہت تیزی سے انہوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ فطری طور پر ان کا
دوسرا ہاتھ مدیحہ کے ہاتھ کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لینا
چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کو نیچے سڑک پر ٹکا دیا۔ انہوں نے یہ عقل
مندی نہ کی ہوتی تو محض لمحوں میں وہ بھی مدیحہ کے ساتھ مین ہول میں جا چکے ہوتے۔

اب وہ ایک ہاتھ اور دو پیروں کی مضبوطی سے خود کو کھنچنے سے روک رہے تھے اور
سیدھے ہاتھ سے انہوں نے بڑی مضبوطی سے مدیحہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ
مدیحہ کے ساتھ انچ انچ کر کے مین ہول کی طرف کھنچ رہے تھے۔ انہوں نے سانس روک لی
تھی۔ تاکہ طاقت مرتکز رہے، منتشر نہ ہو لیکن معاملہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

مدیحہ کا دوسرا پاؤں بھی اب مین ہول میں تھا۔ اسے موت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے
رہا تھا۔ کیونکہ وہ کمر تک مین ہول میں جا چکی تھی۔ سہارا بس اس کا تھا کہ حمید احمد نے اس کا
ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ ان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا ہاتھ دکھنے لگا تھا۔ یہی نہیں'
اس کا ہاتھ شاید چھل بھی گیا تھا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ کھینچنے والے پانی کا دباؤ اتنا خوفناک تھا کہ

بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ حمید احمد اسے چھوڑ دیں۔ ورنہ وہ بچ سکیں گے لیکن وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں تھی۔

ادھر حمید احمد نے سوچ لیا کہ اب آخری تدبیر ایک جھٹکے کی رہ گئی ہے۔ اس کوئی انسانی مدد بھی مل جائے تو بات بن سکتی ہے "مدیحہ ..... میری بات غور انہوں نے چیخ کر کہا۔ "تم پاؤں چلاتی رہو۔ ٹکانے کی کوئی جگہ مل جائے تو مضبوطی ٹکانے کی کوشش کرو۔"

مدیحہ تک ان کی بات پہنچ گئی۔ وہ پاؤں چلا کر اُدھر اُدھر ٹٹولنے لگی۔

حمید احمد نے سانس روک کر پوری قوت مرتکز کی' سڑک پر ٹکے ہوئے ہاتھ اس سے مدیحہ کے ہاتھ کو تھاما اور پوری قوت سے اسے باہر کی طرف کھینچا۔ خوش قسم اس سے محض ایک لمحہ پہلے مدیحہ کا پاؤں کسی چیز پر ٹک گیا تھا۔ وہ لگر تھی یا کچھ اور چل ہی نہیں سکتا تھا۔ بہر حال پاؤں ٹکنے سے وہ ٹھہر ضرور گئی۔ کھینچتے ہوئے پانی کا سے وہ آزاد ہو گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد جو حمید احمد نے اسے کھینچا تو وہ مین ہول آ گئی۔

وہ دونوں پانی میں گرے ہوئے ہانپتے رہے۔ جسموں کی تمام طاقت اور توانائی ختم تھی۔

پھر وہ اٹھے تو دونوں کے لباس اوپر تک بھیگ چکے تھے۔ وہ پل کی طرف چل دیے تھوڑی دور رہ گیا تھا۔

پل بھی گیلا تھا لیکن وہاں پانی جمع نہیں تھا۔ وہ پل کی ریلنگ سے ٹک کر کھڑے ان کی سانسیں اب بھی ہموار نہیں ہوئی تھیں۔

ذرا دیر بعد سانس بحال ہوئی تو حمید احمد نے پوچھا۔ "ایسا ایڈونچر پہلے کبھی ہوا تھا؟"

مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ آج میں یقیناً مر جاتی۔"

"اللہ نے ہمیں بچا لیا۔ حمید احمد نے جملے کی تصحیح کی۔ "ورنہ آج تم مجھے بھی تھیں اور تم ہمیشہ بارش میں اسی طرح گھومتی ہو۔ خوف زدہ بھی ہوتی ہو اور ڈرتی ہو تو اللہ سے تحفظ کی دعا کرتی ہو۔ آج وہ دعا کام آ گئی۔"

"سر' میں جب بھی ڈرتی تھی تو اللہ سے تحفظ کے ساتھ یہ دعا بھی کرتی تھی کہ

خطرے میں پڑوں تو مجھے کوئی محافظ بھی عطا فرما۔ میری دعا قبول ہو گئی۔"

حمید احمد نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔ "تم عجیب باتیں کرتی ہو مگر میرا مشورہ ہے کہ آئندہ ایسے ایڈونچر سے خود کو بچا کر رکھنا۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر بارش کا لطف اٹھایا کرو۔"

"اس سے پہلے میں آپ کے پچھلے مشورے پر عمل کروں گی سر۔"

"اب آگے چلیں؟" حمید احمد نے کہا پھر اس کا اثباتی اشارہ دیکھ کر اس کے ساتھ چل دیے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں' تم کس مشورے کی بات کر رہی ہو۔"

"وہی جو آپ نے آج مجھے دیا تھا.... میرے مسئلے کے سلسلے میں۔"

"اوہ وہ.... ہاں۔ پہلی فرصت میں اس پر عمل کرو۔"

اب وہ پل عبور کرنے والے تھے پل کے دوسری طرف بھی پانی تھا مگر زیادہ نہیں۔ اور خاصی چہل پہل بھی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔

"میں اسی وقت' اسی لمحے آپ کے مشورے پر عمل کر رہی ہوں۔"

حمید احمد نے اسے غور سے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں الجھن تھی۔ "اس وقت! کیسے؟"

"میں اعتراف کر رہی ہوں کہ آپ وہ ہیں، جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔"

وہ مین ہول کے بھنور کے جھٹکے سے کہیں شدید جھٹکا تھا۔ حمید احمد چلتے چلتے پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گئے۔ مدیحہ دو قدم آگے جا چکی تھی۔ وہ پلٹ کر ان کے پاس آئی۔ "کیا ہوا سر؟"

"تمہیں مذاق میں بھی ایسا نہیں کہنا چاہئے۔" حمید احمد نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"مذاق نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔" مدیحہ نے بے حد اعتماد سے کہا۔ اب بات منہ سے نکل چکی تھی۔ نتیجہ جو بھی ہو۔ اب تھوڑی دیر بعد کچھ بھی غیر یقینی نہیں ہو گا۔

"اگر یہ سچ ہے تو بہت مکروہ سچ ہے۔" حمید احمد کی بات بہت سخت لگی۔ اس لئے کہ ان کے لہجے میں غصہ نہیں تھا۔ "یہ کہنا تو بہت دور کی بات ہے۔ تمہیں ایسا سوچنے کی ہمت بھی کیسے ہوئی؟"

مدیحہ کو یہ سن کر تھرا جانا چاہئے تھا۔ لرز جانا چاہئے تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نجانے

کہاں سے اسے باطنی قوت مل گئی۔ "کیوں؟ یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے۔"

"میں اسے گناہ سمجھتا ہوں۔"

"آپ کوئی برے آدمی نہیں کہ میرا آپ سے محبت کرنا گناہ ہو اور میں بھی ہوں۔ یہ آپ خود کہہ چکے ہیں اور میری محبت بھی بری نہیں ہے۔" مدیحہ بہت کہہ رہی تھی۔ "آپ کو شاید یاد نہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ میرا جذبہ بہت سچا اور میری محبت پاکیزہ ہے۔ تو اب کیا ہو گیا۔"

"میں نے کہا تھا مگر اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا ہدف میں ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے سر۔ اس سے میری محبت کی ہیئت بدل گئی؟"

"بالکل بدل گئی۔ اہمیت اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ آپ کیسی محبت، کس سے ہیں۔ کوئی بیٹی اپنے باپ سے ایسی محبت تو نہیں کر سکتی۔ وہ تو گناہ ہی کہلائے گا۔"

مدیحہ کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "نہ آپ میرے باپ ہیں۔ نہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"میں استاد ہونے کی حیثیت سے خود کو اپنے سٹوڈنٹس کا باپ سمجھتا ہوں سٹوڈنٹس کو اولاد کا درجہ دیتا ہوں۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا سر! اگر آپ خود کو میرے باپ کی جگہ سمجھتے ہیں او بھی لیتی ہوں۔ تب بھی آپ میرے باپ نہیں بن سکتے اور میں تو ایسا سمجھتی ہ دیکھئے سر! درجہ دینا اور بات ہے اور حقیقی رشتہ ہونا اور ہے۔ اسے گڈمڈ کرنا درست

حمید احمد کو غصہ آگیا۔ "اول فول مت بکو۔ یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے اور ہے۔"

"دیکھیں سر! میں ایک التجا کرتی ہوں آپ سے۔ آج کے ..... صرف آج مدیحہ نے بے حد لجاجت سے کہا۔ "آپ علم اور تدریس کے آدمی ہیں۔ غصہ نہ علمی بحث سمجھ کر ٹھنڈے دل سے گفتگو کیجئے۔ غصہ تو عجز استدلال کی دلیل ہوتا سے میں اس کی توقع نہیں کرتی۔"

اس کے لہجے نے، اس کی موثر بات نے حمید احمد کو شرمندہ کر دیا۔ "سوری۔ ہو گیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ یہ میرے معاملہ ہے۔"

"یہ بات نہ کرنا بھی عجز استدلال ہے سر! اور آپ کا اصول حرفِ آخر تو نہیں۔ ممکن ہے وہ غلط ثابت ہو۔"

"پھر بھی میں اس سے دستبردار نہیں ہوں گا۔"

"یہ ہٹ دھرمی ہے سر! اور ہٹ دھرمی اہل علم کو زیب نہیں دیتی۔"

وہ کم عمر لڑکی حمید احمد کو عاجز کئے دے رہی تھی۔ انہوں نے زچ ہو کر کہا۔ "تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ چاہے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کریں لیکن میری بات تو سن لیں۔ ممکن ہے، آج نہیں..... لیکن پھر کبھی آپ کی سمجھ میں آجائے۔"

"یہ ناممکن ہے لیکن ٹھیک ہے۔ تم بات کرو۔"

"شکریہ سر!" مدیحہ نے بے حد خلوص اور احترام سے کہا۔ "آپ کالج میں گفتگو کے دوران میں میری محبت کو پاکیزہ اور قابل احترام قرار دے چکے تھے۔ اب وہ گناہ کیسے ہو گئی؟"

"میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔" حمید احمد نے سرد لہجے میں کہا۔

"لیکن سر! کوئی لڑکی کبھی اپنے باپ سے اس طرح محبت نہیں کر سکتی۔ ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو گا۔ اگر ہوا تو وہ لڑکی یقیناً جنون یا باطنی کجی..... بلکہ بے راہ روی میں مبتلا ہو گی۔ وہ نارمل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ بات غیر فطری ہے۔ اب آپ بتائیں، آپ مجھے نارمل لڑکی سمجھتے ہیں یا بے راہ رو۔"

حمید احمد کو بے بسی کا احساس ستانے لگا۔ لڑکی کا استدلال معقول تھا۔ "اگر تم اپنی محبت پر اصرار کرتی ہو تو میں تو تمہیں بے راہ رو ہی سمجھوں گا۔"

"میں تو" کہہ کر آپ نے اپنی جانب داری تسلیم کر لی۔ یعنی اس کا فیصلہ ہمیں کچھ غیر جانب دار لوگوں سے کرانا ہو گا لیکن اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔" مدیحہ نے کہا۔ "ابھی آپ اصول کی بات کر رہے تھے اور اس سے پہلے آپ کی باتوں سے پتہ چلا کہ بچپن سے اب تک آپ بقا کی جنگ لڑتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں SURVIVAL INSTINCT کے تحت جینے والوں کے نزدیک کسی اصول کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اہمیت ان کی بقا کی، ان کی ضرورت کی اور ان کی خوشی کی ہوتی ہے۔ اس کی خاطر وہ اپنے اصول تو کیا، معاشرے کے مروجہ اصول بھی پامال کر دیتے ہیں۔"

"میں نے بقا کی جنگ لڑی لیکن اب میں حالت جنگ میں نہیں ہوں۔" حمید احم
نہایت اطمینان سے کہا۔ "اب میں بہت کچھ حاصل کر کے SATTLE ہو چکا ہوں
نے دو بڑی چیزیں حاصل کی ہیں۔ اپنا پروفیشن اور اپنا گھر۔ ان میں پروفیشن بہت اہم
میں کچھ نہیں تھا۔ میرے پیشے نے مجھے عزت دی۔ میری اہمت اس کی وجہ سے ہے
معاشرے میں مقام اس کے دم سے ہے۔ ورنہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔" انہوں نے
سانس لی۔ "مجھ جیسے جدوجہد کرنے والے جب کچھ پالیں تو اسے بہت مقدس جانتے
پوری قوت سے اس کے تقدس کا دفاع کرتے ہیں تو میں اپنے پروفیشن کو بدنام کر
مقابلے میں مرجانا قبول کروں گا۔ یہ SURVIVAL کا اصول ہے۔"

"اور آپ کے خیال میں' آپ میری محبت قبول کریں گے تو آپ کا پروفیشن
ہوگا؟"

"ظاہر ہے۔ اس سے استاد پر جو لوگوں کا اعتماد ہے' وہ مجروح ہوگا۔ میں اپنی بدنا
کر سکتا ہوں۔ اپنے پروفیشن کی نہیں۔"

"اور اگر یہ پوزیشن تبدیل ہو جائے تو۔ میرا مطلب ہے' میں آپ کی شاگرد
میرے استاد نہ رہیں تو؟" مدیحہ نے سوال اٹھایا۔

"تو کیا؟"

"تب آپ میری محبت قبول کرلیں گے؟"

"نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں اس سے میرے لئے مسائل
گے۔"

"اس کے باوجود کہ یہ بہت سچا اور عظیم جذبہ ہے۔" مدیحہ کا لہجہ چبھنے والا تھا۔

"ہاں لیکن ضرورت کے بغیر کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔" حمید احمد نے سرد
کہا۔ "کسی کو زندگی کی طلب نہیں تو اسے آب حیات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"تو جذبے کی عظمت اور سچائی بے کار ہے؟"

"نہیں' وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔"

"اس کا کیا فائدہ۔ اگر لوگ اسے لائق احترام' باعثِ فخر ہی نہ سمجھیں۔"

"اب یہ تو افراد کا رد عمل ہے اور اس سے اس کی عظمت مجروح نہیں ہوتی۔

بات یہ کہ طلب کی آلودگی اس کی ذمے دار ہے۔ طلب نہ ہوتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔"
مدیحہ چپ ہو گئی۔ یہ بات تو بالکل درست تھی پھر اس نے کہا۔ "اچھا.... آپ لیکچرار نہ
ہوتے' کچھ اور ہوتے تو کیا ہوتا۔"

"تو بھی میں اسے قبول نہ کرتا۔" حمید احمد بولے۔ "دیکھو مدیحہ، اہمیت اس بات کی
نہیں کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اہمیت اس کی ہے کہ وہ جسے دیا جارہا ہے' اس کے لئے ہے یا
نہیں۔ یہ عام معاملہ ہوتا تب بھی نہیں بنتا۔ کیونکہ میری اور تمہاری عمر میں بہت زیادہ فرق
ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کہیں پڑتا ہے' کہیں نہیں پڑتا۔ تم ہی نے کہا تھا کہ مغرب کی اپنی معاشرت ہے....
ہماری معاشرت سے مختلف۔ اب مغرب کی بات کرو تو وہاں ساٹھ سالہ پروفیسر اپنی سولہ
سالہ سٹوڈنٹ سے شادی کر لیتا ہے اور کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ وہاں کوئی عمر کے فرق کو
نہیں دیکھتا لیکن یہاں بات اور ہے۔ یہاں کوئی شخص خود سے بیس سال چھوٹی لڑکی سے شادی
کرلے تو وہ تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

اب مدیحہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ "تو لوگوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ انسانی
خوشیوں سے بھی زیادہ۔"

"بالکل ہے۔ انسان معاشرتی جانور ہے۔" حمید احمد نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "جہاں گنجا
ہونا معیوب ہو' وہاں لوگ گنجے نہیں ہوتے۔ افریقہ کے بعض قبائل میں لباس کا رواج نہیں
وہاں کوئی تن ڈھانپے تو معیوب ہوگا۔ معاشرے اسی طرح بنتے ہیں۔"

مدیحہ چند لمحے سوچتی رہی۔ "سر.... آپ کی کہی ہوئی بہت سی باتوں کو میں درست
نہیں سمجھتی لیکن کیونکہ ہم دلیل سے بات کر رہے ہیں اور میری کم علمی میرے آڑے آرہی
ہے۔ اس لئے میں ان پر بحث کرنے سے بچ رہی ہوں۔"

"تمہارا یہ رویہ بالکل درست ہے۔" حمید احمد نے بے حد طمانیت سے کہا۔ اب وہ بے حد
پراعتماد ہو چکے تھے۔

"لیکن میں بتاؤں گی ضرور۔ میں نہیں مانتی کہ میں آپ سے محبت کروں اور آپ اسے
قبول کرلیں تو اس سے آپ کا پروفیشن بدنام ہوگا۔ میں یہ بھی نہیں مانتی کہ عمر کے اتنے

فرق کے ساتھ دو افراد کی شادی نہیں ہو سکتی اور اگر ہو تو کامیاب نہیں ہو گی۔ الر
معاشرہ اسے قبول نہیں کرے گا اور کبھی میں ان باتوں کو غلط بھی ثابت کردوں گی...

"یو آر ویل کم مگر فی الوقت تمہیں میری ایک بات ماننی ہو گی۔"

"کہئے سر۔"

"تم میرے لئے اپنی محبت کو ختم کردو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے سر۔"

"کیوں؟"

"اس پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں اور خود آپ نے کہا نعمت تو مجھے بغیر کوشش اور ریاضت کے عطا کر دی گئی ہے اور میں جس رو میں ہوں۔ اس میں بہنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔ تو میں اسے ختم کرنے کا اخ نہیں رکھتی۔"

"تو پھر تم اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرو۔ تمہارے کسی انداز سے بھی یہ کہا نہیں ہونی چاہئے۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے سر۔ آدمی بے اختیار ہو تو اس بات کی ضمانت کیسے د ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ بات دوسروں پر کھل گئی تو بلا وجہ اسکینڈل بنے گا۔ کئے بغیر اس میں ملوث ہوں گا اور میرا پروفیشن میری خطا کے بغیر بدنام ہو گا۔ صرف وجہ ہے۔"

"میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کا حکم ٹال ہی نہیں سکتی تھی۔" مدیحہ کے لہجے بسی تھی۔ "میں کیا کر سکتی ہوں سر؟ میں کیا کروں؟"

"تو پھر مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ میں تمہیں کالج سے EXPELL کرادوں گا۔"

مدیحہ نے نظریں اٹھائیں اور بڑے غور سے انہیں دیکھا۔ "واقعی سر؟"

"ہاں۔ میں یہی کروں گا۔"

"ایک بار اور کہیں سر۔" مدیحہ کا لہجہ اشتعال دلانے والا تھا۔

"میں تمہیں واقعتاً کالج سے EXPELL کرادوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!مدیحہ نے گہری سانس لی۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بے راہ رو کہا تھا۔ میری توہین کی تھی۔ مجھے گالی دی تھی اور میں نے کہا تھا کہ اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ہمیں اس کا فیصلہ غیر جانب دار لوگوں سے کرانا ہو گا۔ ان کا انتخاب بے شک آپ کر لیں۔ میں ان سے پوچھوں گی کہ کیا میرا آپ سے پاکیزہ محبت کرنا میری بے راہ روی کی دلیل ہے؟ کیا میرے استاد ہونے کی حیثیت سے آپ میرے حقیقی باپ بن گئے اور میں آپ کی بیٹی بن گئی؟" اس نے حمید احمد کو غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ "لیکن میں ایسا نہیں کروں گی سر! اس لئے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کی جتنی توہین ہو گئی' اس سے زیادہ میں ہونے نہیں دوں گی اور سر! اس لئے بھی کہ میں بدنامی اور رسوائی سے ہمیشہ ڈرتی رہی ہوں اور آپ کی بدنامی اور رسوائی تو میں گوارا کر ہی نہیں سکتی۔ اس کے مقابلے میں مجھے "بے راہ روی' کی گالی خاموشی سے قبول کر لینا گوارا ہے اور سر! آپ کو مجھے EXPELL کرانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود کالج چھوڑ دوں گی۔ اب آپ مجھے کالج میں کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اس لئے کہ مجھے EXPELL کرانے کے لئے آپ کو وجوہات بیان کرنی ہوں گی۔ سیکنڈل تو اس سے بھی بنے گا۔"

"لیکن مدیحہ...."

"اب آپ کچھ نہ کہیں۔" مدیحہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "خوش ہو جائیں کہ آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں جھوٹا وعدہ کبھی نہیں کرتی۔ ہاں' ایک بات ضرور پوچھوں گی۔ اگر آپ کو بھی مجھ سے ایسی ہی محبت ہو گئی ہوتی' جیسی مجھے آپ سے ہے تو آپ کیا کرتے؟"

"یہ سوال خلاف واقعہ ہے؟"

"سر ہم ایک علمی گفتگو کر رہے ہیں اور یہ ایک مفروضہ ہے۔"

حمید احمد چند لمحے سوچتے رہے۔ "میں اپنا پروفیشن چھوڑ دیتا اور تمہیں اپنا لیتا۔"

"شکریہ سر۔ آپ کا پہلا جواب ہے' جو مجھے اچھا لگا۔ ایک بات اور بتا دیں۔ آپ خود کو سچا اور HONEST انسان سمجھتے ہیں؟"

"صرف سمجھتا نہیں ہوں۔ میں سچا اور HONEST ہوں بھی۔"

"کبھی آپ کو یہ احساس ہوا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے تو آپ میرے سامنے اس کا اعتراف کریں گے؟"

حمید احمد بھڑک گئے۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا...."

"یہ علمی گفتگو ہے سر اور یہ ایک مفروضہ ہے۔ آپ میری بات کا سچائی کے سا جواب دیجئے۔"

حمید احمد نے بے بسی سے سر جھٹکا۔ "خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکچرار شپ چھوڑ دوں گا۔"

"یہ وعدہ ہے آپ کا؟" مدیحہ نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بے شک۔ یہ سچا اور پکا وعدہ ہے۔" حمید احمد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کہا۔"

"شکریہ سر! اب میں چلتی ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہیں گھر پہنچا کر ہی واپس آؤں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اسی لئے تو آیا ہوں...." وہ اس کے ساتھ چلنے لگے۔

"میں خود چلی جاؤں گی سر۔ آپ زحمت نہ کریں۔" مدیحہ کے لہجے میں قطعیت تھ "ورنہ میں نے شور مچا دیا کہ آپ زبردستی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو خود سوچئے کے اور آپ کے پروفیشن کے وقار کا کیا ہوگا۔"

حمید احمد کے پاؤں پتھر کے ہو گئے۔ وہ شاک کے عالم میں اسے دیکھتے رہے۔

"اللہ حافظ سر۔ شاید اب ہم کبھی نہ ملیں اور یہ آپ کے لئے اچھا ہی ہے۔ خوش رہئ وہ کہتے کہتے رکی پھر ذرا توقف کے بعد بولی۔ "اتنا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اب کبھ ملے تو اس کا سبب آپ کی ہی کوئی ضرورت ہو گی۔ میری نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔

حمید احمد بت بنے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ جاتے جاتے پلٹی اور دوبارہ ان کے پا آکر کھڑی ہوئی۔ "اقبال کا ایک شعر آپ کی نذر کرتی ہوں حمید صاحب۔ یہ میرے دل دعا بن کر نکلا ہے۔" حمید احمد دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ اس نے "سر" کا رشتہ توڑ دیا تھا وہ اس کے لئے حمید صاحب تھے.... حمد احمد!

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور چل دی۔ اس بار وہ مضبوطی سے قدم رکھ رہی تھی۔ جیسے نہ اب کچھ کہنا ہے، نہ پلٹ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت رہ گئی ہے۔

حمید احمد وہیں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ وہ پل سے اتری اور ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کے درمیان بڑھتی رہی پھر وہ موڑ مڑ کر ان کی نظروں سے او جھل ہو گئی۔

حمید احمد بھی پلٹے مگر فوراً ہی ٹھٹک گئے۔ وہ حیرت ہی ایسی تھی۔ ان کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ اب یہ لڑکی کبھی مجھے نہیں ملے گی۔ میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ ان کا دل اداسی سے بھر گیا۔ ان کے ذہن میں ایک شعر گردش کر رہا تھا....

آواز دے کے دیکھ لو' شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

مگر وہ جانتے تھے کہ اب ان کی آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی!

☆

حمید احمد کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہرے سمندر میں ہیں۔ پانی ان کے سینے پر دباؤ رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں سینہ دکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے لیکن کھو پاتے۔ ظاہر ہے، پانی میں آنکھیں کیسے کھلیں گی۔

پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ بار بار ڈوب اور ابھر رہے ہیں۔ اوپر آتے آتے نیچے جاتے ہیں۔ اب انہیں پانی کا شور سنائی بھی دے رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ سمندر میں نہیں، اپنے گھر میں، اپنے کمرے میں تھے۔ سینہ ویسے ہی دکھ رہا تھا۔ جیسے پانی اس پر دباؤ ڈال رہا ہو۔ پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ پانی کہیں تھا نہیں۔

یہ سمجھنے میں انہیں کچھ دیر لگی کہ شور پانی کا نہیں، ان کی سانسوں کا ہے۔ انہوں نے کی کوشش کی تو ان پر قیامت گزر گئی۔ محض ذرا سا ہلنے سے سینہ اتنی بری طرح دکھا ساختہ ان کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ بستر پر ڈھے گئے۔

اماں دوڑی ہوئی آئیں۔ شاید انہوں نے ان کی چیخ سن لی تھی۔ "شکر ہے، تمہاری کھلی۔" انہوں نے کہا۔ "اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔"

"مجھے ہوا کیا ہے اماں؟"

"بھیگے ہوئے آئے تھے۔ بخار میں پھنک رہے تھے۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ نم اثر ہے۔"

نمونیا! وہ دہل گئے۔ یہ کیا ہو گیا؟

"کچھ کھاؤ گے؟" اماں نے پوچھا۔ "سینے کے گوشت کا سوپ بنا رہی ہوں تمہارے حریرہ بھی ہے۔"

حمید احمد نے بھوک محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن بھوک تھی ہی نہیں۔ "مجھے بھوک نہیں ہے اماں۔" انہوں نے کہا۔

"تم لیٹو۔ میں سوپ بنا لوں پھر آتی ہوں تمہارے پاس۔" یہ کہہ کر اماں چلی گئیں۔

وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے پھر انہیں یاد آ گیا۔ وہ مدیحہ کو چھوڑنے گئے تھے۔ مدیحہ چلی گئی تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ بھیگے تھے پھر وہ پانی کے سیلاب سے گزرے تھے۔ بارش جاری تھی۔ وہ پیدل چلتے رہے تھے۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ کھانسی آ رہی تھی۔ سینہ دکھنے لگا تھا۔ ان کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ وہ بس ارادے کے بل پر چل رہے تھے۔ ہر لمحے انہیں لگتا تھا کہ اب گر جائیں گے پھر انہیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ وہ گھر آئے تھے۔ دروازے تک آنا انہیں یاد تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

"اماں...." انہوں نے پکارنے کی کوشش کی۔ انہیں پھندا لگ گیا۔ سینے میں ٹیس سی اٹھی۔ یعنی وہ زور سے بولنے کے قابل نہیں تھے۔

اماں تک آواز پہنچ گئی تھی۔ وہ آ گئیں۔ "کیا بات ہے بیٹے؟"

"وحید کہاں ہے؟"

"سکول گیا ہے۔ وہ تو جا ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے زبردستی بھیجا ہے۔" اماں نے بتایا۔

"سکول؟ وقت کیا ہوا ہے؟"

اماں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "پونے گیارہ۔"

"اور میں کالج نہیں گیا؟"

"اسی لئے کہتے ہیں کہ بڑی بات نہیں کرنی چاہئے۔ اچھے لوگوں کو اس کی سزا ضرور ملتی ہے۔" اماں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "کل کہہ رہے تھے، میں نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ تو اللہ نے زبردستی کرا دی۔ اب ایسی حالت میں کالج کیسے جاتے۔ ابھی گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب آئیں گے۔ لیٹے رہو آرام سے۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے چیک کیا۔ بخار اتر گیا تھا۔ حمید احمد نے اسے سینے کی تکلیف کا بتایا۔ "وہ انفیکشن کی وجہ سے ہے۔ آپ بھیگے بہت ہوں گے۔"

"ہاں بھیگا تو تھا لیکن نمونیا....."

"تشویش کی بات نہیں۔ بس آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ بغیر ضرورت کے

بستر سے اتریئے گا بھی نہیں۔"

"کب تک؟"

"کم از کم ایک ہفتہ۔"

"ایک ہفتہ۔ یہ تو بہت ہے۔" حمید احمد پریشان ہو گئے۔

"دیکھئے' یہ ضروری ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے بات بڑھ بھی سکتی ہے۔" تنبیہی لہجے میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب! میں اسے ہلنے بھی نہیں دوں گی۔" اماں نے کی۔

"لیکن میرا کالج...."

ڈاکٹر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "ایک ہفتے باہر کی دنیا کو بھول جائیے۔"

حمید احمد نے مزید بحث نہیں کی۔ اب یہ سزا تو بھگتنی ہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب کر دیں گے میرا؟ میرے کالج فون کر کے اطلاع دے دیں۔"

"آپ نمبر لکھوا دیں۔ میں ابھی فون کر دوں گا۔"

حمید احمد نے نمبر لکھوا دیا۔ ڈاکٹر نے دواؤں اور پرہیز کے سلسلے میں ہدایات د کھڑا ہوا۔ "ویسے آپ بھی اب فون لگوا ہی لیں۔"

"ہمیشہ سوچتا ہوں لیکن موقع نہیں ملتا۔ اس بار اپلائی کر ہی دوں گا۔" حمید احم

"شکریہ ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اماں نے کہا۔ "اب تم اٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا اترنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

حمید احمد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کل سے اب تک اٹھارہ گھنٹے سے ان کی زندگی سے نکل گئے۔ ایسے کہ اس کا ایک لمحہ بھی انہیں یاد نہیں۔

☆

مدیحہ بستر پر بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ وہ کوئی روانی سے لکھی جانے والی ت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس بھیگے بھیگے خوب صورت دن کے ایک ایک لمحے کو ڈ محفوظ کر لینا چاہتی تھی' جو قسمت نے بتائے بغیر چپکے سے اس کی جھولی میں ڈال د

وجہ تھی کہ اس کے لکھنے کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ اس لمحے کو تصور میں دیکھتی' دوبارہ اسی لمحے کو جیتی' اس کے بارے میں سوچتی' جیسے اب اس کی خوب صورتی کو یادداشت میں سجا رہی ہو۔ اس کے بعد اختصار کے ساتھ اسے ڈائری میں لکھتی۔

یہ سوچتے ہوئے اس کے دل میں اداسی تیر جاتی کہ اب اس کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہیں آئے گا۔ اس کی محبت کا ڈراپ سین ہو چکا ہے.... نہیں.... یہ تو غلط ہے۔ اس نے فوراً ہی خود کو ٹوک دیا۔ میری محبت تو اب بھی وہی ہے۔

اس نے خود کو ٹٹولا.... گہرائی تک.... بہت باریک بینی سے پھر وہ بڑی طمانیت سے مسکرائی۔ یہ بھی غلط تھا کہ اس کی محبت اب بھی وہی تھی۔ وہ تو پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ اس کی محبت جس کے لئے ہے' وہ اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔

کہنے کو وہ صرف ایک دن تھا.... بلکہ دن بھی کیا' چند ساعتیں مگر وہ ساعتیں ایسی بھرپور تھیں کہ ان میں اس نے اپنے محبوب کو پوری طرح دیکھ لیا تھا۔ بہت قریب سے' بہت دور تک بہت اندر تک۔ اتنا تو کوئی کسی کو برسوں میں نہیں دیکھ پاتا۔ اسے خوشی تھی کہ حمید احمد بڑے آدمی نکلے۔ صاحب کردار!

اور وہ خوب صورت' بہت مکمل اور یادگار دن تھا۔ پوری زندگی جینے کے لئے ایسا ایک دن بھی بہت ہوتا ہے۔ وہ اپنے آغاز سے انجام تک بہت بڑا دن تھا۔ کہنے کو اس کا انجام الم ناک تھا لیکن درحقیقت یہ بات نہیں تھی۔ یہ تو اسے اس وقت پتہ چلا تھا کہ وہ ابتدا سے ہی جانتی تھی کہ یہی ہو گا مگر انجام کا خوف آرزو کرنے والوں کو آرزو کرنے سے.... ہاتھ بڑھانے سے تو نہیں روک سکتا۔

اور وہ اس انجام پر ناخوش بھی نہیں تھی۔ اس نے یہ بات شعور تک نہیں آنے دی تھی' لاشعور میں ہی چھپائی تھی کہ اس کی محبت پاکیزہ اور معصوم ہونے کے باوجود ایک بڑے انسان کو معیوب ہی لگے گی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر خود کالج چھوڑنے کی بات کی تھی اور آخر میں جو اس نے حمید احمد کو دم بخود کرنے والی باتیں کی تھیں تو کسی امید پر نہیں کی تھیں۔ اس کا محرک یہ احساس تھا کہ فرق صرف عمر کا نہیں ہے۔ پاکیزہ محبت کی وہ نعمت ملنے کے باوجود وہ باطنی طور پر بہت چھوٹی ہے اور حمید احمد بہت بڑے ہیں۔ کوئی جوڑ ہی نہیں ان کا لیکن جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے' اسی طرح وہ حمید احمد پر انمٹ آخری

نقش چھوڑنا چاہتی تھی.... ان پر بھرپور' نہ بھلایا جانے والا تاثر چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ
تھی کہ وہ اسے ہمیشہ یاد رکھیں اس حوالے سے۔ کبھی اسے بھلا نہ پائیں۔ اس میں ان کی
کی آزمائش بھی تھی.... مسلسل آزمائش!

ایک اور بات بھی تھی۔ اس کا دل اس ضدی بچے کی طرح تھا' جس نے سمجھ لیا ہو
چاند اسے نہیں مل سکتا۔ نہ وہ چاند تک جا سکتا ہے اور نہ چاند کبھی اس کے پاس آئے گا
پھر بھی چاند کے لئے ہمکتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس نے دعا کی تھی.... خدا تجھے کسی
سے آشنا کر دے۔

اور گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ اداس تھی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ اس کا
فائدہ نہیں تھا۔ جس دید کے لئے اس نے اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بند کر لیا تھا' اسے
کر کیا دیکھنا لیکن موڑ مڑنے کے بعد اس کے مزاج کا موسم بدل گیا۔ اداسی کی جگہ تشکر
لے لی۔ نوازنے والے نے کیسا نوازا تھا۔ جن بے شمار لمحوں کی خوب صورت یادیں وہ
جا رہی تھی' ان میں سے ایک.... صرف ایک لمحے کی بھی وہ مستحق نہیں تھی۔ حمید احمد
آدمی سے ایسا ایک بھی لمحہ ملنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی محبت جو چھوٹی ہو گئی تھی.... دھندلا گئی تھی۔ آنکھ
طلب کا کنکر گرنے کے بعد ایسا ہوا تھا مگر آج کی بارش نے بڑی نرمی سے یوں اس کنکر کو
کر آنکھوں کو دھویا تھا کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا اور اب اس کی محبت پہلے سے زیادہ
پہلے سے زیادہ شفاف ہو گئی تھی۔ اچھا ہوا کہ اس نے اظہار کی سبکی کے بدلے محبت کی
ہوئی عظمت خرید لی۔ اب یہ محبت عمر بھر اس کے ساتھ رہے گی اور وہ عمر بھر اس کے لئے
کا شکر ادا کرے گی۔

گھر پہنچ کر وہ گرم پانی سے نہائی اور اس نے کپڑے بدلے۔ پانی میں بھیگنے کی وجہ
کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ بستر پر گرے اور سب کچھ بھول جائے لیکن
یاد تھا کہ اس نے عمر بھر اللہ کا شکر ادا کرنے کا عہد کیا ہے۔ چنانچہ وہ شکر کے نفل ادا کر
کے لئے کھڑی ہو گئی۔

وہ نیت کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ لرز کر رہ گئی۔ دل میں بیک وقت دو خیال آئے
ایک تو یہ کہ شکر اختیاری ہے۔ لیکن پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اسے فرض کا تو خیال

نہیں اور وہ شکر کے نوافل کا ارادہ کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ عصر کے وقت فرض نماز کے
وہ سجدہ جائز ہی نہیں ہے۔
اس نے دل میں توبہ کی اور فرض نماز کی نیت کر لی۔ لیکن جو شکر اس کے اندر مچل رہا تھا
س کی تسلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس نے دعا میں صرف اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ اس نے سوچا،
شکر کے نفل عشاء کے بعد پڑھ لے گی۔
وہ ایک نئے معمول کا آغاز تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ معمول اب عمر بھر قائم رہے گا
اور اب وہ یادوں کے البم میں اس خوبصورت دن کے یادگار لمحوں کی تصویریں محفوظ کر رہی
تھی۔

☆

حمید احمد ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد کالج گئے تھے اور پہلی کلاس جو وہ لے رہے تھے' وہ سیکنڈ
ر کی تھی۔ کالج میں داخل ہوتے ہی انہیں سب کچھ اجنبی اجنبی لگنے لگا تھا۔ یہ لگتا ہی نہیں تھا
وہاں آنا ان کا روز کا معمول رہا ہو۔ وجہ ایک ہفتے کی دوری تھی جو ان کے لئے غیر معمولی
ت تھی۔ انہوں نے کبھی ایک دن کی چھٹی بھی نہیں کی تھی۔
وہ کلاس روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ طلبا اور طالبات کے
جانے پہچانے چہروں پر ان کے لئے فکر مندی ہے اور وہ بے سبب بھی نہیں تھی۔ صبح شیو
کرتے ہوئے انہوں نے آئینے میں خود کو دیکھا تو پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بہت کمزور لگ رہے
تھے۔

ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا۔ "یس خرم؟" انہوں نے کہا۔
خرم کھڑا ہو گیا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے سر؟"
"اللہ کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔" حمید احمد مسکرائے۔ "اسی لئے یہاں موجود ہوں۔"
"ہمیں دو دن پہلے پتہ چلا تھا سر! آج آپ نہ آتے تو ہم آپ کے گھر آپ کی مزاج پرسی
کے لئے آتے۔"
"میں شکر گزار ہوں آپ سب کا۔"
"ہم آپ کو مس کرتے رہے ہیں سر!" ایک اور لڑکے نے کہا۔
"شکریہ۔ میں نے بھی آپ سب کو مس کیا۔"

حمید احمد نے رجسٹر کھولا اور حاضری لینے لگے۔ مدیحہ حامد کا نام پکارتے ہوئے ایک بار ان کی زبان لڑکھڑائی۔ اس پورے عرصے میں پہلی بار انہیں خیال آیا.... یاد آیا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ آپ اب مجھے کالج میں نہیں دیکھیں گے سر!

ان کی نظر بے اختیار اس طرف اٹھی جہاں وہ بیٹھتی تھی مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ اس کی دوست نسرین البتہ موجود تھی اور انہیں پکارنے پر جواب بھی نہیں ملا تھا۔ تو کیا واقعی...

"مدیحہ حامد۔" انہوں نے دوبارہ پکارا۔

اس بار نسرین اٹھ کھڑی ہوئی "سر.... مدیحہ نے کالج چھوڑ دیا ہے۔"

"اوہ.... مجھے حیرت ہوئی۔" حمید احمد نے کہا۔ "ظاہر ہے، مجھے یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ میں کالج آ ہی نہیں رہا تھا۔" ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی الزام سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اس روز وہ ٹھیک سے پڑھا نہیں سکے۔ وجہ مدیحہ ہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھے۔ ان کے دل میں چور تھا۔ کالج چھوڑنے کا فیصلہ مدیحہ نے انہیں سنایا تھا.... اور اس دھمکی کے بعد سنایا تھا کہ وہ اسے کالج سے نکلوا دیں گے۔ اب انہیں یہ الجھن تھی کہ اس نے کسی سے اس موضوع پر بات تو نہیں کی۔ پرنسپل صاحب نے اس سے وجہ تو پوچھی ہوگی کالج چھوڑنے کی۔ تو کیا کہا ہوگا اس نے؟ اور نسرین اس کی بہت قریبی سہیلی تھی۔ ممکن ہے، اس نے نسرین سے اس سلسلے میں بات کی ہو....

انہوں نے کلاس سے معذرت کی کہ وہ ڈھنگ سے پڑھا نہیں سکے۔ "دراصل کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ ذہن کو کہیں مرکوز کرنے کی کوشش کروں تو چکر آتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی تھی۔

پیریڈ ختم ہوا تو انہوں نے نسرین سے کہا۔ "تمہارا کوئی پیریڈ خالی ہو تو مجھ سے ملنا۔ میں لائبریری میں ہوں گا۔"

خوش قسمتی سے اس روز ان کا کوئی اور پیریڈ نہیں تھا۔ اچھا تو یہی تھا کہ وہ گھر چلے جاتے اور آرام کرتے لیکن وہ جانتے تھے کہ دل کا چور انہیں آرام نہیں کرنے دے گا۔ وہ پریشان رہیں گے اور یہ ان کے لئے اور برا ہے۔ اطمینان کر کے گھر جانا ہی بہتر رہے گا۔

وہ لائبریری میں جا بیٹھے۔ وہاں بیٹھتے ہی انہیں مدیحہ یاد آئی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کتاب کی جگہ ایک ٹرے آ گئی.... لیجئے سر.... گرما گرم کافی پیجئے، پکوڑے کھائیے اور مطالعے دونوں کے لطف کو دوبالا کیجئے۔

پورے سات وہ کتاب کھولے بیٹھے رہے۔ ان سے ایک لفظ بھی پڑھا نہیں گیا۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ نسرین کب آئی اور کب ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ تو اس کی آواز سن کر چونکے۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا سر؟"

"ہاں۔" انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "وہ میں تم سے مدیحہ حامد کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ تو تمہاری بہت گہری دوست ہے۔"

"جی سر۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اس کی واحد دوست ہوں۔"

"یہ بتاؤ کہ اس نے اچانک کالج کیوں چھوڑ دیا۔ کوئی پرابلم تھی تو مجھے بتاتی۔ میں ٹیچر ہونے کے ساتھ بہت اچھا دوست بھی ہوں۔"

"وجہ اس نے مجھے بھی نہیں بتائی سر!" نسرین نے کہا۔ "وہ اس روز کالج میرے ساتھ آئی تھی پھر اس نے کہا کہ اسے آفس میں کوئی کام ہے۔ میں کلاس میں چلی گئی۔ اس کے بعد مجھے نہ وہ نظر آئی نہ اس کی گاڑی۔ میں کالج سے گھر پہنچی تو اس کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کالج چھوڑ دیا ہے۔"

"مگر اس نے کوئی وجہ تو بتائی ہو گی؟" دل کا چور اور بے چین ہو گیا۔

"اس نے بس اتنا کہا سر! کہ اب اس کالج میں دل نہیں لگتا۔" نسرین کے لہجے میں سچائی تھی پھر اس نے وضاحت کی۔ "وہ ایسی ہی ہے سر! اچانک بغیر کسی وجہ کے بہت بڑا فیصلہ کر لیتی ہے اور پھر اس پر ڈٹ جاتی ہے۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہیں نسرین۔ دیکھو کوئی مسئلہ ہو تو میں ہر طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔ اس تبدیلی سے اس کی پڑھائی یقیناً متاثر ہو گی۔"

"میں کم از کم آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتی سر۔ جو معلوم تھا، وہ آپ کو بتا دیا۔"

"ٹھیک ہے نسرین۔ شکریہ۔"

نسرین جانے لگی پھر وہ پلٹی۔ "سر.... مدیحہ کو کچھ کہلوانا چاہتے ہیں آپ؟"

حمید احمد فوراً چوکنے ہو گئے۔ "نہیں۔ اگر وہ فیصلہ کر چکی ہے اور اس پر ڈٹ بھی گئی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے۔"



اسی روز مدیحہ نے نسرین کو پھر فون کیا۔ "سچ' بہت بے مروت ہو۔" نسرین نے
ہی کہا۔ "کہاں تو روز کا ساتھ تھا.... اور کہاں فون بھی ایک ہفتے کے بعد...."

"شکایت تو مجھے کرنی چاہئے۔" مدیحہ نے کہا۔ "فون تو تمہارے گھر بھی ہے۔"

"سوری۔ واقعی غلطی تو میری ہے۔" نسرین کو احساس ہو گیا۔ "لیکن مدیحہ تم
اکیلا چھوڑ دیا۔"

"تمہیں کہاں اکیلا چھوڑا ہے۔ میں نے تو خود کو اکیلا کر لیا ہے۔" مدیحہ کے
اداسی تھی۔

"آج سر حمید نے کلاس لی تھی۔ پتا ہے، وہ ایک ہفتے کے بعد کالج آئے تھے۔"

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟" مدیحہ پریشان ہو گئی۔

"بارش میں بھیگ گئے تھے۔ نمونئے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ بہت کمز
ہیں...."

مدیحہ کے دل پر گھونسا سا لگا۔ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا تھا اور اسے یہ خیال
آیا۔ جاتے ہوئے بھی بھیگے ہوں گے بے چارے اور کون جانے' پیدل چلنا پڑا ہو

"اب ٹھیک ہیں نا؟"

ہاں۔ تمہارا پوچھ رہے تھے مجھ سے۔" نسرین نے سب کچھ بتا دیا پھر بولی۔ "
بتاؤ۔ تم نے ان سے اپنی بات تو نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔ اس سے بچنے کے لئے ہی میں نے کالج تبدیل کیا ہے۔" مدیحہ نے جا
کہا۔

"اسی لئے تو میں نے اس فیصلے کی تائید کی تھی مگر مدیحہ! سچ کہہ رہی ہوں۔ اب
میرا دل نہیں لگتا۔ سب سونا سونا لگتا ہے۔"

مدیحہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اتنی اکیلی ہو گئی
گھبرانے لگتا ہے۔ نیا کالج' نیا ماحول' نئے لوگ لیکن اس نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔
نہیں۔ ہم ملتے رہیں گے اور فون تو روز ہی کر سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ کبھی تم ملنے آ جانا۔ کبھی میں ملنے آ جاؤں گی۔" دوسری طرف

پھر ذرا توقف کے بعد بولی۔ "ایک بات کہوں مدیحہ جان! اب تم انہیں بھولنے کی
ش کرنا۔ آدمی خود کو کانٹوں میں الجھائے تو کپڑے ہی نہیں پھٹتے۔ کبھی خراش بھی لگ
ہے۔"

"جانتی ہوں۔ کوئی کانٹا زہریلا بھی ہوتا ہے۔" مدیحہ نے سرد لہجے میں کہا۔ اب وہ چاہتی
کہ اس کے اور نسرین کے درمیان یہ گفتگو بند ہی ہو جائے۔ "تمہیں پتہ ہے، سب فساد
ہونے کا ہے۔ اتنے دنوں میں تو میں تقریباً انہیں بھول ہی چکی ہوں۔ اب سوچتی ہوں
میری حماقت تھی۔"

"ٹھنک اور ہاں' کالج جوائن کر لیا تم نے؟"

"چار دن بھی ہو گئے...."



اگلے روز سیکنڈ ائر کی کلاس میں حمید احمد کو سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ سکینڈل کے خطرے
وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکے تھے۔ مدیحہ نے اپنے وعدے کے مطابق خاموشی سے کالج
ز دیا تھا۔ اس نے اپنی عزیز ترین سہیلی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس روز خالی پیریڈ میں وہ آفس میں بیٹھے تمام وقت مدیحہ کے بارے میں سوچتے رہے
اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ان کی سمجھ میں خوف کی سائیکی بہت اچھی طرح آ گئی۔
کو جو چیز دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو' وہ اسی کے بارے میں بدترین عدم تحفظ کا شکار
ہے اور اس چیز کو موہوم سا خطرہ بھی لاحق ہو تو وہ شدید خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ
ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تمام حسیں' تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں اسی پر مرکوز ہو کر
باتی ہیں۔ جب تک وہ اس خوف میں مبتلا ہے' اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے قابل نہیں

اور انسان کا دفاعی نظام بھی خود کار انداز میں کام کرتا ہے۔ وہ اسے خوف سے بچانے کے
ہر جتن کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ بات کو شعور تک نہیں پہنچنے دیتا۔ آدمی اہم باتوں کو
بھولا رہتا ہے۔

لب اس وقت حمید احمد کو بارش کے اس دن کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ انہیں ایک ایک
لمحہ ایسے جیسے وہ ان کے سامنے اس وقت بھی زندہ ہو.... اور وہ اسے پوری تفصیل

کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سے گزار سکتے ہوں لیکن جب انہیں اگلے روز اپنے ہوش آیا تھا' اس وقت انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ انہوں نے چھ دن اپنے گھر میں گزارے۔ وہ ان کے لئے خالص فرصت کا وقت تھا لیکن انہیں مدیحہ کا خیال بھی نہیں انہیں وہ دن اور اس کی کوئی بات یاد نہیں آئی۔ وجہ یہ تھی کہ شدید خوف ان کے وجود پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ مدیحہ کے بارے میں سوچتے' یاد کرتے تو اپنے پیشے کے حوالے تحفظ کا شکار ہو جاتے۔ وہ شاید اس کی کہی ہوئی ہر بات بھول جاتے لیکن یہ یاد رہتا کہ اس کہا تھا.... آپ نے مجھے بے راہ رو کہا ہے لیکن آپ جانب دار ہیں۔ میں یہ معاملہ غیر جانب دار لوگوں کے سامنے رکھوں گی اور یہ بات کالج چھوڑنے کے وعدے کے ساتھ انہیں آتی تو کیسا خوف جگاتی دل میں۔ جبکہ وہ بیمار تھے۔ کمزور تھے۔ کہیں جانے آنے کے نہیں تھے۔ بستر پر پڑے پڑے خوف سے شل ہو جانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے لئے ان کے دفاعی نظام نے اتنی فرصت کے چھ دنوں میں ایک بار بھی انہیں اس دن بارے میں نہیں سوچنے دیا تھا۔ انہیں اس دن کا خیال بھی نہیں آیا' جس نے انہیں اس حال پہنچا دیا تھا۔ کتنی غیر فطری بات تھی یہ مگر اب وہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ کتنا فطری تھا۔

پھر گزشتہ روز جب انہوں نے کالج RESUME کیا اور انہیں مدیحہ کے چھوڑنے کا پتہ چلا تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ تب بھی انہوں نے اس دن کے بارے میں سوچا۔ انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ مدیحہ نے کالج چھوڑنے کی کیا وجہ بتائی ہو گی اور یہ کہ اس نے کسی کو اس دن کے.... اور ان کے بارے میں تو نہیں بتا دیا۔ اسی لئے انہوں نے سلسلے میں اس کی سب سے قریبی سہیلی سے پوچھ گچھ کی اور اطمینان بخش صورت حال آنے کے باوجود وہ آج دوسرے دن کلاس لینے کے بعد تک مطمئن نہیں ہوئے۔ کلاس لینے کے بعد انہیں سب ٹھیک لگنے لگا۔

حالانکہ پریشانی کی درحقیقت کوئی بات نہیں تھی۔ اگر وہ سب کچھ یاد کرتے' سوچ معقولیت سے کام لیتے تو ان کی سمجھ میں آ جاتا کہ خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہوتا کیسے؟ خوف تو وہ قوت ہے کہ معقولیت کو' ذہانت کو اور سمجھ بوجھ کو سب معطل کر دیتا ہے۔ ہاں.... اب وہ سب کچھ سوچ سکتے ہیں۔

سو اب وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ لڑکی، جس کی عمر بہت کم

لیکن وہ اپنی عمر سے بہت بڑی تھی اور یہی نہیں، اس کے پاس کیریکٹر بھی تھا اور اس بات کا اعتراف تو انہوں نے اس دن کر لیا تھا کہ اس کی محبت بہت عظیم ہے اور وہ نہ اس نے کی ہے نہ اسے ہوئی ہے۔ وہ تو اسے ودیعت کر دی گئی ہے۔ یہی نہیں' اس کی محبت پر انہیں رشک آیا تھا.... اور رشک بھی دو رخ سے۔ ان کا جی چاہا تھا کہ کاش ایسی محبت انہیں بھی ملی ہوتی۔ اور کاش انہوں نے بھی کسی سے ایسی محبت کی ہوتی۔

اور مدیحہ نے کہا تھا کہ وہ رسوائی سے بہت ڈرتی ہے۔ تماشا بننے سے گھبراتی ہے۔ لیکن ان کی رسوائی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ تو اپنی رسوائی سے بڑھ کر نا قابل قبول ہے اس کے لئے۔ لہٰذا اب وہ کالج نہیں آئے گی۔

تو ایسی پکی یقین دہانی کے بعد وہ خوف میں مبتلا کیوں ہوئے۔ یہ تو ان کا چھوٹا پن ہی تھا۔ اور شاید یہ بھی تھا کہ وہ اس کم عمر لڑکی کی بڑائی کو پوری طرح تول نہیں سکے۔ اور انہوں نے اسے کم تر اور نا قابل اعتبار جانا۔ بلکہ شاید یوں تھا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ وہی اس کے محبوب ہیں تو ان کی نظروں میں اس کے محبت کی عظمت کم ہو گئی۔ بلکہ شاید ختم ہی ہو گئی وہ ایک کم عمر لڑکی کی عام سی سطحی محبت ہو گئی۔ ایسی چھچھوری محبت' جس میں لڑکیاں شیخی بگھارنے لگتی ہیں۔ تبھی تو وہ خوف زدہ.... عدم تحفظ کا شکار ہو گئے۔

اس لئے وہ اپنے آپ سے ایسے شرمندہ ہوئے کہ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اور انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس کے بارے میں وہ سوچ رہے ہیں، وہ اس وقت ان کے گھر میں موجود ہے!

☆

دستک خلاف معمول تھی۔ بلقیس بیگم نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوب صورت لڑکی کھڑی نظر آئی۔ لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہو گی۔ وہ سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھی لیکن اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کی لڑکی ہے۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ کس سے ملنا ہے؟'' بلقیس بیگم نے پوچھا۔

لڑکی مسکرائی۔ ''آپ سے ہی ملنا ہے۔ مجھے اندر نہیں بٹھائیں گی آپ؟''

بلقیس بیگم کو اپنی بد اخلاقی پر افسوس ہوا۔ انہوں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔

''آ جاؤ بیٹی۔''

لڑکی نے اندر داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھا' جیسے گھر کا جائزہ لے رہی ہو۔ بلقیس
بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی کی نگاہوں میں تجسس تھا.... مگر احترام آمیز
کمرے میں لے گئیں۔ اسے بٹھانے کے بعد انہوں نے کہا۔ "اب بتاؤ' تم مجھے کی
ہو۔"

"یہ میں نے کب کہا کہ میں آپ کو جانتی ہوں؟" لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی
"تم نے کہا کہ تمہیں مجھ سے ملنا ہے۔"
"جی۔ کیونکہ میں آپ کو جاننا چاہتی ہوں۔ ہاں' آپ سے غائبانہ تعارف ہے
اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔"
"کیسے؟ تعارف کیسے ہوا؟"
"حمید صاحب نے کرایا تھا۔"
بلقیس بیگم چوکنا ہو گئیں۔ "تم ان کی شاگرد ہو؟"
"جی نہیں۔" لڑکی مسکرائی۔ "اور میں ان کی شاگرد بننا بھی نہیں چاہتی۔"
یہ کہتے ہوئے لڑکی کے چہرے پر جو سرخی آئی' اس نے بلقیس بیگم کو متجسس کر
اتنی کم عمر تھی.... اور اس کا کہنا تھا کہ وہ حمید احمد کی شاگرد نہیں ہے۔ اور پھر اس
کی سرخی....! بلقیس بیگم جہاں دیدہ تھیں۔ انہوں نے ایک عمر گزاری تھی۔ وہ اس
مطلب سمجھتی تھیں۔ لیکن حمید احمد کو بھی جانتی تھیں۔ اس لئے وہ لڑکی انہیں معمہ لگی
یہ بتاؤ بیٹی کہ تم آئی کیسے ہو؟"
"پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو اماں کہہ سکتی ہوں؟ آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟
آپ میری نانی سے بہت ملتی ہیں۔"
بلقیس بیگم کا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ اماں.... کیا انہیں بیٹی بھی مل گئی
ہے کہ لڑکی انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے انداز میں سادگی اور لہجے میں اپنا
"کیوں نہیں بیٹی۔ حمید احمد بھی مجھے اماں ہی کہتے ہیں۔"
لڑکی کا چہرہ تمتمایا۔ "تو بات یہ ہے اماں کہ میں کئی وجوہات کے تحت آئی ہوں۔
کہ میں آپ سے ملنا' آپ کو جاننا چاہتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ میرے پاس ایک نا
ہے' جسے مکمل بھی کرنا ہے اور جس میں سچے رنگ بھی بھرنے ہیں۔ تیسرے یہ کہ

قرض وصول کرنا ہے۔"
"مجھ سے شوق سے ملو.... اور جان بھی لو۔ تمہاری دوسری بات میرے پلے نہیں
پڑی۔ اور قرض کے بارے میں بتا دو۔"
"ایک پیالی چائے میرا قرض ہے آپ پر۔" لڑکی مسکرائی۔ "اس روز میں آتی تو پلاتیں نا
آپ۔ مگر میں نے کہا، پھر سہی۔"
بلقیس بیگم بھی مسکرائیں۔ "ٹھیک ہے۔ میں پہلے قرض چکاؤں گی۔ تم بیٹھو۔"
"یہاں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ آپ کے ساتھ کچن میں چلوں گی۔ قرضہ بھی وصول کروں
گی اور باتیں بھی کروں گی آپ سے۔" لڑکی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆

"لڑکی؟" حمید احمد نے اماں کی بات سننے کے بعد پر تشویش لہجے میں کہا۔ پھر بے پروائی
سے بولے۔ "میری کوئی شاگرد ہو گی۔"
"نہیں۔ وہ تمہاری شاگرد نہیں ہے۔" اماں نے کہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری سٹوڈنٹس کے علاوہ کوئی لڑکی مجھے کیسے جان سکتی ہے۔" حمید
احمد پریشان ہو گئے۔ "لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ میری شاگرد نہیں تھی۔"
"اس نے ہی بتایا تھا۔"
حمید احمد کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ مدیحہ ہو گی۔ انہیں غصہ
آنے لگا۔ کالج چھوڑ دیا' اچھا کیا۔ مگر گھر آنے کی کیا تک تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے غصے
پر ضبط کیا۔ "تو آپ نے یہ تو پوچھا ہوتا کہ پھر وہ کیسے جانتی ہے مجھے۔"
"میں نے پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ کچھ دن کالج میں تم سے پڑھا ہے۔"
"جی ہاں۔ یہی بات ہے۔ مگر وہ آئی کیوں تھی؟"
"چائے پینے آئی تھی۔" اماں نے سادگی سے کہا۔ "مجھ سے میرے متعلق پوچھتی رہی۔"
"اور آپ نے بتا دیا؟"
اماں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "تو.... میری کہانی کوئی خفیہ سرکاری راز تو ہے
نہیں۔"
"پھر بھی اجنبی لوگوں سے...."

"یقین کرو بیٹے۔ وہ مجھے پہلی نظر میں بھی اجنبی نہیں لگی۔ وہ تو بڑی اپنی اپنی سی
تھی۔ بہت پیاری لڑکی ہے۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں۔" حمید احمد جھنجلا گئے۔ پھر انہوں نے خود پر

"کتنی دیر رہی وہ یہاں۔"

"تین گھنٹے تو رہی ہو گی۔" اماں نے سوچ کر بتایا۔ "وحید کے آنے سے پہلے ہی چلی

"تین گھنٹے؟ اتنی دیر کیا کرتی رہی وہ؟"

"مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر تمہاری شادی کا البم دیکھا اس نے....."

"اور آپ نے دکھا دیا؟"

"کوئی حرج ہے اس میں؟" اماں نے معصومیت سے پوچھا۔ "بھئی مجھے وہ بہت
سی لگ رہی تھی۔ البم دیکھ کر ہی تو وجہ سمجھ میں آئی۔ تم نے نہیں دیکھا' وہ بہو
ہے۔ پیشانی' آنکھیں' ناک' بھنویں تو بالکل بہو جیسی ہیں۔ مجھے تو لگا کہ بہو وا
ہے۔"

حمید احمد جانتے تھے کہ بہو سے اماں کی کیا مراد ہے۔ انہوں نے کہا۔ "پتا نہیں۔
کبھی غور نہیں کیا اس پر۔" انہوں نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولے۔ "یہ آپ نے ک
لگائی ہے۔ اس سے تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

اماں کا منہ بن گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اس سے پھر آنے کو کہا تھا
..... نہیں اماں' اب میں شاید ہی کبھی آؤں۔ اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔"

یہ سن کر حمید احمد نے گہری سانس لی' جیسے اطمینان ہو گیا ہو۔ "اماں..... کہ
دیں۔"

☆

اب بلقیس بیگم اس لڑکی مدیحہ کے بارے میں کثرت سے سوچنے لگی تھیں!

یہ بات نہیں تھی کہ وہ طبعاً ناشکر گزار تھیں۔ بلکہ ان کی طبیعت میں تو شکر گزاری تھی۔
نہوں نے اولاد کی آرزو میں عمر گزار دی۔ بہت بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ اس قابل ہی
ہیں تھیں۔ پھر وہ حمید احمد کے ہاں آ گئیں تو انہیں ایک ساتھ بیٹا اور پوتا مل گئے۔ وہ اس پر
دا کا شکر ادا کرتی رہیں۔ وہ کیسا کریم' کیسا قدرت والا ہے کہ بندے کے نصیب میں جو کچھ
ہو' وہ بھی اسے دے دیتا ہے۔ لیکن اللہ نے بندے کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی خواہشیں ختم
یں ہوتیں۔ حمید احمد ان سے بہت محبت کرتے تھے..... بالکل ماں جیسی۔ اور وحید کو تو پالا
انہوں نے تھا۔ تو کبھی کبھی انہیں بیٹی کی کمی محسوس ہوتی۔ بیٹی کو پالنا کیسا ہوتا ہو گا؟ اس کی
بت کیسی ہوتی ہو گی۔ بیٹوں سے۔ لڑکوں سے مختلف۔ اب بیٹی تو انہیں مل نہیں سکتی تھی۔
ر بہو کا امکان تو تھا۔ اور وحید کے حوالے سے وہ بہت دور کا امکان تھا۔ کون جانے' انہیں
ی زندگی' اتنی مہلت ملے بھی یا نہیں۔ کون جانے! لیکن حمید احمد شادی کر لیں تو انہیں یہ
ت بھی مل جائے۔

انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ان کے دل میں یہ خواہش دبی رہی۔ مگر اب
مدیحہ کو دیکھ کر وہ دبی ہوئی خواہش ابھر آئی۔ اور ایسا بلاوجہ بھی نہیں ہوا۔ مدیحہ نے جتنا وقت
ان کے ساتھ گزارا' اس میں یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ حمید احمد سے محبت کرتی ہے۔ اس لڑکی
کا انداز منہ سے بول رہا تھا۔

بلقیس بیگم ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج اخذ کرنا انہیں آتا
تھا۔ اس کام کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس نے زندگی گزاری ہو' وہ جان ہی
لیتا ہے۔ مدیحہ نے جس طرح حمید احمد کی شاگردی سے انکار کیا۔ جبکہ وہ ان سے ملی اسی
لئے تھی۔ اس سے بلقیس بیگم نے سمجھ لیا کہ وہ حمید احمد کی طرف بڑھی ہو گی۔ اور

انہوں نے اس تعلق کے حوالے سے اسے سختی سے ڈانٹ دیا ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی
کہ اس کے بعد لڑکی نے وہ کالج ہی چھوڑ دیا' جہاں حمید احمد پڑھاتے تھے۔ صرف اس
وہ ان کی شاگرد نہ رہے' نہ کہلائے۔

انہیں اس بات کا اتنا یقین تھا کہ انہوں نے دونوں میں سے کسی ایک سے بھی تصدیق کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

پھر جب مدیحہ، حمید کی شادی کا البم دیکھ رہی تھی تو وہ مدیحہ کو بہت غور سے
تھیں۔ حمید احمد کی دلہن کی تصویریں دیکھتے ہوئے اس لڑکی کی آنکھوں میں حسرت و یاسیت تھی۔ اسی لمحے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی حمید احمد سے محبت کرتی ہے۔ انہ
سوچ لیا کہ انہیں حمید احمد کے ردعمل کو بہت غور سے دیکھنا ہے۔

اسی لئے انہوں نے حمید احمد کو اس کی آمد کے بارے میں بتایا۔ ورنہ مدیحہ نے ان
تھا کہ وہ انہیں نہ بتائیں۔

اور انہوں نے دیکھ لیا کہ حمید احمد کا ردعمل جھنجلاہٹ اور غصے کا تھا۔ اس ردعمل کے ایک اندازے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس لڑکی نے براہ راست یا اپنے طور ط
سے بغیر کہے اپنی محبت حمید احمد پر ظاہر کر دی تھی۔ اور یقیناً حمید احمد اس سے چڑ گ
شاید اسی کے نتیجے میں لڑکی نے کالج چھوڑا ہو گا۔

دوسری بات.... جب انہوں نے لڑکی کی سلمہ سے مشابہت کی بات کی تھی تو
نے بے نیازی ظاہر کی تھی.... پتہ نہیں۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا اس پر۔ لیکن
آنکھیں ان کا ساتھ نہیں دے سکی تھیں۔ جہاں دیدہ بلقیس بیگم نے یہ بات سمجھ لی
حمید احمد بھی وہ مشابہت دیکھ چکے ہیں۔

بس ایک بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مدیحہ نے ان سے یہ کیوں کہا کہ وہ
آنے کی بات حمید احمد کو نہ بتائیں۔ جبکہ اسی طرح وہ انہیں یہ احساس دلا سکتی تھی
چھوڑنے کے باوجود وہ ان کے لئے موجود ہے۔ اور حمید احمد نے بھی یہی کہا تھا کہ
سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ گویا انہیں یہی توقع تھی۔

ممکن ہے، لڑکی چاہ یہی رہی ہو کہ وہ اس کی آمد کے متعلق حمید احمد کو بتائیں لیکن
کہا الٹ ہو۔ ایسا ہے تو وہ اس کی توقع پر پوری اتری تھیں۔ مگر یہ بھی تھا کہ ان کے

اب وہ دوبارہ کب آئے گی۔ اس نے کہا تھا کہ اب وہ شاید ہی کبھی آئے۔ اور یہ کہتے ہوئے
ان کے لہجے میں سچائی تھی اور وہ اداس بھی ہو گئی تھی۔ اب اگر وہ چاہتی تھی کہ حمید احمد
مان لیں کہ وہ آئی تھی تو پھر یہ دوبارہ نہ آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ بس یہی ایک سمجھ نہ آنے والی
بات تھی اس معاملے میں۔ اور وہ خود بخود سمجھ آ جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوبارہ آتی ہے یا
نہیں۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ بلقیس بیگم کو بہت اچھی لگی تھی۔ بلکہ اس کے آنے کے بعد بلقیس بیگم خواب دیکھنے لگی تھیں۔ وہ سوچتیں' یہ لڑکی بہو بن کر آ جائے تو گھر مکمل ہو جائے گا۔

لیکن انہوں نے حمید احمد کا ردعمل دیکھ لیا تھا۔ نو سال کے ساتھ میں انہیں بہت اچھی طرح سمجھنے لگی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اس موضوع پر ان سے بات نہیں کی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس وقت وہ چڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی تو ضد پکڑ لیں گے۔ ویسے بھی اس وقت بات کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ان کا لحاظ کرتے تھے۔ ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کی بات مان بھی لیتے۔ لیکن عملاً نتیجہ خراب ہی ہوتا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ کبھی موقع نکال کر' وقت دیکھ کر ان سے اس معاملے پر بات کریں گی۔

☆

حمید احمد اب پرسکون ہو گئے تھے۔ مدیحہ کو کالج چھوڑے دو مہینے ہو چکے تھے۔ ابتدا میں وہ ایک بار ان کے گھر آئی تھی۔ مگر اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان کے خدشات کے برعکس وہ دوبارہ ان کے گھر نہیں گئی تھی۔

وہ خوش تھے کہ اتنا مہیب طوفان کسی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا تھا۔ اس طرح اس کی آمد کا کہیں کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ آزادی کا وہ احساس بڑا خوش آئند تھا' جو انہیں اس کے نتیجے میں ملا تھا۔ کلاس میں لیکچر دیتے وقت وہ آزاد ہوتے تھے۔ جدھر جی چاہتا رخ کرتے' جہاں چاہتے دیکھتے۔ ان کے انداز کا قدرتی بے ساختہ پن لوٹ آیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے لیکچر اب موثر ہیں۔ ورنہ مدیحہ کی موجودگی میں تو یہ حال تھا کہ وہ نظر اٹھاتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ اس وقت ان کا بس چلتا تو وہ کلاس کے تمام سٹوڈنٹس پر پابندی لگا دیتے کہ وہ نظریں نیچی کئے بیٹھے رہیں۔ کوئی نظر نہ اٹھائے۔ اس لئے کہ مدیحہ کی نگاہوں پر وہ

قدغن نہیں لگا سکتے تھے..... اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اس کی نگاہوں
واقف بھی ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ ان کی نظریں لیکچر کے دوران میں اب بھی اس طرف اٹھ جا
جہاں مدیحہ بیٹھتی تھی۔ ابتدا میں وہ جگہ خالی رہی۔ ان کی نظر ایک لمحے کو اس ان دیکھے
فریم میں اٹکتی۔ پھر بائیں جانب حرکت کرتی اور نسرین کے چہرے پر رک جاتی۔ نسرین
طور پر بڑے انہماک سے لیکچر سن رہی ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی انہیں لگتا کہ اس کے چہ
پر، اس کی آنکھوں میں اداسی ہے۔ پھر وہ نظر ہٹا لیتے۔

اب نظروں کے اس سفر میں ان کے ارتکاز میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ جبکہ پہلے وہ
نظر پڑنے کے بعد وہ بھول جاتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ وہ بس خوف سے شل ہو جا
تھے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا کہ مدیحہ انہیں کس طرح دیکھ رہی ہے تو کتنی بری بات ہو
سکینڈل بنے گا اور....

اب انہیں تمام الجھنوں سے نجات مل گئی تھی!

ابتدا میں چند روز تک وہ مدیحہ کی خالی سیٹ کو اور اپنی جگہ بیٹھی نسرین کو دیکھتے رہے۔
سے انہیں احساس ہوتا تھا کہ مدیحہ کالج چھوڑ گئی ہے مگر پھر ایک روز جو انہوں نے نظر ا
تو مدیحہ کی جگہ سکینہ کو بیٹھے دیکھا۔ نسرین بدستور اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ نجانے کیوں انہ
تبدیلی اچھی نہیں لگی۔ شاید مدیحہ کی خالی جگہ دیکھنا انہیں اچھا لگتا تھا۔

پھر اس بات کے تیسرے دن جو ان کی نظریں اٹھیں تو انہیں جھٹکا لگا۔ اب کے ن
اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ اس وقت وہ حاضری لے رہے تھے۔ ایک ثانیے کے جھٹکے
بعد انہیں دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب انہیں نسرین کی..... یس سر..... سنائی دی۔ ایک
کو انہوں نے سوچا کہ کوئی نسرین کی پراکسی بول رہا ہے۔ مگر پھر ان کے ذہن نے انہیں بتا
یہ نسرین کی ہی آواز ہے۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ نسرین سب سے پچھلی بنچ پر
بیٹھی تھی۔

دو دن یہ صورتحال رہی۔ پھر تیسرے دن نسرین کی جگہ بھی ایک اور لڑکی نے لے
نسرین بدستور پچھلی بنچ پر اکیلی بیٹھ رہی تھی۔

اس کے بعد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سب کچھ سیٹ ہو گ

ے میں سوچ ر رہنے لگے تھے۔ اتنی برائٹ لڑکی بیک بنچر ہو گئی تھی۔

ایک روز لائبریری میں نسرین سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ "تم سب سے پیچھے
ں بیٹھنے لگی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

نسرین حیران ہو گئی۔ "کیوں سر..... اس میں کوئی حرج ہے؟"

"بالکل ہے۔ پیچھے وہ لوگ بیٹھتے ہیں، جنہیں پڑھنا نہیں ہوتا ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"یہ تو سر رویوں کی بات ہے۔ اس میں جگہ کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پڑھائی میں
ی لینے والا پچھلی نشستوں پر بیٹھنے لگے تو یہ تو نہیں ہوگا کہ پڑھائی میں اس کی دلچسپی ختم ہو
ے گی۔"

حمید احمد لاجواب ہو گئے۔ "لیکن اس کا اثر آدمی کی ریپوٹیشن پر پڑتا ہے۔"

"پڑتا بھی ہوگا تو وقتی طور پر۔" نسرین نے کہا۔ "کیونکہ آدمی کی ریپوٹیشن اس کے
ے اس کے عمل اور نتائج سے بنتی ہے۔"

"مگر تم نے اپنی جگہ کیوں چھوڑ دی؟ حمید احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہاں میری پڑھائی پر برا اثر پڑ رہا تھا سر۔" نسرین نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔
اں بیٹھ کر میں مدیحہ کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔"

حمید احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔"

"بالکل سر۔ وہ ہے ہی ایسی۔ آپ بھی اس کے ساتھ زیادہ وقت گزار لیتے تو اس سے
کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔" نسرین نے سادگی سے کہا۔

حمید احمد کا چہرہ تمتما اٹھا۔ انہیں وہ ذاتی طور پر ایک چیلنج لگا۔ اس نے انہیں جارحیت پر
یا۔ انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ بچوں کی سی جذباتیت ہے نسرین۔ تم جیسی برائٹ
کو یہ زیب نہیں دیتا۔"

"میں انسان ہوں سر۔ اور جذبات کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا۔ ہاں مشین کہلا سکتا
ہے۔"

"پریکٹیکل بنو۔ زندگی خود سب کچھ سکھا دیتی ہے۔" حمید احمد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔
"یہ خود دیکھ لو۔ کسی کی چھوڑی ہوئی کوئی جگہ..... کوئی بھی جگہ....." انہوں نے ایک
لفظ پر زور دیا۔ "خالی نہیں رہتی۔ یہ نظام قدرت ہے۔ یہی فطرت ہے۔ دو دن مدیحہ کی

جگہ خالی رہی۔ پھر وہاں ایک اور لڑکی آ بیٹھی۔ تم نے وہ سیٹ چھوڑ دی۔ دو دن وہ خالی رہی مگر دیکھ لو' اب وہ بھی خالی نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہا آپ نے سر۔ کسی کے کم ہو جانے سے نظام قدرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن سر، انسانوں پر پڑتا ہے۔ جانے والے سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی میں ایک کمی ہو جاتی ہے۔ زندگی جاری رہتی ہے۔ مگر اس میں فرق پڑ جاتا ہے...."

"نہیں پڑتا بی بی! زندگی میں بھی وہ جگہ بھر جاتی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے سر، ہوتا نہیں۔ زندگی میں وہ کمی ہمیشہ رہتی ہے.... موت تک۔ بر فطرت یہ ہے کہ آدمی کو صبر آ جاتا ہے۔ مگر خوشی میں فرق پڑ جاتا ہے۔ مدیحہ کی جگہ بکر بیٹھ گئی سر۔ لیکن مجھے سکینہ نظر نہیں آتی۔ مجھے وہ جگہ خالی ہی لگتی ہے۔ ہاں کبھی تصور میں بھی مدیحہ کو ہی وہاں بیٹھے دیکھتی ہوں۔"

"آئی ایم سوری نسرین۔ مائنڈ نہ کرنا۔ میں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہا تھا۔"

"میں جانتی ہوں سر۔" نسرین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس گفتگو نے حمید احمد کو بے چین کر دیا۔ اس سے ان کی چالیس سالہ زندگی کے تجربے کی نفی ہو رہی تھی۔ وہ اس پر سوچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہیں یاد تھا' انہوں نے تو محبت کے رشتوں کو کھویا ہی کھویا تھا.... اور پھر بھی جیتے رہے تھے۔ پاکستان آتے ہوئے ابا شہید ہو گئے۔ اماں نے اور انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر زندہ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں ابا کی یاد بھی کم ہی آتی تھی۔ زندگی اتنی مہلت ہی نہیں دیتی تھی۔ پھر اماں بھی ان سے بچھڑ گئیں۔ زندگی کا سفر پھر بھی جاری رہا۔ حالانکہ وہ بالکل اکیلے ہو گئے تھے۔ چند ہی دنوں میں اماں کو بھول کر وہ پھر جدوجہد میں لگ گئے۔ زندگی نے پھر انہیں اماں کو یاد کرنے کی فرصت نہیں دی۔ پھر ان کی زندگی میں سلمہ آئی.... مختصر سی مدت کے لئے۔ اور انہیں وحید کا تحفہ دے کر وہ بھی چلی گئی۔ شیر خوار بچہ.... اور وہ اکیلے۔ زندگی تب بھی نہیں رکی۔ شیر خوار بچہ بھی پل گیا۔ بس متبادل ملنا ضروری ہے۔ انہیں اماں مل گئیں۔ سلمہ کا متبادل تو انہوں نے لانا نہیں چاہا۔ بہرحال نہیں اماں کا متبادل مل گیا۔ وہ سب سے زیادہ محبت کے رشتے کھو کر بھی زندہ رہے تھے۔

اور یہ نسرین.... یہ مدیحہ کی جدائی میں اتنی بے کل ہے۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ عمر؟

ہوتی ہے؟ نہیں.... یہ عمران پر بھی آئی تھی۔ اور انہوں نے اس سے بہت.... بہت کھو دیا تھا۔ تو پھر؟ اوہ.... شاید فراغت کی بات ہے۔ آدمی کو کوئی فکر' کوئی پریشانی نہ ہو تو وہ یہ سب کچھ کرتا ہے۔ لیکن نہیں' جب سلمہ گئی تو وہ خوش حال تھے۔ انہیں کوئی فکر' کوئی پریشانی نہیں تھی۔ مگر وہ بے کل اس کی جدائی میں نہیں ہوئے۔ ہاں وہ اسی کی موت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں پریشان ہوئے۔ مسائل کا حل تلاش کرنے کے بعد وہ پھر زندگی میں مصروف ہو گئے۔ سلمہ انہیں یاد بھی نہیں رہی۔ وہ ایسا بھولے کہ اس سے مشابہت رکھنے والی لڑکی کو دیکھ کر الجھتے رہے۔ لیکن مشابہت تلاش نہیں کر پائے۔

تو کیا ان میں کوئی کمی ہے؟ وہ سوچتے رہے۔ محبت کی کمی! انہوں نے زندگی کے پکے رشتوں کو بھی بس ضرورت کی ترازو پر تولا۔ انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ نہ باپ سے' نہ اماں سے' نہ بیوی سے۔ اسی لمحے مدیحہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی۔ خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں۔

انہیں احساس ہوا کہ یہ سچ ہے۔ وہ ایک پرسکون سمندر کی طرح ہیں۔ تلاطم سے محروم۔ سمندر کو تو طوفان ہلا ڈالتا ہے۔ سمندر بپھر جاتا ہے۔ شیر کی طرح غرانے لگتا ہے اور چٹانوں پر جھپٹ پڑتا ہے۔ لیکن انہیں تو کوئی طوفان بھی متلاطم نہیں کر سکا۔ تو کیا وہ انسان نہیں مشین ہیں؟ یا یوں ہے کہ ابھی تک کوئی طوفان اس سمندر پر سے گزرا ہی نہیں۔

نسرین سے اس گفتگو کے اگلے روز لیکچر دیتے ہوئے انہوں نے اپنے معمول کے مطابق اس ڈیسک کی طرف دیکھا' جہاں کبھی مدیحہ بیٹھتی تھی.... اور اب وہاں سکینہ ہوتی تھی۔ ان کی نظر وہاں ٹھہری.... پھر آگے بڑھ گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے انہیں شاک لگا۔ انہیں یاد نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ انہیں بس یہ یاد رہا کہ ان کی نظر اس ڈیسک پر ٹھہری تھی تو ان کے ذہن میں یہ مستند خیال تھا کہ سکینہ وہاں بیٹھتی ہے۔ لیکن ان کی آنکھوں نے سکینہ کو دیکھا نہیں تھا۔ انہیں وہ جگہ خالی دکھائی دی تھی اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی۔ روز وہ اس طرف دیکھتے تھے اور یہی ہوتا تھا۔ وہ خالی ڈیسک دیکھتے تھے۔ ان کا ذہن جانتا تھا کہ وہاں سکینہ بیٹھتی ہے۔ لیکن وہ انہیں نظر نہیں آتی تھی۔ آج انہیں اس بات کا شعوری طور پر احساس ہوا تھا

انہیں احساس ہوا کہ ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی ہے اور پسینہ بہتا ہوا آنکھوں تک
ہے۔ انہوں نے جیب سے رومال نکالا اور پسینہ خشک کرنے لگے۔

"کیا ہوا سر.... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"بس چکر سا آ گیا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"آپ بیٹھ جائیں سر۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اسی لمحے ایک خیال نے انہیں اور گھبرا دیا۔ ابھی سکینہ کے
ہوتے انہیں یہ ڈیسک خالی نظر آتی ہے۔ لیکن کبھی سکینہ کے ہوتے ہوئے انہیں وہاں
بیٹھی نظر آ گئی تو کیا ہو گا؟

☆

امتحان ہونے میں صرف پچیس دن رہ گئے تھے۔ اور کالج کے اب دس دن رہ گئے
امتحان سے پندرہ دن پہلے کالج کی چھٹیاں شروع ہونی تھیں۔ تو اب کالج میں ہر دن تخ
ہر مضمون کا ٹیچر اپنے مضمون کے اہم ابواب کے بارے میں لکھوا رہا تھا۔

مدیحہ کالج سے آئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر گر گئی۔ بدن یوں ٹوٹ رہا تھا ک
کی ہمت نہیں تھی۔ مگر پھر اسے نماز کا خیال آ گیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ تھکے تھکے اند
باتھ روم میں گئی۔ مگر وضو کر کے نکلی تو تازہ دم تھی۔ نماز کے لئے نجانے کہاں سے
آ جاتی تھی۔

برسات کے اس دن کو جب وہ حمید احمد سے آخری بار ملی تھی' چار ماہ ہو چکے تھے
دن سے اس نے نماز شروع کی تھی۔ اور اب تک اس کی ایک نماز بھی قضا نہیں ہوئی
اور ہر نماز کے بعد شکر کے نفل پڑھنا بھی اس کا معمول تھا۔

وہ نماز کے لئے کھڑی ہوئی اور نیت باندھی!

نیت باندھتے ہی حمید احمد کا چہرہ اس کے تصور میں آ گیا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ پہلے دل
ہو رہا تھا۔ ابتدا میں تو وہ بہت جھنجلائی' بہت پریشان ہوئی تھی۔ وہ اللہ سے فریاد کرتی
اے اللہ' میں تیری عبادت کرنا چاہتی ہوں۔ کر رہی ہوں۔ مگر یہ میرے ساتھ کیا
ہے۔ یہ محبوب چہرہ کیوں میرے تصور پر چھا گیا ہے۔ کیا یہ شرک ہے؟ کیا میرا سجدہ
نہیں رہا۔

اس کے لئے مسئلہ بن گیا۔ نماز کی طرف وہ دل سے راغب ہوئی تھی۔ مگر حمید احمد کا
یہ کاٹ بن گیا۔ وہ نماز پڑھتی۔ لیکن طمانیت سے محروم رہتی۔ اسے شرمندگی رہتی۔ پھر
کہتا کہ اللہ نیت سے واقف ہے۔ اور اس کی نیت میں کوئی خرابی نہیں۔ اللہ قبول کرنے
ہے۔

پھر دماغ نے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ آخر وہ اس چہرے کو تصور سے نوچ کر کیوں نہیں
دیتی۔ اس کے پاس اس کا جواب تھا۔ اس پر اس کا اختیار ہی کب ہے۔ یہ ممکن ہوتا تو وہ
چہرے کو تصور سے ہٹا نہ دیتی۔ نماز کے بعد کی شرمندگی اسے کب اچھی لگتی ہے۔ دماغ
اعتراض کیا کہ وہ کوشش کیوں نہیں کرتی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اس کا دل کانپنے لگا۔
کوشش وہ کیسے کر سکتی ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ حمید احمد کے تصور سے دستبردار
بھی نہیں چاہتی۔ اس کی شرمندگی بڑھ گئی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ حمید احمد کو اپنے
سے نوچ پھینکنے کی پوری شدت سے کوشش کرتی۔ اور ناکام رہتی تو اپنے تصور سے کم از
رت تو کرتی' یہ ضروری تھا کیونکہ وہ اس کی نماز میں حارج ہو رہا تھا۔

لیکن یہ اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کوشش کی۔ یہ موقع تھا
اس بے سود محبت سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔ لیکن وہ ناکام ہو گئی۔ پہلی بار اس کی سمجھ میں
آدمی کا اندر بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ اندر آمادگی نہ ہو تو آدمی کچھ کر ہی نہیں سکتا۔
وہ اس محبت سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو ٹٹولا تو بات سمجھ میں
وہ پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ اور جو محبت اتنی خوب صورت کیفیتیں دے' اسے آدمی
چھوڑ سکتا ہے۔ اور یہ محبت ہی تو تھی' جس نے اسے نماز کی طرف راغب کیا تھا۔ اس
بغیر تو وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔

ایک مرحلے پر تو اس نے گھبرا کر سوچا کہ نماز ہی چھوڑ دے۔ ایسی نماز کا کیا فائدہ' جس
کسی کا تصور ہو لحہ مسلط رہے۔ اس سے تو شاید وہ اور گناہ گار ہو جائے گی۔ پھر اسے خیال
اللہ تو سب جانتا ہے۔ اس سے کچھ چھپا نہیں۔ اور نماز کی طرف راغب ہونے کے بعد
چھوڑنا تو ایسا فعل ہے کہ جس سے صرف شیطان خوش ہو سکتا ہے۔

یہ الجھن یہ کشمکش چلتی رہی۔ بس یہ ہوا کہ نماز چھوڑی نہیں۔ پھر اس نے اللہ سے ہی مدد
کا ارادہ کر لیا۔ اس روز سے وہ باقاعدگی سے دعا کرنے لگی کہ اللہ اسے یکسوئی سے نماز

پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نماز کے دوران اس کے تصور میں کوئی نہ آئے اور حمیدا بہتری کے لئے تو وہ شروع سے دعا کر رہی تھی۔

دعا سے اور کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس کی بے سکونی بتدریج کم ہوا کچھ یہ تھا کہ اسے اس سے پہلے کی نماز بھی یاد آگئی۔ اسے یاد آگیا کہ پہلے جب وہ نماز تھی تو دنیا بھر کے خیالات اور وسوسے اس کے ذہن پر یلغار کر دیتے تھے۔ اب جو ہو پہلے سے تو بہتر تھا۔ اب تو وہ صرف حمید احمد کے بارے میں ہی سوچتی تھی۔ اور دعا کے بعد یہ تبدیلی آئی کہ اس کا ذہن نماز میں ہوتا تھا۔ بس حمید احمد کا چہرہ تصور میں کس بچے کی طرح جما رہتا تھا۔

پھر بھی اسے مکمل اطمینان نہیں تھا۔ یہ خلش رہتی تھی کہ یہ بے ایمانی ہو رہی نماز کے بعد وہ اس پر اللہ سے گڑگڑا کر توبہ بھی کرتی تھی۔ لیکن خواہش کے باوجود ا کبھی یہ دعا نہیں مانگی کہ اللہ حمید احمد کی محبت ہی اس سے چھین لے۔

سلام پھیر کر اس نے دعا مانگی۔ پھر وہ اٹھ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس رکھا اور ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف ایک بری خبر کے ساتھ نسرین تھی۔ مدیحہ اسے سن کر گھبرا گئی تیسے اس نے پوری بات سنی۔ ہاں، اسے جو پوچھنا تھا، وہ نہیں بھولی۔ پھر اس نے ریسیو اور تیزی سے گھر سے نکلی۔ اسے اپنی تھکن بھی یاد نہیں رہی تھی۔

☆

مدیحہ بہت تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ کوئی دعا الفاظ کے روپ میں ا ہونٹوں تک نہیں آئی.... آ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہی تھی۔ پہلی بار اسے حمید احمد کی طرف سے کوئی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ اور ا معنوں میں اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کے لئے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

وہ سنسناتے ذہن کے ساتھ ڈرائیو کرتی رہی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر ہسپ جائے۔

اس نے گاڑی ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل کی۔ گاڑی پارک اور لاک کر کے وہ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس معاملے میں کچھ مسائل بھی ہیں۔ خبر سننے کے

انفرادی طور پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان مسائل کے بارے میں سوچنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ حمید احمد کا سامنا کیسے کرے۔ اس نے کالج چھوڑتے وقت یہ سوچ لیا تھا کہ اب شاید ان سے کبھی نہیں ملے گی۔ اس میں اب اس کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ مگر اب اس ایمرجنسی میں یہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے یہاں دیکھ کر حمید احمد کا ردعمل کیا ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ اسے بہت خراب، بہت سخت ردعمل کی توقع تھی۔

اسے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن وہ صرف ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر گاڑی کی چابیاں پرس میں ڈال کر وہ ہسپتال کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے شعبہ حادثات میں معلوم کیا۔ آئی سی یو کا سن کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ آئی سی یو میں اس کی ڈاکٹر شاہد سے بات ہوئی۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اب تک حمید احمد کا سامنا نہیں ہوا ہے۔

"معاملہ سنگین نہیں تھا۔ لیکن سنگین ہوتا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر شاہد نے کہا۔ پھر اچانک پوچھا۔ "آپ بچے کی.... کون ہیں؟"

مدیحہ ایک پل کو ہچکچائی۔ پھر بولی "میں اس کی خالہ ہوں ڈاکٹر۔ پلیز.... آپ معاملے کی سنگینی کے متعلق بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ معاملہ خون کی وجہ سے سنگین ہو گیا۔ فوری طور پر خون مل جاتا تو اتنی تشویش کی بات نہیں تھی۔ لیکن خون مسئلہ بن گیا...."

"کمال کرتے ہیں آپ۔" مدیحہ نے بگڑ کر کہا۔ "خون کا کیا مسئلہ۔ ہسپتال کے اپنے بلڈ بینک سے مل سکتا تھا۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں...."

ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "آپ خالہ ہیں بچے کی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

مدیحہ متوحش ہو گئی۔ "کیا نہیں معلوم؟"

"بچے کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے۔ آپ جانتی ہے کہ یہ خون آسانی سے نہیں ملتا۔"

"اوہ۔" مدیحہ کا دماغ سنسنانے لگا۔ اس وقت اسے اس کے سوا کوئی احساس نہیں تھا کہ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے تو ڈاکٹر اتنا پریشان ہے۔ اصل میں وہ بات سمجھ بھی نہیں سکی۔ پریشان ہی اتنی تھی۔ مگر چند لمحے بعد بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ "آپ نے کیا کہا

ڈاکٹر.... او نیگیٹو!" اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ او نیگیٹو ہے!" ڈاکٹر نے دہرایا۔

"میرا بھی او نیگیٹو ہے۔" مدیحہ نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے خون لے لیجیے

ڈاکٹر بھی ہیجان میں آ گیا۔ اس نے مدیحہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آئیے م
ساتھ۔"

آدھے گھنٹے بعد مدیحہ خون دے چکی تھی اور اب وہ خون وحید کو دیا جا رہا تھا۔ مدیح
پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھے جا رہی تھی۔ حمید احمد اسے ابھی تک نظر نہیں آئے
مہربان رب نے اسے ایک بڑی مشکل سے بچا لیا تھا۔ لیکن کب تک.... حمید احمد ک
وقت آ جائیں گے۔

ڈاکٹر شاہد نظر آئے تو وہ ان کی طرف لپکی۔ "اب وہ کیسا ہے ڈاکٹر؟"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب.... اس بچے کے والد.... حمید صاحب کہاں ہیں؟" مدیحہ نے
ہوئے پوچھا۔

"خون کی فکر میں نکلے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ بے چارے پر
رہے ہوں گے۔"

تو اب کسی بھی وقت حمید احمد آ جائیں گے۔ مدیحہ نے سوچا۔ اس مہلت سے فا
چاہیے۔ "میں چلتی ہوں ڈاکٹر۔"

"پروفیسر صاحب کے آنے تک تو رکیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"دراصل مجھے چکر آ رہے ہیں۔ گھر جا کر آرام کروں گی۔"

ڈاکٹر فکر مند ہو گیا۔ "پہلی بار خون دیا ہے نا۔ دیکھیے، اورنج جوس ضرور لیجیے گا۔ ا
آرام کریں۔ لیکن دو منٹ آپ کو استقبالیہ کاؤنٹر پر رکنا ہو گا۔" وہ مدیحہ کو لے کر
کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ...."

☆

پریشانی اور خوف سے حمید احمد کا برا حال تھا۔ یہ سب کچھ ایک فون کال سے شرو
تھا، جو انہوں نے کالج میں ریسیو کی تھی۔ پریشان تو وہ اسی وقت ہو گئے تھے، جب انہ

پرنسپل صاحب کے کمرے میں جانا پڑا تھا۔ پرنسپل صاحب نے چپراسی سے کہلوایا تھا
چھوڑ کر پرنسپل سب کچھ چھوڑ کر فوراً آ جائیں۔
کہ حمید صاحب

وہ کلاس سے پریشان حال باہر نکلے تو کچھ سٹوڈنٹس ان کے پیچھے چلے آئے۔

"خیریت تو ہے جناب؟" حمید صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پرنسپل سے پوچھا۔

"بات تو پریشانی کی ہے حمید صاحب لیکن آپ جانتے ہیں کہ پریشان ہونے سے فائدہ
نہیں نقصان ہوتا ہے۔"

"آپ بات تو بتائیں۔" حمید احمد جھنجلا گئے۔

تب پرنسپل صاحب نے انہیں بتایا۔ ان کا بیٹا وحید جس گاڑی میں سکول جاتا تھا، اس گاڑی
ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ کچھ بچے زخمی تھے۔ انہیں قریبی ہسپتال لے جایا گیا۔ ان میں وحید بھی
تھا۔ اس کی کاپی پر فون نمبر دیکھ کر ہسپتال والوں نے کالج فون کر دیا۔

"اب آپ فوراً ہسپتال جائیں۔ اور کوئی پرابلم ہو تو مجھے فون کر دیجیے گا۔ میں آپ کا
ان آنے تک کہیں نہیں جاؤں گا۔" پرنسپل صاحب نے کہا۔

حمید احمد بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ وہاں یہ مسئلہ سامنے آیا۔ وحید کو فوری طور پر خون کی
ضرورت تھی اور اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو تھا۔ حمید احمد متوحش ہو گئے۔

"اب کیا ہو گا ڈاکٹر؟"

"ہمیں جب بھی کوئی اس بلڈ گروپ والا ملتا ہے، ہم اس کا ایڈریس فون نمبر نوٹ کر لیتے
ہیں کیونکہ یہ بہت نایاب خون ہے۔ گنے چنے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر ہم ان
سے رابطہ کرتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمارے پاس ایسے سات افراد ہیں۔ ان میں سے چار
کے فون نمبر ہیں۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے دو رہائش تبدیل کر چکے
ہیں لہٰذا انہیں ہم ٹریس نہیں کر سکے۔ دوسرے دو میں سے ایک اس وقت ملک سے باہر ہے اور
دوسرا شہر سے باہر...."

"اور باقی تین؟"

"ان کے ہمارے پاس فون نمبر نہیں ہیں۔ گھروں کا پتا ہے۔ آپ ذرا انہیں چیک کریں۔
ویسے ہم نے ریڈیو سے بھی رابطہ کیا ہے۔ وہ بار بار اناؤنس کرتے رہیں گے۔"

حمید احمد اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔ انہیں یہ فکر بھی نہیں تھی کہ

وہ وحید کو اکیلا چھوڑ رہے ہیں' انہیں اماں کا خیال بھی نہیں آیا لیکن ان کے پاس
نہیں تھا۔ خون کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ جلدی خون مل جائے تو
ورنہ معاملہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سنگین ہوتا جائے گا۔

باہر نکل کر انہوں نے تینوں پتے دیکھے۔ وہ سب دور دور اور مختلف علاقوں م
انہوں نے ٹیکسی روکی اور پہلے پتے پر روانہ ہوئے۔

کورنگی' نیو کراچی اور لی مارکیٹ! یہ تین جگہیں تھیں جہاں ان کے لئے امک
انہوں نے پہلے نیو کراچی منتخب کیا۔ وہ دل میں دعا کرتے رہے کہ پہلی ہی جگہ بات ب
لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب اس پتے پر اس نام کا آدمی موجود ہی نہیں تھا۔

تینوں پتے چیک کرنے میں تین گھنٹے لگے۔ اور تیسری جگہ ناکامی کے بعد انہیں ا
ان کے جسم میں جان نہیں رہی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ انہوں نے سوچا۔ ٹیکسی ڈرائیو
ہمدرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سفر کے دوران میں وہ اسے سب کچھ بتا چکے تھے
کہاں چلنا ہے بابو جی؟" اس نے پوچھا۔

حمید احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "اب کیا ہوگا۔" اس کے پیچھے سے ایک خو
سوال نے سر ابھارا۔ "ہسپتال میں اب تک کیا ہو چکا ہوگا؟" ان پر کپکپی چڑھ گئی۔ ام
طرف دوڑتے ہوئے انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا مگر اب ناکام جستجو کے بعد یہ احسا
قیمتی گھنٹے گزر چکے ہیں' بے حد روح فرسا تھا۔

انہیں اپنا جسم بے جان ہوتا محسوس ہوا لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کے پاس گر
عیاشی کے لئے مہلت نہیں ہے۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا تھا۔ انہوں نے
نظروں سے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا۔ "ہسپتال فون کرتے ہیں پہلے۔"

ایک پی سی او سے انہوں نے ہسپتال فون کیا۔ ڈاکٹر شاہد فون پر آئے تو انہوں
بسی سے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔ "ڈاکٹر.... وہ تینوں افراد نقل مکانی کر چکے ہیں۔"

"پروفیسر صاحب! بے فکر ہو جائیں۔ خون مل گیا ہے۔ آپ کے بچے کی حالت
سے باہر ہے۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر نے کہا۔

حمید احمد کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ کبھی خوشی.... فکر سے نجات بھی آد
ڈالتی ہے۔ ان کی نگاہوں میں خالی پن تھا مگر ان کا رواں رواں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا

جلنے میں چند لمحے لگے۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ریسیور رکھا جا چکا تھا۔
واپسی کا سفر اطمینان کا تھا۔ حمید احمد وہ کچھ سوچ سکتے تھے' جو آتے ہوئے ان کے تصور
میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ غور کر سکتے تھے۔ ان کی اس وقت کی کیفیت بھی عجیب تھی۔
آدمی CRISIS کے دوران کبھی COLLAPSE نہیں ہوتا۔ کتنے ہی برے حال میں ہو'
اپنے پیروں پر کھڑا رہتا ہے لیکن CRISIS سے گزرنے کے بعد وہ کامیابی کی صورت میں
بھی COLLAPSE ہو جاتا ہے۔ صورتحال سے نمٹنے کے لئے' غیر معمولی دباؤ کو سہنے
کے لئے تنے ہوئے اعصاب معاملات سدھرنے کے بعد ڈھیلے پڑتے ہیں تو آدمی ڈھے جاتا
ہے۔ یہی اب ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔

بہت دیر تک وہ ڈھیلے جسم کے ساتھ ٹیکسی کی عقبی نشست پر پڑے رہے۔ تب کہیں وہ
وچنے کے قابل ہوئے۔ مگر پچھلے چار گھنٹوں میں.... پرنسپل صاحب سے اطلاع لے کر
بھی ہسپتال فون کرنے تک ان پر جو کچھ گزری تھی' اسے یاد کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں
ی۔ بہر حال اتنا وہ یاد کر سکتے تھے کہ وہ مر جانے کی حد تک پریشان اور خوف زدہ تھے۔
وں؟ اس لئے کہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

لیکن موت ان کے لئے اجنبی چیز نہیں تھی۔ وہ تو ہر دس سال بعد ان پر جھپٹ پڑتی
ی اور ان کی کسی عزیز ہستی کو لے جاتی تھی مگر وہ اتنے پریشان' اتنے ہراساں کبھی نہیں
دئے تھے۔

اس سے ایک مثبت نتیجہ اخذ ہوتا تھا۔ ابھی کچھ عرصے پہلے وہ یہ سوچتے رہے تھے کہ
ناید انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ وہ صرف ضرورت کے آدمی ہیں.... خود
رض۔ آدمی چلا گیا تو اس کا متبادل ڈھونڈ لیا لیکن نہیں.... آج یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ بھی
بت کر سکتے ہیں.... اور کرتے ہیں۔ ہاں.... وہ اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔
تی کہ اسے کھونے کا تصور بھی ان کے لئے موت جیسا تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی انہوں نے وحید کو دیکھا۔ اسے خون دیا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زندگی
کی سرخی چمکنے لگی تھی۔

"مجھ سے بھول ہو گئی۔" ڈاکٹر شاہد کہہ رہے تھے۔ "میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں'
اصل میں چچا' پھوپھی' ماموں' خالہ یہ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی کا خون بھی

میچ کر سکتا ہے۔

حمید احمد نے سر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اور انہیں خیال آیا کہ انہوں نے خون دینے والے کے متعلق بھی نہیں پوچھا ہے۔ "ڈاکٹر.... میرے بیٹے کو خون کس نے دیا؟"

"آپ کی سالی نے۔"

حمید صاحب بری طرح چونکے۔ "سالی.... میری تو کوئی سالی نہیں ہے۔"

"بچے کی خالہ پروفیسر صاحب!" ڈاکٹر مسکرایا۔

حمید احمد اس کی بھی نفی کرنا چاہتے تھے لیکن کسی انجانی حس نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ "نام پتا بتایا ہوگا اس نے؟"

"وہ دینا تو نہیں چاہ رہی تھیں، کہنے لگیں کہ اتنا کافی نہیں کہ میں وحید کی خالہ ہوں۔ کیونکہ وہ او نیگیٹو والی تھیں اور ہم لوگ ان کا نام پتا اور فون نمبر ضرور نوٹ کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے بالاصرار ان سے لکھوالیا۔ استقبالیہ پر موجود ہے۔"

"مجھے بتائیں تو...."

ڈاکٹر نے انٹر کام پر استقبالیہ سے رابطہ کیا۔ چند لمحے بات کرنے کے بعد وہ حمید احمد کی طرف مڑا۔ "جی.... ان کا نام مدیحہ حامد ہے۔"

حمید احمد سن ہو کر رہ گئے۔ "مدیحہ حامد.... ان کے بچے کی مسیحا! کیا ضروری ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر وہی سامنے آجائے، جسے آپ دیکھنا نہیں چاہتے ہیں اور پھر بھی نظر... آپ پر ایسا احسان بھی کردے، جس کا صلہ آپ مر کر بھی نہ دے سکیں۔ کیا یہ ضروری ہے؟"

☆

دو گھنٹے بعد وحید کو آئی سی یو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ حمید احمد تو اسے گھر لے جانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ "ابھی تو ہم نے بچے سے اس کی کیفیت بھی نہیں پوچھی ہے" اس نے کہا۔ "اور ویسے بھی سر کی چوٹ میں انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔"

اسی وقت اماں بھی ہسپتال پہنچ گئیں۔ وحید مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچا تو ایک گھنٹا پریشان رہنے کے بعد وہ اسکول پہنچیں۔ وہاں سے انہیں حادثے کا پتہ چلا اور وہ ہانپتی کانپتی ہسپتال آئیں۔ حمید احمد نے انہیں تسلی دی کہ اب وحید کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ پھر بھی وہ بیڈ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر گردش کر رہی تھیں، ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے اور وہ وحید پر نجانے کیا کیا پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔

اس وقت اماں کی موجودگی کے باوجود حمید احمد کو تنہائی کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ زندگی میں کوئی بڑا بحران آجائے تو تنہائی پسند آدمی بھی تنہائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ اماں بھی نہ ہوتیں تو وہ کتنے اکیلے ہوتے۔ اس وقت ان کے لئے کتنا بڑا سہارا ہے اماں کا۔ اور انہیں احساس ہوا کہ اس طرح کی صورت حال میں ضرورت بھیڑ بھاڑ کی نہیں ہوتی۔ بس آدمی کے ساتھ دو چار ایسے افراد ہوں، جو اس سے محبت کرتے ہوں، اسے سمجھتے ہوں۔ جنہیں اس کو تسلی دینا اسے بہلانا آتا ہو۔

اماں نے سر اٹھا کر ان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ ہونٹ ساکت ہو گئے۔ "حمید.... تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟" ان کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

پہلی بار حمید احمد کو احساس ہوا کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ لیکن ابھی بھوک تھی بھی نہیں۔ ہاں سوچنے پر چائے کی طلب ضرور ہونے لگی۔ "اماں.... کھانا تو

آپ نے بھی نہیں کھایا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے تو کھالیا ہے۔" اماں نے جلدی سے کہا۔

حمید احمد جانتے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اماں تو ان کی واپسی تک بھوکی رہتی تھیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وحید کی واپسی سے پہلے انہوں نے کھانا کھالیا ہو۔ لیکن انہوں نے بحث نہ کی۔ یہ معاملہ بات کرنے کا نہیں، عملی طور پر کچھ کرنے کا تھا۔

"تم باہر ہو آؤ۔ میں یہاں بیٹھی ہوں وحید کے پاس۔" اماں نے کہا۔ "کھانا کھا آؤ۔ تازہ دم ہو جاؤ۔ بچے کو یہ روتی صورت نہ دکھانا۔"

حمید احمد خاموشی سے باہر نکل آئے۔ وہ ہسپتال کی کینٹین کی طرف چل دیئے۔ ایک پھر انہیں تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ کینٹین میں چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد انہوں نے اس پر سوچا۔ تنہائی کا یہ احساس کیوں؟ جبکہ وہ بھیڑ بھاڑ کے قائل بھی نہیں ہیں اور اماں ان کے ساتھ ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو وحید کی پرورش کیسے ہوتی؟ وہ کیا کرتے؟ کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا انہیں۔ لیکن پھر بھی انہیں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کمی کیا ہے؟

وہ چائے پیتے ہوئے اس پر غور کرتے رہے۔ اچانک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ اگر اس وقت ان کے ساتھ سلمہ ہوتی تو زندگی میں کوئی کمی نہ رہتی۔ تنہائی کا احساس نہ ہوتا۔ بحران یہی ہوتا۔ لیکن وہ نسبتاً پر سکون ہوتے۔ کیوں؟ ان کے ذہن میں سوال ابھرا۔ وہ استدلال کے آدمی تھے۔ اس کے بغیر انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔

وہ اس سوال کا جواب سوچنے لگے۔ جواب میں انہیں وہ بات یاد آئی، جس پر انہوں نے برسوں پہلے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ انسان بے شمار رشتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جو اس کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ وہ ماں باپ کی اولاد ہوتا ہے۔ پھر دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ.... اور ان کے بچے۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو رشتوں کی ڈور میں بندھا ہوتا ہے۔ لیکن دو رشتے ایسے ہوتے ہیں، جو اس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور ماں، باپ، بہن بھائی کے ساتھ وہ سب سے قریبی رشتے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دوستی کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک ازدواجی۔

حمید احمد ایسے حالات میں جیے تھے کہ وہ کبھی کسی کو دوست نہیں بنا سکے۔ ماں کے انتقال کے بعد ان کا کسی سے قریبی تعلق نہیں رہا۔ لیکن جب شادی ہوئی تو انہیں پتہ چلا کہ قربت

کیا ہوتی ہے۔ شاید دنیا میں میاں بیوی کے رشتے سے زیادہ پہلودار کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ سلمہ ان کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ ان کی مونس، ہمدم اور غم گسار تھی۔ وہ ان کے لئے ذہنی اور جسمانی آسودگی کا باعث تھی۔ وہ ان کی بہترین دوست تھی، جسے وہ اپنے مسائل سنا کر مشورہ طلب کر سکتے تھے اور کبھی وہ کوئی دکھ بیان نہ کرنا چاہتے تھے تو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس میں ان کی شریک بن جاتی تھی۔ وہ اس کی قربت میں، اس کے جسم کی چھاؤں میں ستاتے اور اپنی ہر تھکن سے چھٹکارا پا لیتے۔ وہ اس کے ساتھ مذاق کرتے، ہنستے بولتے۔ اسے کچھ لا کر دیتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی، ان کی آسودگی، ان کی طمانیت کے لئے کوشش کرتی تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ زندگی سے ان کا رابطہ جوڑنے والی سب سے اہم کڑی تھی۔

لیکن وہ ساتھ صرف تین سال کا تھا۔ پھر سلمہ انہیں چھوڑ گئی۔ لیکن اس نے زندگی سے ان کا رابطہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ وہ جاتے جاتے زندگی کی ایک اور کڑی سے انہیں جوڑ گئی.... بیٹے وحید سے۔ اور اس وقت ان کی اپنی عمر تیس سال تھی.... صرف تیس سال۔

وہ استدلال کے آدمی تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن خود سے تفصیلی بحث کر لی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کچھ رشتہ ایسے ہوتے ہیں، جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اور ایسا ہر رشتہ وہ ابتداء ہی کھوتے آئے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو ماں نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ ہاں.... اس کی پرورش کے لئے اہتمام وہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے مزید حساب لگایا۔ ان کی اپنی ضرورت چھوٹی نہیں، بہت بڑی تھی۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے مقابلے میں اہم نہیں تھے۔ ان کا بیٹا مستقبل تھا۔ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرتے تو بچے کی پرورش اس انداز میں کی جانی ناممکن ہو جاتی۔ جیسی وہ چاہتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ انہیں فیصلہ کرنا تھا اور انہوں نے کر لیا۔ وہ اپنی تمام ضرورتوں کو بھول گئے۔ بیٹے کی پرورش کو انہوں نے زندگی کا محور بنا لیا۔ وہ ابتدا ہی سے ایسے آدمی تھے، جن کے لئے سب سے اہم چیز زندگی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے محرومیوں کو ذہن سے جھٹک دینا ان کی عادت تھی۔ ایسے میں انہیں اپنی کوئی محرومی یاد نہیں آتی تھی۔

لیکن آج انہیں اس کمی کا احساس ہوا تھا۔ کوئی ہوتا جو ان کے بالوں میں انگلیاں لہرا کر کہتا ....پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ دیتے۔

اس انداز میں سوچتے ہوئے اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ اب بھی ایک پھل دار درخت کی طرح ہیں' جس پر پھول کھلتے ہیں۔ لیکن پھل بننے کی بجائے سوکھ کر گر جاتے ہیں۔ انہوں نے لاکھ بھول جانے کی کوشش کی ہو۔ لیکن وہ اب بھی وہی ہیں جو سلمہ کی موت اور وحید کی پیدائش کے وقت تھے۔

انہیں یاد آیا کہ ان کا بیٹا ابھی کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا اور وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور انہیں دلاسا دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ تھے.... بالکل تنہا۔

اسی لمحے ان کے اندر سے تردید ابھری۔ ایسی بات تو نہیں۔ دلاسا دینا تو چھوٹی بات ہے کسی نے ان کی عملاً مدد کی.... اور ایسی مدد' جو وہ تلاش کر رہے تھے اور انہیں کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہاں.... ان کے بیٹے کی زندگی کسی کے خون کی مرہون منت تھی۔

اب وہ مدیحہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھے۔ اس نے ان پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور جتانا تو دور کی بات' اس نے ان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں یاد آیا' مدیحہ نے کبھی ان سے کہا تھا۔ شاید میں کبھی آپ کے کام آسکوں اور انہوں نے بڑی رعونت سے کہا تھا.... تقریباً ناممکن ہی ہے مگر آج وہ ان کے اس طرح کام آئی تھی کہ جس کا وہ صلہ دے ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا.... اب کبھی ہم ملے تو اس کا سبب آپ کی کوئی ضرورت ہوگی' میری نہیں.... اس کی یہ بات بھی سچی تھی۔ لیکن اس نے ان کی ضرورت پوری کر دی تھی اور ملی پھر بھی نہیں تھی۔

حمید احمد کے اندر جھنجلاہٹ ابھری۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوچا تو بات آگے بڑھے گی اور یہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں زندگی کی پیچیدگیاں پسند نہیں تھیں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ ہسپتال سے انہیں اس کا پتہ بھی مل سکتا تھا اور فون نمبر بھی۔ فون کر کے شکریہ ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں.... خوفزدہ ہیں۔ وہ اس کی محبت سے خوف زدہ تھے۔ جب انہیں اس کی محبت کا علم ہوا تھا' لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا مرکز و محور وہ خود ہیں' تو انہوں نے دو باتیں سوچی تھیں۔ ایک یہ کہ

لگا محبت انہوں نے ہی کسی سے کی ہوتی۔ دوسرے انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر کبھی لگا محبت کوئی ان سے بھی کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اس وقت بھی انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کاش یہ محبت اس لڑکی نے ان سے کی ہوتی اور بعد میں انہیں پتہ چلا کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے تو انہیں بہت برا لگا تھا۔ مگر یہ اوپر کی بات تھی اور شاید وہ اندر کی بات سے خوف زدہ تھے۔ وہ کریدنا.... اندر جھانکنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی ایسی بات نہ نکل آئے' جو شرمندگی کا باعث ہو۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کاؤنٹر سے اماں کے لئے بسکٹ کا پیکٹ اور پیپر کپ میں چائے لے لی تھی۔

☆

مدیحہ ہسپتال فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ روز فون پر نسرین سے بات کر لیتی تھی۔ اگلے روز اسے پتہ چلا تھا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے اور اگلے روز اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

تیسرے روز نسرین نے اسے بتایا کہ حمید احمد بہت پریشان ہیں۔ تاہم انہوں نے اب تک کالج سے چھٹی نہیں کی ہے۔ لیکن وہ ذہنی طور پر الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی غائب دماغی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی پریشانی سے دوچار ہیں۔

مدیحہ سوچتی رہی۔ یہ طے تھا کہ پریشانی بچے ہی کی طرف سے ہوگی۔ لیکن کیا.... خدانخواستہ....؟

کئی بار ارادے باندھنے اور توڑنے کے بعد بالآخر اس نے ہسپتال کا نمبر ملا ہی لیا۔

"میں ڈاکٹر شاہد سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ شام پانچ بجے ڈیوٹی پر آئیں گے۔" اسے بتایا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو فون کر لوں گی۔"

شام چھ بجے اس نے دوبارہ فون کیا تو ڈاکٹر شاہد سے بات ہو گئی۔

"کون مس حامد' او نیگیٹو والی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ بتایئے' وحید اب ٹھیک ہے نا؟"

"آپ تو اس کی خالہ ہیں۔ ڈائریکٹ معلوم کر سکتی ہیں۔ آپ اسے دیکھنے بھی نہیں

گئیں؟" ڈاکٹر نے الٹا سوال کیا۔

مدیحہ صرف ایک لمحے کو ہچکچائی۔ "دراصل ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر نے کہا۔ "اس روز پروفیسر صا
نے کہا کہ ان کی کوئی سالی نہیں ہے۔ اور مجھے پتہ چلا کہ بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے
اکثر ہوتا ہے۔ لوگ سسرال سے تعلق توڑ لیتے ہیں۔"

"ڈاکٹر.... میرے لئے اس بچے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ وہ آپ کی مرحوم بہن کی نشانی ہے نا۔" ڈاکٹر نے گہری سانس
"دراصل ہم سر کی چوٹ کی طرف سے تشویش میں تھے۔ اسکین کرایا تو ایک اور پرابلم
آئی۔ بچے کے دماغ میں چھوٹی سی رسولی ہے۔"

"رسولی؟" مدیحہ پریشان ہو گئی۔ "معاملہ سنگین ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ ہم نے نیورو سرجن سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آ
ضروری ہے۔ رسولی بڑھ گئی تو پیچیدگیاں بھی بڑھ سکتی ہیں۔"

"چانسز کیا ہیں؟"

"نیورو سرجن ڈاکٹر اشفاق پرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ عام GROWTH
بچہ مکمل طور پر شفایاب ہو جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ...."

"اللہ نہ کرے۔" مدیحہ نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی۔ "یہ بات حمید صاحب کو
گئی؟"

"جی ہاں۔ پروفیسر صاحب پریشان ہو گئے تھے۔ دراصل یہ بہت مہنگا آپریشن ہے
لئے وہ ہچکچا رہے ہیں۔"

مدیحہ کی الجھن تو رفع ہو گئی۔ مگر دوسری الجھنیں شروع ہو گئیں۔ "کتنا خرچ ہو
صاحب؟"

"ہمارا اندازہ اٹھارہ ہزار روپے کا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب!"

"یو آر ویل کم۔"

ریسیور رکھنے کے بعد مدیحہ سوچتی رہی۔ حمید صاحب پریشان تھے وہ اور کیا کر سکتے

مجھ سکتی تھی کہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہو گی۔ اور وہ ایسے آدمی بھی نہیں تھے کہ کسی سے
مدد مانگتے۔ جبکہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

مدیحہ کو اس سلسلے میں صرف ایک ہی زاویئے سے سوچنا تھا۔ یہ اللہ کی عنایت تھی کہ وہ
ان کی مدد کر سکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایسے خود دار آدمی کی کس طرح مدد کی جائے جو اپنی
ضرورت کسی کو بتائے بھی نہیں۔ اب یہاں تو خوش قسمتی سے پتہ چل گیا تھا کہ ان کی
ضرورت کیا ہے۔ مدد اس طرح کرنی تھی کہ انہیں احساس نہ ہو کہ ان کی مدد کی جا رہی ہے۔
اس انداز میں کرنی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکیں۔ ان کی انا کو، ان کی خود داری کو ٹھیس بھی نہ
لگے۔

یہ کام ویسے بھی آسان نہیں تھا۔ جبکہ یہاں تو ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ مدیحہ خود براہ
راست کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سامنے آ جاتی تو حمید احمد بری طرح بھڑک جاتے۔ پھر تو
وہ کسی بھی طرح مدد قبول نہ کرتے۔

مدیحہ غور کرتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے ایک نہیں، کئی جھوٹ
بولنے ہوں گے۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ لیکن معاملہ ایک انسانی زندگی کا ہی نہیں،
اس کے محبوب کی سب سے قیمتی متاع کا بھی تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے پاپا سے مدد لینا ہو گی۔ پاپا کو
قائل کر لینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔

☆

بلقیس بیگم دیکھ رہی تھیں کہ حمید احمد اب بھی پریشان ہیں!

وحید کو تیسرے دن ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ وہ اسے گھر لے آئی تھیں۔ حمید احمد
کالج گئے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے کالج سے چھٹی نہیں کی تھی۔
"ہاں.... کالج تو بس چند روز کا ہے۔ پھر چھٹیاں ہو جائیں گی۔" انہوں نے کہا۔ "مگر اس
عرصے میں چھٹی نہیں کر سکتا۔ اسٹوڈنٹس کے لئے یہ ایک ایک دن اہم ہے۔ امتحان کی
تیاری کا معاملہ ہے۔"

بلقیس بیگم کو حمید احمد پر ہمیشہ فخر ہوتا تھا۔ اس بار بھی ہوا۔ وہ کتنے ذمے دار آدمی تھے۔
معاملہ اکلوتے بیٹے کا تھا، جس کے نام پر انہوں نے اپنی ذات، اپنی ضروریات کو تج دیا تھا۔ وہ

زندہ ہی اس کی خاطر تھے مگر ایکسیڈنٹ کے بعد سے انہیں سونے کا کجا' آرام کرنے کا بھی نہیں ملا تھا۔ وہ صبحیں ایسی گزری تھیں کہ وہ صبح چھ بجے گھر واپس گئے۔ وہاں تیاری کر کے وہ کالج گئے ہوں گے۔

بلقیس بیگم نے ایک پورا دن ہسپتال میں وحید کے ساتھ گزارا تھا۔ ڈاکٹر شاہد انہیں اچھے لگے تھے۔ وہ ہر لمحہ مسکرانے والے ملنسار آدمی تھے۔ وہ ہسپتال آئی نہیں تو بہت برا تھیں۔ اور انہوں نے وحید کے متعلق ڈاکٹر شاہد سے پوچھا تھا۔

"اب یہ ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر شاہد نے کہا تھا۔ "لیکن آ پروفیسر صاحب کو سمجھائیں۔ انہیں اپنے سسرال والوں سے صلح کر لینی چاہئے۔ اچھے ل ہیں۔ اس وقت ان کی سالی نے خون نہ دیا ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب لگی۔ حمید احمد نے کبھی انہیں اپنے سسرال کے متعلق نہ تھا۔ انہوں نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔ لیکن نہ پوچھنا اپنی جگہ۔ یہ سوچنا تو چاہئے انہیں۔ سسرال تو ہوگا حمید احمد کا۔ اور اس طرح کی صورت حال میں ایسا ہوتا ہے۔ لڑکی ماں باپ بچہ مانگ لیتے ہیں پالنے کے لئے۔ انہیں اعتبار نہیں ہوتا کہ ان کا داماد دوسری نہیں کرے گا۔ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ وہ بچے کی اچھی طرح پرورش کر سکے گا۔ اور احمد اپنا بیٹا کسی کو نہیں دے سکتے تھے۔ اس پر ناراضگی ہوئی ہو گی۔ بات بڑھی ہو گی۔... اس حد تک کہ تعلقات ختم ہو گئے ہوں گے۔

"تو وحید کی خالہ نے خون دیا تھا۔" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس پر ڈاکٹر شاہد نے انہیں او نیگیٹو کی کمیابی کے متعلق بتایا۔

"اس کا نام کیا تھا؟"

"آپ کو بھی نہیں معلوم؟" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

بلقیس بیگم ایک لمحے کو گڑبڑائیں۔ پھر انہوں نے بات بنادی۔ "کئی خالائیں ہیں نا! ا میں جاننا چاہتی ہوں کہ خون کس نے دیا ہے۔"

"اوہ۔ ان کا نام مدیحہ تھا۔"

صورت حال ایسی تھی کہ انہیں مدیحہ کا نام یاد نہ آتا۔ لیکن جب وہ گھر آئی تھی تو ا نے محسوس کیا تھا کہ وہ حمید احمد سے محبت کرتی ہے اور وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ تج

ہ اس کے بعد وہ اپنی واحد محرومی یعنی بہو کے بارے میں پرامید ہو کر سوچنے لگیں۔ اور جب اس نے اپنا نام بتایا..... مدیحہ.... تو انہوں نے سوچا تھا کہ یہ نام حمیدہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ صرف حروف کے الٹ پھیر کی بات تھی۔

تو انہیں مدیحہ یاد آگئی۔ "اچھا' مدیحہ۔ ہاں' بہت پیاری لڑکی ہے وہ۔" انہوں نے کہا۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی وہ مدیحہ کے بارے میں سوچتی رہیں۔ وہ ہمیشہ سے اس بات کی قائل تھیں کہ کوئی بات' کوئی کام' کسی کا کسی سے ملنا.... کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ دنیا میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا۔ اتفاق انسان اسے کہتے ہیں' جس کے پیچھے لگے ہوئے اسباب کا تسلسل انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بس اچانک.... بغیر کسی وجہ کے ہو گیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ مسبب الاسباب رب کا منظم و مرتب حکم ہوتا ہے۔

مدیحہ گھر آئی۔ اس نے چائے پی' ان سے باتیں کیں' حمید احمد کی شادی کا البم دیکھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گی۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی تھی کہ اس کا آنا اتفاق نہیں ہے۔ وہ حمید احمد سے ملی تھی۔ ان کے درمیان کچھ ضرور تھا اور یقیناً حمید احمد نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتی کہ وہ یہاں دوبارہ نہیں آئے گی۔ تو یقیناً یہ اتفاق نہیں تھا۔

پھر وحید حادثے میں زخمی ہوا۔ معاملہ سنگین نہیں تھا۔ بس اسے خون کی ضرورت تھی.... فوری طور پر۔ اور اس کا خون ایسے گروپ کا تھا' جو آسانی سے تو کیا' کبھی کبھی مشکل سے بھی نہیں ملتا۔ اور خون ملنے میں تاخیر معاملے کو سنگین بنا رہی تھی۔ زندگی کو خطرہ لاحق ہونے لگا تھا۔ غیر اہم بات اہم ہو گئی۔ تو یہ جو وحید کا خون تھا' یہ تو پیدائش سے ہی اس کے جسم میں تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ اس کے خون کا گروپ او نیگیٹو تھا۔ یہ رب کی مرضی تھی' مشیت تھی۔ اور مجبور باپ بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے خون کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ اور جن لوگوں کی رگوں میں اس گروپ کا خون تھا' وہ سب کے سب گھر بدل چکے تھے۔ یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مسبب الاسباب رب کا حکم تھا۔

اور مدیحہ کو اس کالج میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس حادثے کا علم ہو گیا' یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ اور وہ ہسپتال آئی.... اور اس کے خون کا گروپ بھی وہی تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ یہ رب کا سوچا ہوا' ترتیب دیا ہوا اسباب کا سلسلہ تھا۔ یہ طے ہے کہ اللہ نے وحید کی زندگی لکھی

تھی تو اس کو خون دینے کے لئے کسی کو تو آنا تھا۔ اور اللہ چاہتا تو کوئی بھی آ جاتا لیکن نہیں.... اللہ نے یہ کام اس مدیحہ کو ہی سونپا تھا۔ یہ اسی کے ذریعے ہونا تھا۔

تو مدیحہ کی کوئی اہمیت تھی.... حمید احمد کے 'وحید کے' اس گھر کے لئے۔ ورنہ اللہ نے یہ کام کسی اور سے لے لیا ہوتا۔

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ بلقیس بیگم کے ذہن میں ایک لفظ گردش کرنے لگا "بہو!" اللہ کرے 'ایسا ہو جائے۔

لیکن اس روز حمید احمد گھر واپس آئے تو بہت پریشان تھے اور وہ دیر سے بھی آئے تھے۔ بلقیس بیگم نے وجہ پوچھی تو بولے کہ کالج میں کام زیادہ ہے۔ چھٹیاں ہونے والی ہیں اور ان کے بعد امتحان ہوں گے۔

حمید احمد نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بلقیس بیگم ان سے مدیحہ کے متعلق بات کرنے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بات شروع کر ہی دی۔ "اللہ کا شکر ہے' وحید خیریت سے گھر آ گیا۔ اللہ نے بڑا کرم فرمایا۔"

"جی اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"سنا ہے 'خون کا بڑا مسئلہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں اماں۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے 'جو بہت کم لوگوں کا ہوتا ہے۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر بات نہیں بنی۔ میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"کسی نے خود ہی ہسپتال آ کر خون دے دیا۔" حمید احمد نظریں چرانے لگے۔

بلقیس بیگم تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہیں۔ "وہ تو رحمت کا فرشتہ ہی ہوا ہمارے لئے۔ احسان ہے اس کا ہم پر۔"

"جی ہاں اماں۔ اللہ جس سے جو کام چاہے 'لے لیتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔" حمید احمد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کون تھا وہ؟"

حمید احمد نے یوں پہلو بدلا 'جیسے اس جواب سے بچنے کی راہ تلاش کر رہے ہوں۔ انہوں نے کہا۔ "کوئی لڑکی تھی اماں؟"

"تم نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا؟"

"نہیں۔ میں نے بتایا نا اماں کہ وہ لڑکی تھی۔" حمید احمد کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ احسان تو احسان ہے 'کسی نے بھی کیا ہو۔"

"میرے پاس اس کا پتہ نہیں ہے۔"

حمید احمد چھپا رہے تھے۔ اور اب بلقیس بیگم انہیں پکڑ کر شرمندہ ہی کرتیں۔ "ارے میاں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ میں ہسپتال والوں سے بات کر لوں گی۔"

"آپ کچھ نہ کریں۔ میں معلوم کر لوں گا اور اس کا شکریہ بھی ادا کر دوں گا۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا۔ پھر وہ اٹھ ہی گئے۔ "کچھ کام نمٹانا ہے اماں۔"

بلقیس بیگم ان کی پریشانی دیکھ کر پریشان ہوتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آ رہی تھی۔ بیٹا خیریت سے گھر آ گیا۔ اب کیا بات ہے۔

رات کے کھانے کے بعد بلقیس بیگم نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ "تم بہت پریشان ہو بیٹے! کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں اماں۔"

بلقیس بیگم کی تشویش زبان پر آ گئی۔ "وحید کی طرف سے کوئی پریشانی ہے؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟"

اس پر حمید احمد بری طرح بھڑک گئے۔ "کیسی بات کرتی ہیں اماں! اسے کوئی خطرہ ہوتا تو ہسپتال والے اسے چھٹی کیوں دیتے۔"

یہ بات معقول تھی.... سمجھ میں آنے والی۔ بلقیس بیگم مطمئن ہو گئیں۔ "تو پھر کیا بات ہے؟"

"کالج کے کچھ معاملات پریشان کر رہے ہیں اماں۔"

بات ختم ہو گئی۔ لیکن اس رات انہوں نے دیکھا کہ حمید احمد سوتے سوتے اٹھے اور وحید کے پاس جا کر اسے بہت غور سے دیکھنے لگے۔ پھر وہ اس کا سر سہلانے لگے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ اپنے بستر پر جا لیٹے۔ اس رات انہوں نے ایسا کئی بار کیا۔

بلقیس بیگم نے مداخلت نہیں کی کہ پریشان آدمی کو اور پریشان کرنے سے کیا حاصل اور وہ بے اولاد تھیں۔ لیکن سمجھ سکتی تھیں کہ حمید احمد اکلوتے بیٹے کی طرف سے کتنے خوف زدہ ہو

گئے ہیں۔ انہوں نے تقریباً اسے کھو ہی دیا تھا۔ ان کا خوف فطری تھا۔

صبح انہوں نے حمید احمد سے کہا۔ "بیٹے.... ڈرو مت۔ اللہ کی امانت ہے۔ اللہ ہی حفاظت کرے گا۔ اور اس نے کی بھی۔ شکر ادا کرو اس کا۔"

حمید احمد کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری۔ "میں بلاوجہ کبھی نہیں ڈرتا ابا۔ اچھا.... آج میں دیر سے گھر آؤں گا۔"

☆

حمید احمد بہت پریشان تھے!

جس روز وحید ڈسچارج ہوا' وہ کالج سے پہلے ہسپتال گئے اور ڈاکٹر شاہد سے ملے۔ ڈاکٹر نے انہیں جو کچھ بتایا' اس نے انہیں دہلا دیا۔ اٹھارہ ہزار روپے! جبکہ وہ جانتے تھے سب مل ملا کر جو اخراجات ہوں گے' وہ پچیس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔ اور ان کے پاس میں بمشکل تین ہزار ہوں گے۔

وہ ہسپتال سے گھر آئے تو ان کے دماغ پر وہی پچیس ہزار چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کی باتیں ان کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ آپریشن جتنی جلدی ہو جائے' بہتر ہے۔ جتنا لگے گا' اتنا ہی معاملہ بڑھنے اور بگڑنے کا خدشہ ہے۔ صرف تین دن لگیں گے۔ تین دن آپ بچے کو گھر لے جائیں گے۔

ان سے نہ ٹھیک سے کھانا کھایا گیا' نہ سویا گیا۔ رات کو کئی بار وہ اٹھے اور انہوں نے و دیکھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے انہوں نے دل میں کہا۔ بیٹے.... تم کھو جاؤ گے؟ نہیں میں نے سب کچھ گنوا کر صرف تمہیں پایا ہے۔ تم بہت قیمتی ہو۔ تمہاری خاطر میں نے کچھ چھوڑ دیا۔ خود کو بھی بھول گیا۔ مجھے تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہئے۔ تم صرف بیٹے نہیں ہو میرے بیٹے.... تم میرے باپ دادا' میری نسلوں کی امانت ہو۔ تمہیں کچھ ہونا چاہئے۔

وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ پچیس ہزار کا بندوبست کہاں سے کریں۔ زندگی میں انہوں کوئی دوست نہیں بنایا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ اتنی بڑی رقم مانگ سکتے۔ اور آپر جلد سے جلد کرانا تھا۔ ایک ہفتے بعد کالج کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں.... پندرہ دن اس عرصے میں انہیں لازمی طور پر وحید کا آپریشن کرا لینا تھا۔ کیونکہ پھر امتحان شرو

ع اور وہ مصروف ہو جائیں گے۔ پہلے INVIGILATION پھر امتحانی پرچوں کی چیکنگ کا کام۔ اس میں انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ وحید کی طرف سے پریشان نہ رہیں۔ یعنی آپریشن ہو چکا ہو۔

وہ پچیس ہزار کے بارے میں سوچتے تو انہیں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وہ کہاں سے بندوبست کریں اس رقم کا۔ نہ وہ کسی سے مانگ سکتے ہیں۔ نہ کسی سے مل سکتی ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں' جسے بیچ کر یہ ضرورت پوری کر سکیں۔

اسی لمحے ان کے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ ایک ایسی چیز ہے ان کے پاس۔ ایک ہی چیز۔ زندگی میں وہی ایک چیز تو انہوں نے بنائی ہے.... مکان! ہاں یہ اس ضرورت میں ان کے کام آئے گا۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔ اللہ وحید کو زندگی دے۔ وہ کرائے کے مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔ مکان تو انہیں پھر بھی مل سکتا ہے۔ اور ملے نہ ملے، یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ بس وہ مکان بیچ دیں گے۔

اس فیصلے کے بعد انہیں سکون آ گیا اور وہ سو گئے۔

اگلے روز کالج سے واپسی پر وہ اس مشن پر نکلے۔ انہوں نے علاقے کی اسٹیٹ ایجنسیوں سے بات کی۔ اس کے نتیجے میں ان کی مایوسی بڑھ گئی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اپنا مکان بیچیں گے، پیسہ ہاتھ میں آئے گا اور ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پتہ چلا کہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ان کا مکان لیز نہیں تھا۔ کاغذات ہوتے تو وہ انہیں رکھوا کر بینک سے قرضہ لے سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی دفتری کارروائی میں وقت لگتا۔

"وقت کی گارنٹی کہیں سے بھی نہیں مل سکتی ماسٹر صاحب!" اسٹیٹ ایجنٹ نے ان کا مرتبہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں۔ یہ بات تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ یہ دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ بیچنے والا موجود ہے' خریدنے والا کوئی نہیں تو بات کیسے بنے گی۔ اور خریدنے والا پیسہ لیے کھڑا ہے' بیچنے والا نہیں ہے تو بھی کام نہیں ہو گا۔ یہ ان دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ ہم تو درمیانی پارٹی ہیں.... دو پرسینٹ والی۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد سودا کر کے اپنا کمیشن لیں۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"میں نے کہا نا ماسٹر صاحب، خریدار کے بغیر تو کچھ نہیں ہوتا۔ میں کوشش کروں گا۔"

تلاش کروں گا۔"

"مجھے جلدی نہ ہوتی.... فوری ضرورت نہ ہوتی تو مکان کسی قیمت پر نہ بیچتا۔" حمید احمد کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"یہ بات دوسری پارٹی کو پتہ نہ چلنے دینا ماسٹر صاحب!" اسٹیٹ ایجنٹ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "ورنہ آپ کی پراپرٹی کے دام گر جائیں گے۔"

"کچھ بھی ہو جائے۔ دام گر جائیں۔ میری ضرورت تو وقت پر پوری ہو جائے۔"

اسٹیٹ ایجنٹ نے انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "دیکھو ماسٹر جی! ان کاموں میں وقت لگتا ہے۔ پارٹی پکی ہو، تب بھی بارگیننگ میں تین چار دن تو لگتے ہیں۔ پھر پارٹی کہتی ہے کہ دو دن بعد بیعانہ لے کر آئے گی۔ کبھی اس میں بھی دو کی جگہ چار دن لگ جاتے ہیں۔ پھر پارٹی بیعانہ دے کر فل پے منٹ کے لئے وقت مانگتی ہے۔ کبھی مہینہ، کبھی دو مہینے۔ یہ سارا کھڑے گھاٹ تو نہیں پٹتا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم حرام کی کھاتے ہیں۔ پر کوئی کام کریں تو پتا چلے۔ دونوں پارٹیوں کے بیچ گھومتے گھومتے جوتے گھس جاتے ہیں، ٹانگیں دکھ جاتی ہیں، تب کہیں ٹو پرسینٹ ملتا ہے ہمیں۔"

حمید احمد کو اس وقت اپنی ضرورت کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ وہ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں منہ مانگا کمیشن دوں گا۔ بس تم یہ کام جلد سے جلد کرا دو۔ زیادہ سے زیادہ دس دن میں۔"

"ماسٹر صاحب، ہم کو بس اپنے کمیشن سے غرض ہوتی ہے۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "پر آپ سادہ آدمی ہیں۔ ضرورت مند بھی ہیں۔ مجھے آپ پر ترس آتا ہے۔ دیکھیں، اتنی جلدی یہ کام ہوتا نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ آپ اپنا مکان کوڑیوں کے مول بیچ دیں تو یہ تو بہت بڑا نقصان ہو گا۔"

"مثلاً؟"

اسٹیٹ ایجنٹ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میں نے آپ کا مکان دیکھا ہے۔ اچھا بنا ہے۔ ٹھیک ٹھاک بنا ہوا بھی ہے۔ میرے خیال میں اس کی قیمت تین لاکھ سے اوپر ہونی چاہئے۔ آپ مجھے وقت دیں تو میں اسے ساڑھے تین میں ضرور بکوا دوں گا۔ ممکن ہے، کوئی اس کا چار بھی دے مرے۔ لیکن دس دن....! اب ماسٹر صاحب، آپ کہیں کہ آپ

ایک لاکھ میں یا پچاس ہزار میں بیچ رہے ہیں تو یہ فوراً بھی بک سکتا ہے۔"

حمید احمد نے سوچا۔ فرق بہت بڑا تھا۔ اور مکان ان کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ وہ جھجکنے لگے۔ پھر انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کروں۔ مجھے فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"آپ ایسا کرو۔ کل تک سوچ لو۔ پھر مجھے بتا دینا۔ پر ایسے سودے میں ہمیں کچھ ملتا نہیں۔ پھر ایسے مکان بکنے لگیں تو ہم لوگوں کا تو دھندا ہی ختم ہو جائے گا۔"

حمید احمد بچے نہیں تھے۔ انہیں اسٹیٹ ایجنٹ کے چہرے پر سچ صاف لکھا نظر آ گیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ ان کے لئے گاہک ہرگز تلاش نہ کرتا۔ اتنے سستے داموں تو وہ خود ہی ان کا مکان خرید لیتا۔ یوں اسے بھاری منافع ہوتا۔ "ٹھیک ہے۔ میں کل آؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

وہ باہر آئے تو ان کے قدم ہی نہیں، دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری اسٹیٹ ایجنسیوں میں صورت حال اس سے بھی بدتر رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بے حد مایوس تھے۔

اگلا دن بھی یونہی گزرا۔ اس روز سب سے پہلے وہ لیز آفس چلے گئے۔ وہاں اور تلخ تجربہ ہوا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مکان لیز کرا کے، اس کے کاغذات جمع کرا کے قرضے کے لئے کارروائی کریں گے۔ مگر پتہ چلا کہ لیز کرانا بھی آسان کام نہیں۔ دفتری کارروائیاں اتنی طویل ایسی ہیں کہ روٹین میں اس کام کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور اگر ہوا تو مہینوں لگ جائیں گے۔ ہاں.... پندرہ ہزار روپے خرچ کئے جائیں تو کام تین دن میں ہو سکتا ہے۔ اور پندرہ ہزار ان کے پاس ہوتے تو وہ یہ سب کچھ کرنے کی بجائے وحید کو ہسپتال ہی لے جاتے۔

اگلے روز وہ صرف اسی اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس گئے، جس نے انہیں سوچنے کو کہا تھا۔ انہوں نے اس کے مشورے پر عمل کر کے سوچا بھی تھا۔ ساڑھے تین لاکھ کے مکان کو ایک لاکھ میں بیچنا بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ لیکن وہ اس کا کیا کرتے کہ یہ مجبوری بھی تھی۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ ان کی اپنی زندگی بھی نہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ یہ سودا تو ضرورت سے ایک دن پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی کرنا ہے تو اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے دن اور جگہ کوشش کر لی جائے۔ کچھ نہ بنا تو یہ راستہ تو ہے۔

اگلے روز اسٹیٹ ایجنٹ زیادہ اپنائیت سے پیش آیا۔ "آؤ ماسٹر صاحب! چائے پیو گے یا ٹھنڈا

منگاؤں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب گھر جا کر آرام کروں گا۔ رات ہو رہی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"پھر کیا سوچا آپ نے؟"

"یہ بتاؤ' تم میرا مکان ایک لاکھ روپے میں اس طرح بکوا سکتے ہو کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر رقم مجھے مل جائے۔"

ایجنٹ نے انہیں بہت غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ "اس بات کی گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں آپ کی خاطر سب کچھ کرلوں گا۔ پورا پے منٹ نہ بھی ہوا تو پچیس ہزار فوری طور پر ضرور دلوا دوں گا۔"

حمید احمد مطمئن ہو گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ "بس اب میں سودے کی بات کر آؤں گا۔"

لیکن گھر کی طرف جاتے ہوئے ان کا دل کٹنے لگا۔ ساڑھے تین لاکھ کا مکان.... وہ اسٹیٹ ایجنٹ کے بازار کے حساب سے۔ ان کے حساب سے تو اس کا کوئی مول ہی نہیں تھا اور وہ صرف ایک لاکھ میں بک جائے گا اور وہ بے گھر ہو جائیں گے۔ دوسرا مکان بنانے کی انہیں مہلت ملے نہ ملے۔ ایک عمر درکار ہوتی ہے مکان بنانے کے لئے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ابھی ان کے پاس آٹھ دن کی مہلت ہے۔ اللہ اس میں کوئی سبیل کر دے تو....

انہیں نہیں معلوم تھا کہ سبیل ہو چکی ہے!

☆

اماں نے ان سے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ "بھوک نہیں ہے اماں۔"

اماں پریشان ہو گئیں۔ "کیا بات ہے بیٹے؟ بہت پریشان ہو؟"

"نہیں اماں۔ بس تھکا ہوا ہوں۔" حمید احمد اماں کو یہ سب کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اچانک اماں کو کچھ یاد آگیا۔ "ارے ہاں.... تم سے ملنے کوئی صاحب آئے تھے.... بڑی سی گاڑی میں۔ کافی دیر بیٹھے۔"

حمید احمد الجھنے لگے۔ گاڑی میں ان سے ملنے کون آسکتا ہے۔ انہیں فوراً مدیحہ کا خیال آیا۔ لیکن اماں کے بیان کے مطابق وہ کوئی مرد تھا۔ "کیا نام بتایا تھا؟"

"نام تو مجھے یاد نہیں۔ کچھ دے کر گئے ہیں تمہارے لئے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے.... حمید صاحب سے سفارش کرنا بہن کہ میرا کام کر دیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

اماں نے انہیں جو چیزیں لا کر دیں، ان میں ایک وزیٹنگ کارڈ تھا' ایک رقعہ تھا اور ایک بند لفافہ۔ حمید احمد کا تجسس سے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے کارڈ کو نظر انداز کر دیا اور سب سے پہلے رقعہ کھولا۔

"حمید صاحب!

ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی انٹر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اسے شہریت کے لئے ٹیوشن چاہئے۔ کسی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا اور میں حاضر ہو گیا۔ امتحان تک آپ اسے پڑھا دیجئے تو مجھ پر احسان ہو گا۔ اس کا صلہ تو میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ اپنی بساط کے مطابق چھوٹا سا ایک نذرانہ پیش کر رہا ہوں۔ لفافے میں چیک ہے۔ اسے قبول کر لیں۔ نامنظور ہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ تیار ہوں تو فون کر کے مجھے بتا دیجئے گا۔ میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے' آپ ایک گھنٹا پڑھا دیں

توکافی ہو گا۔ گاڑی آپ کو چھوڑ بھی جایا کرے گی۔ میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ فقط
ایچ ایچ صدیقی۔"

اس رقعے کو پڑھ کر حمید احمد کشمکش میں پڑ گئے۔ یہ ان کا اصول تھا۔ انہوں نے کبھی ٹیوٹر گوارا نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت انہیں پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ایسی کہ وہ اس کے لئے اپنا مکان بھی بیچ سکتے تھے۔ تو کیا وہ ٹیوشن نہیں....

انہوں نے حساب لگایا۔ اگر ابھی سے پڑھائیں تو یہ صرف ایک ماہ کا معاملہ ہے۔ اور ا مہینے کی فیس کوئی کتنی دے سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار.... دو ہزار! اور اس سے کیا ہو کچھ بھی نہیں!

ان کا جی چاہا کہ تینوں چیزیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ مگر اندر سے کوئی چیز انہیں روک ر تھی۔ خاصی دیر وہ ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولا۔ اس میں چ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چیک کو دیکھا۔ ہندسوں میں جو کچھ لکھا ہوا تھا اسے د کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ 30000\=

وہ ہندسوں کو گھورتے رہے، جیسے وہ ان کا وہم ہیں اور کسی بھی لمحے تحلیل ہو جائیں گ لیکن ہر صفر اپنی جگہ ضدی پن سے ڈٹا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ تک ایک گھنٹہ پڑھانے کا معاوضہ اتنا کون دے سکتا ہے۔ تین ہزار بھی بہت زیادہ ہی کہلائے گا۔ یقیناً صفر زیادہ لگ گیا ہے غلطی سے!

لیکن انہوں نے عبارت دیکھی تو عبارت انہی ہندسوں کی تصدیق کر رہی تھی.... ہزار روپے!

ان کا ہیجان دھیرے دھیرے سرد ہوتا گیا اور وہ مطمئن اور پرسکون ہوتے گئے۔ لیکن ٹیوشن پڑھانے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ان کا اصول ہے! ضرورت اصول سے بڑی اندر کی آواز نے جواب دیا۔ اس پیشکش کو ٹھکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلے روز انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا۔ "میں پانچ بجے سے چھ بجے تک پڑھا سکوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"مناسب ہے۔ لیکن میری بیٹی کہہ رہی تھی کہ کالج کی چھٹیوں کے ساتھ یہ سلسلہ شروع کیا جائے تو بہتر ہے۔ آج 23 تاریخ ہے۔ میں 29 کو شام چار بجے آپ کے لئے گاڑی

بھجوا دوں گا۔"

حمید احمد کا دل یوں دھڑکا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو۔ یہ بھی اللہ کی تائید ہی تھی۔ ورنہ وہ تو آج سے ہی جاتے۔ ایک مہینے کی ٹیوشن کے لئے تیس ہزار روپے دینے والے کو ٹہلایا تو نہیں جا سکتا۔ مگر اب اتنے دن میں تو وحید آپریشن سے نمٹ سکتا ہے۔ "جی بہت بہتر۔" انہوں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں حمید صاحب I am really grateful"

☆

وحید آپریشن کے بعد ہسپتال سے رخصت ہو کر گھر آ چکا تھا۔ حمید احمد خود کو ایسا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے کہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ان کی بہت بڑی مشکل کس طرح آسان کر دی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اس پر زندگی بھر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔

ڈاکٹر نے یقین دلایا تھا کہ وحید اب پوری طرح صحت مند ہے۔ رسولی عام سی تھی۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

29 سے کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس روز صبح ہی سے حمید احمد اپنی شاگرد کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ ان کے لئے وی آئی پی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی بہت بڑی مشکل آسان ہوئی تھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح پڑھائیں گے کہ حق ادا کر دیں گے۔ انہیں بے تابی ہو رہی تھی۔

ٹھیک چار بجے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ لپک کر باہر نکلے۔ ڈرائیور نے ان کے لئے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئے۔

سفر کے دوران وہ اپنی اس شاگرد کے بارے میں سوچتے رہے، جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً اس مضمون میں کمزور ہو گی۔ بہت کمزور۔ ورنہ ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کیوں دی جاتی۔ وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے کم دنوں میں کچھ ہو سکے گا۔ انہیں بہت محنت کرنا ہو گی۔ اور وہ شاید کند ذہن بھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ وہ اسے زیادہ وقت دے دیں گے۔ دے سکتے ہیں۔ وقت ہے ان کے پاس۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکیں گے اس کے لئے؟

وہ چونکے۔ گاڑی اب شارع فیصل سے کالا پل کی طرف مڑ رہی تھی۔ انہیں مدیحہ یاد آ

گئی۔ برسات کا وہ دن یاد آگیا۔ اس سڑک پر وہ اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں.... اور کبھی کمر تک پانی میں چلے تھے۔ اور یہاں وہ مین ہول میں گر رہی تھی۔ انہوں نے کتنی مشکل سے اسے بچایا تھا۔

گاڑی کی رفتاری تیز تھی۔ لیکن ان کے خیال، ان کی یادوں کی رفتار اس سے ہم آہنگ تھی۔

گاڑی پل سے گزر رہی تھی۔ یہ وہ جگہ ہے' جہاں مدیحہ نے ان پر اپنے اعتراف کا دم کیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر اس جگہ کو دیکھا۔ پھر وہ رخصت ہو گئی تھی۔ اس نے انہیں سا آنے سے روک دیا تھا.... شور مچانے کی دھمکی دے کر۔ اور یہ وہ جگہ ہے' جہاں آ جاتے بے شمار لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ انہیں جاتی دکھائی دی تھی۔ اور یہ وہ ہے، جسے مڑ کر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔

گاڑی اس موڑ سے مڑی تو یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سوچیں رہ گئیں، تو اس طرف گئی مدیحہ۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ آگے ایک دوراہا تھا۔ ایک راستہ کسی کچی بستی طرف جا رہا تھا۔ دوسرا ڈیفنس سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ گاڑی اب بنگلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

مدیحہ بھی تو ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے، ابھی کہیں اس سے سامنا جائے۔ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ "اللہ نہ کرے۔" انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ بات انہوں نے بلند آواز میں کہی ہے۔

"جی سر؟" ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں بے خیالی میں بول گیا تھا۔" حمید احمد نے کہا اور دل میں سوچا.... اب کبھی اس لڑکی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔

اسی لمحے ڈرائیور نے گاڑی ایک بنگلے کے کھلے گیٹ میں موڑ دی....

☆

مدیحہ کے لئے وہ دن بڑا عجیب تھا۔ پورے دن متضاد کیفیتیں اس پر طاری رہیں۔ یہ خوش آئند تھا کہ آج وہ اتنے عرصے کے بعد حمید احمد کو دیکھ سکے گی۔ لیکن وہ خوف زدہ

تھی۔ کہیں وہ انہیں دیکھنے کے بعد پہلے جیسی نہ ہو جائے۔ اور وہ ان کے رد عمل سے بھی خوف زدہ تھی۔ وہ اس پر برس نہ پڑیں۔

پھر اس نے سوچا، اب جو ہو سو ہو۔ اصل کام تو ہو چکا ہے۔ اب کوئی پرواہ نہیں۔ چاہے وہ اس کی بے عزتی کر دیں۔ اس نے یہ کھیل بہت سوچ سمجھ کر کھیلا تھا۔ اگر حمید احمد اسی دن اسے پڑھانے آجاتے تو یقینی طور پر وہ رقم واپس کر دیتے اور اسے پڑھانے سے انکار کر دیتے۔ خیر پڑھنے کی تو اسے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وحید کے آپریشن کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ اسی لئے اس نے 29 تاریخ سے پڑھائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس دوران حمید صاحب، وحید کا آپریشن کرا لیں گے۔

اس پورے دن میں اس نے اور تفصیلات بھی سوچ لی تھیں۔ وہ مکمل لائحہ عمل تیار کر چکی تھی۔ نماز کے بعد اس نے اللہ سے عافیت کی دعا بھی کی تھی۔ مگر اس روز وہ اچھی نماز نہیں پڑھ سکی تھی۔ حمید احمد کے تصور سے ویسے تو اس کی کوئی نماز خالی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس روز ان کے آنے کے تصور اور اس کی خوشی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ اس نے جیسے نماز پڑھی تھی' اس کا دل ہی جانتا تھا۔

بہر حال دن بھر کی سوچ بچار اور مناسب لائحہ عمل کی تیاری کے بعد وہ قدرے پر سکون ہو گئی تھی۔ بس اب اسے انتظار تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ گن رہی تھی۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ خود کو پردے کی آڑ میں رکھتے ہوئے اس نے باہر جھانکا۔ حمید احمد کو کار سے نکلتے دیکھ کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں' پھر وہ پریشان ہو گئی۔ حمید اسے بہت دبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ نسیمہ کو وہ پہلے ہی ہدایت دے چکی تھی کہ وہ سر کو اسٹڈی میں لے جائے۔ مگر اب اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی؟ اور اگر انہیں غصہ آگیا تو؟

خوف کیسی عجیب چیز ہوتا ہے۔ جو چیز اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی' وہ اسی سے بہت زیادہ خوف زدہ بھی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے ان کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ بلکہ ان کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھنا بھی ہو گا۔

اس نے اپنی کتاب' نوٹ بک اور قلم اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پاؤں

من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس رفتار سے وہ کب تک اسٹڈی روم میں پہنچے گی۔

☆

دروازہ ایک ملازمہ نے کھولا۔ ”آپ بے بی کو پڑھانے آئے ہیں نا؟“

”جی ہاں۔“

”آجایئے۔“

وہ ایک بڑے اور بے حد آراستہ ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ اس میں سے گزرتے ہو ان کی نظر ڈرائنگ روم پر پڑی۔ اس کی آرائش بھی دیدنی تھی۔ ملازمہ انہیں زینے کی طر لے گئی۔ وہ اس کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اسٹڈی تھ اس کی آرائش بے حد سادہ تھی۔ وہاں دو میزوں‘ چند کرسیوں اور ایک کاؤچ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لیکن ہر چیز بہرحال قیمتی تھی۔

”آپ تشریف رکھیئے۔ چائے پئیں گے یا شربت؟“

”کچھ بھی نہیں۔ چائے میں پی کر آیا ہوں۔“ حمید احمد نے جواب دیا۔

”بے بی ابھی آتی ہیں۔“ یہ کہہ کر ملازمہ چلی گئی۔

حمید احمد نے کمرے کا جائزہ کیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئے۔ وہ لان کی طرف تھی۔ لان کو دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی۔ اس سے ترتیب و تنظیم کا اظہار ہو رہا تھا۔ بڑے سے کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ پودوں کی تراش خراش بھی توجہ کی گواہی دے رہی تھی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئے۔ وہ دانستہ طور پر اس رخ سے بیٹھے کہ دروازے کی طرف ا پشت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ بنگلا اور اس کی ہر چیز امارت کی مظہر ہے۔ ایسے ضرورت کے وقت ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے دے سکتے ہیں۔ لیکن کیوں... اتنے بڑے شہر میں نظرِ انتخاب ان پر ہی کیوں پڑی۔ صدیقی صاحب کا کہنا تھا کہ نے RECOMMEND کیا تھا۔ مگر کس نے؟

پھر وہ جھنجلانے لگے۔ یہ مسئلہ ہے ناپیسے والوں کا۔ ٹیچر انتظار کر رہا ہے اور پڑھنے غائب۔ بھئی معلم کی عزت نہیں کرو گے تو علم کیسے آئے گا۔ اب معلم بھاری فیس لے اسے لحاظ بھی کرنا پڑے گا۔ پڑھنے والے کا احترام بھی کرنا پڑے گا۔

عقب سے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئے۔ پھر نسوانی آواز

سلام کیا۔ آواز انہیں جانی پہچانی لگی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور فرطِ حیرت سے بت بن گئے۔ وہ تو وہی تھی، جسے اب وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔

پہلی بات جو ان کی سمجھ میں آئی، وہ بھی عجیب ہی تھی۔ تاثرات کے اعتبار سے تو انہیں لگ رہا تھا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔ جتنے وہ حیران تھے‘ اتنی ہی حیرت انہیں مدیحہ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

پھر مدیحہ کے ہونٹ ہلے۔ ”آ.... آپ؟“

حمید احمد کو شدت سے غصہ آنے لگا۔ ”میری حیرت تو بجا ہے۔ لیکن تم کیوں حیران ہو؟“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ آپ ہوں گے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”میں نے پاپا سے بس اتنا کہا تھا کہ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ تک کیسے پہنچے۔ آپ چاہے، پاپا سے پوچھ لیں۔“

حمید احمد کو لگ نہیں رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسی لئے انہیں دروازے پر ملازمہ نظر آئی۔ انہوں نے گھبرا کر مدیحہ سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”بے بی.... چائے لے آؤں یا کافی؟“ ملازمہ نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

”کافی لے آؤ۔“ مدیحہ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ پھر وہ حمید احمد کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”آپ کا بیٹا اب کیسا ہے؟“

”تم سے زیادہ کسے معلوم ہو گا؟“ حمید احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں سمجھی نہیں۔“

”تمہیں سب پتہ رہتا ہے۔ تبھی تو تم ہسپتال پہنچ گئی تھیں۔“

”وہ نسرین سے معلوم ہوا تھا مجھے۔ اس سے تو روز فون پر بات ہوتی ہے میری۔ آخری اطلاع اس نے یہ دی تھی کہ تیسرے دن وحید گھر چلا گیا۔ اب ٹھیک ہے نا؟“

اس گفتگو نے حمید احمد کے ذہن میں ایک نازک سوال اٹھایا۔ کہیں یہ امداد تو نہیں؟ مدیحہ کو بتا چکا ہو کہ انہیں وحید کے آپریشن کے لئے رقم کی ضرورت ہے.... اور اس نے یہ چکر چلا ڈالا ہو۔ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو پہلے بھی سوچتے تھے کہ ایک مہینے کی

ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کوئی نہیں دے سکتا۔

"میں نہیں مانتا کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے جو معلوم تھا، جس سے معلوم ہوا تھا، میں نے بتا دیا۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر چونک کر تشویش لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

حمید احمد کو اس کی وہ تشویش اداکاری نہیں لگی۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی۔ "خدا کا شکر ہے، وحید اب ٹھیک ہے۔" انہوں نے آپریشن کے بارے میں نہیں بتایا۔ ملازمہ کافی لے آئی تھی۔ مدیحہ نے پیالی بڑے احترام سے حمید احمد کے سامنے رکھی۔ "کافی پیجئے اور جو جی چاہے، کہہ دیجئے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پڑھانا نہیں چاہیں گے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے مدیحہ۔" حمید احمد نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں صدیقی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اور وعدہ میں ہر حال میں پورا کرتا ہوں۔"

"آپ مجھے مایوس کر رہے ہیں حمید صاحب۔ سچ یہ ہے کہ میں...."

"تم مجھے اس طرح نام لے کر نہیں پکار سکتیں۔" حمید احمد نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ مجھے بات پوری کرنے دیں حمید صاحب۔" مدیحہ کا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔ "اس میں آپ کے اعتراض کا جواب بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ سے پڑھنا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ سے شاگردی کا رشتہ توڑنے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔ میں آپ کی شاگرد نہیں بن سکتی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ پاپا نے آپ سے بات کی ہے تو میں انہیں پہلے ہی منع کر دیتی۔ اب بات آپ کے وعدے کی ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو سر کبھی نہیں کہوں گی۔ آپ میرے لئے جو ہیں، ہمیشہ رہیں گے۔"

حمید احمد سناٹے میں آ گئے۔ توہین کے احساس سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"خدا کی قسم حمید صاحب! میں نے سچی بات کہی ہے۔ میرا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔ اگر آپ کو ایسا محسوس ہوا ہو تو میں آپ کے پاؤں پکڑ کر بھی معافی مانگ سکتی ہوں۔" مدیحہ نے جلدی سے کہا۔ "لیکن سچی بات یہی ہے۔ آپ کی شاگردی ایک اعزاز ہے۔ میں یہ اعزاز حاصل کرنا نہیں چاہتی۔"

اس وقت کافی کی وہ پیالی حمید احمد کے لئے بڑی نعمت تھی۔ وہ اس قدر اچانک ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے تھے اور انہیں اس پر سوچنا تھا۔ مدیحہ کی بات نے ایک بات تو واضح کر دی تھی۔ وہ یہ کہ مدیحہ کو وحید کے آپریشن کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس لئے ان کا امداد والا مفروضہ غلط ہے۔ اور مدیحہ کی یہ بات بھی درست ہے کہ اس نے صرف ان سے شاگردی کا تعلق توڑنے کے لئے کالج چھوڑا تھا۔ وہ ان سے ٹیوشن پڑھنے کو کیوں کہتی۔ ان کے اخذ کردہ یہ تمام نتائج ان کے لئے طمانیت بخش تھے۔ لیکن ان کے لئے الجھنیں بھی تھیں۔ عام صورت حال ہوتی تو مدیحہ کی صورت دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس چلے جاتے اور فیس واپس کر دیتے۔ لیکن وہ تیس ہزار روپے خرچ کر چکے تھے۔ فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے پڑھائیں۔ صرف پچیس دنوں کی تو بات ہے۔

کافی کا آخری گھونٹ لے کر انہوں نے پیالی رکھی اور فیصلہ کر لیا کہ انہیں سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ "ٹھیک ہے مدیحہ۔ میرے لئے اپنے وعدے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔" انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں وہی سمجھوں گا جو میرے لئے تم ہو۔ تم مجھے جو جی چاہے سمجھو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہیں ٹیوشن کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں نے تمہیں جو دیکھا اور سمجھا ہے، اس کے تحت میں کہہ سکتا ہوں کہ تم تیاری کے بغیر بھی امتحان دو تو اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صدیقی صاحب تمہارے لئے آئے ہیں تو میں صاف انکار کر دیتا۔"

مدیحہ جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ اسی لئے تو اس نے کوشش کی تھی کہ انہیں معلوم نہ ہو۔ "بات یہ ہے کہ پچھلے چند ماہ سے میرا بہت برا حال ہے۔ یہ بات نہیں کہ پڑھائی کی طرف میرا دھیان نہ ہو۔ لیکن سوکس کی طرف سے دل برا ہو گیا ہے۔ یہ سیکنڈ ایئر ہے۔ میں مضمون تبدیل بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اس مضمون کی وجہ سے میری ڈویژن خراب ہو جائے گی۔ یہ بھی شاید بہتری ہوئی کہ آپ آ گئے۔ شاید آپ ہی مجھے پڑھا سکتے ہیں۔"

"جو مضمون اچھا نہ لگے، وہ لینا ہی نہیں چاہئے۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مضمون مجھ سے بہت کچھ چھین لے گا۔" مدیحہ نے

کہا۔ لیکن اس کے دل نے فوراً ہی اس بات کی تردید کر دی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس مضمون کی... سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔

"اچھا۔ اب کتاب دو مجھے۔" حمید احمد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ مدیحہ نے انہیں کتاب دی۔ وہ فہرست ابواب دیکھنے لگے۔

"ایک بات کہوں حمید صاحب۔ آدمی کو بڑا بول نہیں بولنا چاہئے۔"

حمید احمد کو کرنٹ سا لگا۔ "کیا مطلب؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے آپ سے آخری بات بہت بڑی کہہ دی تھی۔ میں نے کہا تھا.... اب کبھی ملے تو اس کا سبب آپ کی ہی کوئی ضرورت ہوگی' میری نہیں۔ لیکن اب دیکھیں' میری ہی ضرورت میں میرے کام آ رہے ہیں۔"

حمید احمد کھو سے گئے۔ وہ اس سے سچ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اس سے کیسے کہتے کہ بڑی بات تو انہوں نے کی تھی۔ جب انہوں نے کہا تھا کہ یہ تقریباً ناممکن ہی ہے کہ وہ کبھی ان کے کام آ سکے۔ اور وہ ان کے کام آئی تھی۔ اس نے ان کے بیٹے کو وہ خون دیا تھا' جو وہ ساری دولت دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ اس سے کیسے کہتے کہ اس کی بات ٹھیک تھی۔ وہ ملے تھے تو مدیحہ کی ضرورت کے تحت نہیں' اپنی ضرورت کے تحت ملے تھے... میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ اس سے یہ سچ کہہ سکتے۔

"چلو.... اب پڑھائی شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

☆

حمید احمد نے مدیحہ کو دیکھنے کے بعد جس ٹیوشن کو بہت بڑی مشکل اور آزمائش سمجھا تھا، ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ دل میں یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ اس کا سبب مدیحہ ہی تھی۔ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ انہیں سر نہیں کہتی تھی۔ حتی الامکان وہ ان کا نام لینے سے بچتی تھی۔

سب سے زیادہ تو انہیں اس کی نگاہوں کا خوف تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اس صورت حال کا سامنا کیسے کریں گے۔ انہیں یاد تھا کہ یہ وہ لڑکی تھی، جو بھری کلاس میں پہلے لیکچر کے ختم ہونے تک ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ جسے یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ اس بے خودی کے عالم میں کوئی دیکھ لے گا تو کتنی رسوائی ہوگی۔ اور اب یہاں تو تنہائی تھی...

یہاں تو اسے کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ مدیحہ بڑی توجہ سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر دیکھتے، انہیں وہ نظریں جھکائے بیٹھی نظر آتی۔ کبھی اس کی نظریں اٹھی بھی ہوتیں تو وہ ایک اسٹوڈنٹ کی نظریں ہوتیں۔ ایسا اسٹوڈنٹ، جو پڑھانے والے کی بات سن کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن حمید احمد کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ اب وہ بات مشکل سے سمجھتی تھی۔ ورنہ وہ بہت برائٹ لڑکی تھی۔

مگر حمید احمد اس کی وجہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ وہ سٹوڈنٹ جو کورس سے ہٹ کر سوچتے ہیں، وہ نصابی نہیں ہوتے۔ ان کی کامیابی ہی نصاب سے ہٹ کر سوچنے میں ہوتی ہے اور اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دیں تو پیچھے رہ جاتے ہیں۔

انہوں نے ایک دن مدیحہ کو ٹوک ہی دیا۔ "تم پہلے ایسی تو نہیں تھیں؟"

مدیحہ نے نظریں اٹھا کر معصومیت سے انہیں دیکھا۔ "کیسی نہیں تھی؟"

"تم نصاب سے جو کچھ اخذ کرتی تھیں، ان پر سوچتی تھیں، ان سے نتائج اخذ کرتی تھیں۔ انہیں تنقیدی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ان کے محاسن و معائب پر بحث کرتی تھیں۔ اب تم نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟"

"دلچسپی کی بات ہے۔ جب مجھے اس مضمون میں دلچسپی تھی۔ میں اسے سود مند سمجھتی تھی۔ اسے ضروری سمجھتی تھی۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ میں نے اسے فضول سمجھ لیا۔ اب یہ میری مجبوری ہے' مجھے امتحان دینا ہے۔ دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے میں نصاب سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔"

"جو لوگ نصابی نہ ہوں، وہ ایسے ہو بھی نہیں سکتے۔" حمید احمد نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب تمہارا مشورہ یہی ہے کہ رٹا لگانے کی کوشش کرو۔"

"وہ تو میں کر رہی ہوں۔"

دن دھیرے دھیرے گزرتے رہے۔ حمید احمد کو دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ٹیوشن کا یہ تجربہ ان کے خدشات کے برعکس خوشگوار ثابت ہوا ہے۔

☆

جس دن کے آنے سے وہ ڈرتی تھی، وہ دن بالآخر آ گیا۔ اگلے روز سوکس کا پرچا تھا اور اس روز حمید احمد کو آخری بار اس کے گھر آنا تھا۔

وہ چوبیس دن مدیحہ کے لئے بڑی آزمائش اور پریشانی کے تھے۔ ان میں پہلا دن سب سے مشکل تھا' جب اس نے پہلی بار حمید احمد کا سامنا کیا تھا۔ وہ مرحلہ دشوار ترین ہونے کے باوجود آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اس سے اسے بڑا حوصلہ ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بات ختم نہیں ہوئی۔ آنے والا ہر لمحہ آزمائش کا ہی تھا۔

اسے بہت سی چیزوں کا پردہ رکھنا تھا۔ اس نے حمید احمد کو یقین دلا دیا تھا کہ اسے وحید (کا) آپریشن اور ان کی ضرورت کے متعلق علم نہیں تھا۔ اس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اس (نے) پاپا سے ان کے متعلق بات نہیں کی۔ بلکہ وہ تو ان سے پڑھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس (نے) انہیں یقین دلا دیا تھا کہ یہ ایک اتفاق ہے۔

مگر آگے جو مرحلہ تھا' وہ اس اعتبار سے اور سخت تھا کہ اس میں تسلسل تھا۔ اسے حمید احمد (کو) یقین دلانا تھا کہ اسے واقعی ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ اور اسے خوشی تھی کہ وہ اس میں کامیاب رہی۔

لیکن یہ پریشانیاں اس کی خوشی کو کم نہ کر سکیں۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے تو صبر کر لیا تھا کہ اب شاید کبھی حمید احمد سے نہیں مل سکے گی.... انہیں نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ بڑی چاہ سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے ٹیوشن پڑھنے کا فیصلہ بڑی بے غرضی اور خلوص سے حمید احمد کی ضرورت کے تحت کیا تھا۔ اور جو قربت اسے ملی' شاید وہ اس کے خلوص کا انعام تھا۔ ان چوبیس دنوں میں اسے ان کی قربت کے تیس خوب صورت گھنٹے ملے تھے۔ وہ اس کے لئے بہت بڑا سرمایہ تھا۔

وہ پہلے ہی دن سے خوف زدہ تھی۔ اسے یاد تھا کہ کالج میں وہ کیسے از خود رفتگی کے عالم میں

بھنی رہتی تھی۔ تو اب اسٹڈی کی تنہائی میں، جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا، اس کی (حالت) دل کا کیا عالم ہوگا۔ مگر اسے احساس تھا کہ یہاں حمید احمد مجبور ہیں۔ وہ اسے پڑھانا نہیں چھوڑ (سکتے) ورنہ وہ اسے ایک دن بھی نہ پڑھاتے۔ اگر وہ انہیں پہلے کی طرح دیکھے گی تو وہ کچھ بھی (نہیں) کر سکیں گے۔ ہاں انہیں کوفت اور دلی اذیت ضرور ہوگی۔ اور اس کا یہ عمل بلیک میلنگ (کے) مترادف ہوگا۔ چنانچہ اس نے اسی بات کو اپنی سب سے بڑی آزمائش بنالیا۔ وہ اللہ سے دعا (کرتی) کہ وہ اس آزمائش میں پوری اترے۔ اور اللہ نے اس کی سن لی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس میں تو اتنا ظرف نہیں تھا۔ لیکن اس نے وہ وقت اچھی طرح (گزار) لیا۔ وہ حتی الامکان نگاہیں نیچی رکھتی تھی اور نظریں کبھی اٹھ بھی جاتیں تو وہ کوشش کرتی کہ ان میں کوئی کیفیت نہ جھلکنے پائے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔

مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان خوب صورت، سرمایہ حیات ساعتوں کی اسے بہت بھاری (قیمت) ادا کرنی ہے۔ آنے والے کو جانا بھی ہے۔ وقتی طور پر ملنے والے کو ہمیشہ کے لئے بچھڑ (جانا) بھی ہے۔ اسے جدائی کا تجربہ بھی تھا۔ قدم کیسے بھاری ہو جاتے ہیں۔ مختصر سے فاصلے کتنے اذیت ناک ہو جاتے ہیں۔ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش کتنی شدید ہوتی ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جدائی آدمی کو سلگانے والی دھیمی دھیمی آگ ہوتی ہے۔ لیکن جدا ہوتے وقت کے چند لمحے اس بھڑکتی آگ کی طرح ہوتے ہیں، جو بڑے اذیت ناک انداز میں سارے وجود کو پھونک ڈالتی ہے۔ اور اب.... آج اُسے دوبارہ اس مرحلے سے گزرنا تھا!



اس شام حمید احمد بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہ بہت خوش مزاج ہو رہے تھے۔ کسی کو قید سے رہائی ملنے والی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جبکہ مدیحہ اپنی اداسی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اوہ.... سوا چھ بج گئے۔" حمید احمد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.... آپ کے جانے کا وقت ہو گیا۔" مدیحہ اپنے لہجے کی اداسی کو چھپا نہیں سکی۔

حمید احمد نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ "ہم جو کچھ کر سکتے تھے' ہم نے کر لیا۔ اب ہم صرف دعا کر سکتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔"

مدیحہ نے خود کو دل آزاری کے لئے تیار کر لیا۔ وہ جو مشورہ بھی دیں گے' ناقابل عمل اور دل دکھانے والا ہی ہوگا۔ "جی.... میں سن رہی ہوں۔"

"اب صرف ریلیکس کرو۔ پڑھنا مت۔ ہاں صبح سویرے اٹھ جاؤ تو ہر اہم باب پر ڈ
انداز میں نظر ڈال لینا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر فوراً ہی وضاحت بھی کی۔ "آخر وقت
'خاص طور پر پوری رات جاگ کر جتنا پڑھا جائے' اس سے کنفیوژن ہی بڑھتا ہے۔ پچھ
ہوا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ میرا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔"

"جی۔ میں اس پر عمل کروں گی۔"

"اور میں خوش ہوں کہ میں تمہارے کسی کام آسکا۔"

مدیحہ نے حمید احمد کو بہت غور سے دیکھا۔ آج وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے لگ
کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ وہ خاموش بیٹھی متوقع نظروں سے انہیں
رہی۔ "اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس عرصے کو بہت اچھی طرح گزارا۔ اسے میر
مشکل نہیں بنایا۔"

مدیحہ اب بھی انہیں دیکھتی رہی۔ اس کا اندازہ تھا کہ انہوں نے اصل بات اب بھ
کہی ہے۔

حمید احمد اٹھنے لگے۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

"ذرا رکیں۔ دس منٹ اور بیٹھیں۔ اب پھر کبھی تو آپ آئیں گے نہیں۔" مدیحہ
ہوئے کہا۔ "میں ابھی آئی۔"

حمید احمد کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اب تک تو خیریت رہی۔ اب یہ لڑکی نجانے کیا
گی۔ انہوں نے سوچا مگر پھر یہ سوچ کر اس فکر کو ذہن سے جھٹک دیا کہ اب کچھ بھی ہو
فرض ادا کر چکے ہیں۔ اور آج یہاں ان کا آخری دن ہے۔

وہ اس بات کے بارے میں سوچ رہے تھے' جو مدیحہ سے کرنا چاہتے تھے لیکن کر
رہے تھے۔ کیسے کریں؟ کس طرح کہیں؟ وہ ہمیشہ کے سچے، کھرے، دیانت دار آدمی
بات جیسے محسوس کرتے' کہہ دیتے۔ لیکن آج یہی کام ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔

مدیحہ کی آمد نے انہیں چونکا دیا۔ اس نے ان کے سامنے کافی کی پیالی رکھی۔ اس
والی بھاپ کافی کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ "یہ ہے آپ کی الوداعی کافی۔ میں نے خو
ہے۔" مدیحہ کے لہجے میں خوشی تھی۔

حمید احمد نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولے۔ "بہت عمدہ ہے، کافی تم بہت اچھی بناتی ہو۔"

"بڑی محبت سے بنائی ہے۔ اس لئے یہ آرٹ پیس ہے۔"

حمید احمد کو یہ حوالہ یاد تھا۔ انہوں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ وہ تو اس الجھن میں تھے کہ اپنی
بات کیسے کریں۔

انہوں نے کافی کا ایک طویل گھونٹ لیا اور بالآخر لب کشائی کی۔ "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا
ہے مدیحہ۔ تم نے وحید کو خون دے کر مجھ پر جو احسان کیا ہے' میں تمہیں کسی طرح اس کا صلہ
نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ ہلکے ہو گئے۔

"صلہ دے سکتے ہیں آپ؟" مدیحہ نے آہستہ سے کہا۔

حمید احمد نے ایک پل اسے غور سے دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ "نہیں دے سکتا۔
مر کر بھی حق ادا نہیں ہو گا اس کا۔" انہوں نے کہا۔

"مر کر کبھی کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جی کر تو حق ادا کیا جا سکتا ہے۔" مدیحہ نے کہا۔
پھر جلدی سے بات بدلی۔ "تو یہ بات کہنے کے لئے اتنا جھجک رہے تھے آپ؟" اس کے لہجے
میں مایوسی تھی۔

حمید احمد بری طرح بھڑکے۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"میں بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں آپ کو۔" مدیحہ نے کہا۔ "دیکھیں حمید صاحب! میرے
نزدیک تو وہ کوئی احسان تھا ہی نہیں۔ وحید کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی۔ لیکن آپ
جس طرح بادل ناخواستہ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں، وہ تو اچھا نہیں ہے۔ آپ کی ہچکچاہٹ
آپ کے لفظوں کی نفی کر چکی ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ اور تھی۔" حمید احمد نے جلدی سے کہا۔ "دراصل
مجھے تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا ہے۔ میں نے تم سے بہت بڑی بات کہی تھی ایک موقع
پر میں نے کہا تھا کہ تم میرے کام کبھی نہیں آسکتیں۔ مجھے اس کی سزا مل گئی۔ تمہارے
ذریعے میرا بہت بڑا کام نکلا۔ میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔"

"بس حمید صاحب! یہ اللہ کی مرضی تھی۔"

حمید احمد نے پیالی سے آخری گھونٹ لے کر اسے رکھ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب میں
چلتا ہوں۔"

مدیحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے بھی ایک بات کہنی ہے آپ سے۔" اس نے کہا۔ حمید

احمد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "آپ سچے اور HONEST آدمی ہیں۔ وعدہ کریں تو ضرور پورا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

حمید احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا؟" مدیحہ نے کہا۔ "سچا اور پکا وعدہ؟" پہلو تہی سے فائدہ نہیں تھا۔ بات اور بڑھ جاتی۔ حمید احمد نے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں تدریس کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کبھی نہیں ہوں گا۔ ریٹائر کر دیا جاؤں تو وہ اور بات ہے۔"

"میں آپ کے یقین کے حق میں دعا نہیں کر سکتی۔" مدیحہ نے کہا۔ "چلئے.... میں آپ کو نیچے تک چھوڑوں گی۔"

وہ اسٹڈی سے نکل آئے۔ اچانک حمید احمد نے کہا۔ "ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے۔ میرے گھر کبھی نہیں آؤ گی۔"

"آپ بلائیں 'تب بھی؟"

"یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"آپ پھر بڑی بات کہہ رہے ہیں۔" مدیحہ نے کہا۔ "بہر حال یہ وعدہ تو میں خود سے کر چکی ہوں۔"

نیچے ڈرائیور گاڑی کے پاس تیار کھڑا تھا۔ اس نے حمید احمد کے لئے دروازہ کھولا۔ حمید احمد نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وش یو بیسٹ آف لک مدیحہ!"

How could you say so when you don't intend to be even مدیحہ نے! good to me. And you know you are my luck". ڈرائیور کی موجودگی میں انگریزی زبان سے فائدہ اٹھایا۔ پھر بولی۔ "اچھا سر! اللہ حافظ۔ شکریہ۔"

وہ گاڑی کے ساتھ چلتی رہی۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو وہ گیٹ پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ آج اس کی باری تھی کہ وہ انہیں نظروں سے دور جاتا دیکھے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ تو ہونا ہی تھا!

☆

آدمی جب پریشان ہو 'جب کوئی بہت بڑی پریشانی 'کوئی بہت بڑی ضرورت اس کے آگے منہ کھولے کھڑی ہو تو اسے بس اس ضرورت کے پورا ہونے کی 'اس پریشانی کے دور ہونے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن وہ اچھا بھی ہو تو پریشانی دور ہونے کے بعد غور و فکر کرتا ہے۔ حمید احمد کو ضرورت کے وقت تیس ہزار کا چیک ملا تو انہوں نے سوچا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ صرف پچیس دن پڑھانے کے عوض کوئی اتنی بڑی رقم بھی دے سکتا ہے۔ سو انہوں نے چیک کیش کرایا اور اپنی ضرورت پوری کر لی۔

پھر وہ پڑھانے کے لئے گئے اور مدیحہ سامنے آئی تو انہیں اس معاملے میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ انہوں نے سوچا، کہیں وہ چیک معاوضے کے بجائے امداد کا تو نہیں تھا۔ اگر اس وقت ان کے لئے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ان کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت لوٹ آتے اور رقم رفیقی صاحب کو واپس کر دیتے۔ لیکن یہ اس وقت ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ سو مدیحہ کو پڑھانا ان کی اشد ضرورت بن گیا۔ وہ اسے نہ پڑھاتے تو وہ رقم ان پر احسان بن جاتی۔ وہ خود کو مقروض بلکہ نادہندہ سمجھتے رہتے۔ پھر مدیحہ نے بہت معقول اور موثر وضاحت کی۔ انہوں نے اسے تسلیم کر لیا.... قبول کر لیا۔ ان کی ضرورت جو پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اسے پچیس دن پڑھا کر وہ آزاد ہو جائیں گے۔ سودا مکمل ہو جائے گا۔ ان پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔

لیکن مدیحہ کو آخری دن پڑھانے کے بعد وہ دو تین دن تو ہلکے پھلکے رہے۔ اس کے بعد انہیں پھر بوجھل پن کا احساس ستانے لگا۔ انہیں اس معاملے میں پھر گڑبڑ نظر آنے لگی۔ اتنے کم دن پڑھانے کی اتنی بڑی فیس کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ گڑبڑ کیا ہے 'کس کی طرف سے ہے، ان معاملات کو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ان کا جی چاہا کہ اپنے کولیگز سے پوچھیں کہ کیا یہ ممکن ہے.... پچیس دن کی ٹیوشن کے تیس ہزار! مگر انہیں معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔ وہ کہیں گے.... ایسا کوئی بے وقوف ہمیں بھی دلا دو۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ تیس ہزار ایک قرض تھا 'جو انہیں ادا کرنا ہے۔

INVIGILATION کی ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگلے دو ڈھائی مہینوں میں انہیں اچھی خاصی اضافی آمدنی ہو گی۔ پھر انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض کی

درخواست دے دی۔ وہ رقم ملی تو انہوں نے بینک میں جمع کرا دی۔

انہیں اضافی ادائیگی ہوئی تو وہ قرض اتارنے کے قابل ہو گئے۔ اہلیت پاتے ہی انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا۔ "میں حمید احمد بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر صدیقی صاحب نے کہا۔ "معاف کیجئے گا میں پہچانا نہیں۔ پلیز آپ کوئی حوالہ...."

"میں نے آپ کی صاحب زادی کو ٹیوشن دی تھی۔ اتفاق ہے کہ آپ سے ملاقات تک نہیں ہوئی۔"

"اوہ۔ سوری سر۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

"کوئی بات نہیں جناب! آپ کا ایک قرض ہے مجھ پر۔ وہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" حمید نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ آپ کس قرض کی بات کر رہے ہیں۔"

"جو فیس آپ نے مجھے ادا کی تھی، میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ اس وقت مجھے ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے اسے قرض سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔"

"اوہ۔ تو یہ تو آپ کا اور مدیحہ کا معاملہ ہے۔" دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کو کتنی فیس دی گئی۔ مدیحہ نے اپنے بینک اکاؤنٹ سے ادائیگی کی تھی۔ مجھے تو اس نے بند لفافہ دیا تھا، جو میں آپ کے گھر دے آیا تھا...."

حمید صاحب سن ہو کے رہ گئے۔

"اور مدیحہ نے مجھ سے کہا تھا کہ صرف آپ ہی اسے پڑھا سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آپ کو رضامند کرنا آسان کام نہیں۔ آپ کبھی ٹیوشن نہیں پڑھاتے۔ اس نے کہا تھا میں اس کا نام لئے بغیر آپ کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اور میں ایک نوٹ اور اپنے کارڈ کے ساتھ وہ لفافہ آپ کے گھر دے آیا ہوں تو وہ بہت خفا ہوئی مجھ سے۔"

حمید صاحب اب بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ صرف سن رہے تھے۔ ان کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"اور آپ کہتے ہیں کہ اس فیس کے مستحق نہیں تھے۔" صدیقی صاحب کی بات جاری

"میں کہتا ہوں، وہ جو بھی تھی کم تھی۔ آپ کی محنت کا حق ادا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں تو آپ کے گھر مٹھائی لے کر آنے والا تھا مگر کیا کروں، مصروفیت اتنی ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ خود جا کر آپ کے گھر مٹھائی پہنچائے اور آپ کا شکریہ ادا کرے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" بڑی مشکل سے حمید صاحب کی زبان کھلی۔

"آپ کو پتہ نہیں۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔ "انٹر کا رزلٹ آ گیا ہے نا۔ آپ کے سبجیکٹ میں مدیحہ نے 84 مارکس لئے ہیں۔"

حمید احمد کو معلوم تھا رزلٹ کا۔ لیکن اس حوالے سے مدیحہ کا انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ حیرت میں ڈوب گئے۔ اتنے اچھے مارکس آئے ہیں مدیحہ کے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ "صدیقی صاحب! پھر بات ہو گی آپ سے۔" انہوں نے کہا۔

"یو آر ویل کم سر۔"

اس گفتگو کے بعد تو حمید صاحب کو بہت کچھ سوچنا تھا، سمجھنا تھا۔ اور انہوں نے سوچا اور سمجھا بھی۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کر لیا۔ وہ رقم لے کر ان کے آفس جاتے تو کیا ہوتا۔ صدیقی صاحب کو پتا چلتا کہ ان کی بیٹی نے اتنے سے دنوں کی ٹیوشن فیس ہزار روپے دی ہے تو وہ کیا سوچتے.... ان کے بارے میں بھی اور اپنی بیٹی کے بارے میں بھی۔ وہ سب سمجھ جاتے اور کتنی شرمندگی ہوتی۔ اور مدیحہ پر بھی کیا گزرتی۔

اب پوری بات کھل گئی تھی۔ شواہد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مدیحہ کو کسی طرح وحید کے آپریشن کا علم ہو گیا تھا۔ اسے ان کی ضرورت کا، ان کی پریشانی کا اندازہ تھا۔ اور اسے ٹیوشن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کتنا سوچا ہو گا تو ان کی مدد کے لئے یہ تدبیر نکالی ہو گی۔ اس نے کتنے خطرات مول لئے تھے ان کی تالیف قلب کے لئے۔ اس نے جو اپنی بے عزتی سوالی سے بہت ڈرتی تھی۔

اور بعد میں بھی اس نے انہیں شرمندگی سے بچانے کے لئے کیا کیا جتن کئے تھے۔ اس نے کس طرح خود کو ٹیوشن کا ضرورت مند ثابت کیا تھا۔ یوں کہ وہ اندازہ لگا بیٹھے کہ وہ سو کس ایسا بھی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ اور اس نے ان پچیس دنوں میں خود پر 'اپنی نگاہوں پر اظہار کہا تھا۔ ایسا تو وہ بھری کلاس میں بھی کبھی نہیں کر سکی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ

پچیس دن اسے سکون سے پڑھا سکیں۔ وہ پڑھا نہ پاتے تو ان کے ضمیر پر بوجھ ہوتا وہ تیس ہزار روپے ہر پل انہیں ڈستے رہتے۔ کتنا خیال کیا تھا اس نے ان کا! کون اتنا خیال رکھتا ہے کسی کا!

وہ لمحہ حمید احمد کے لئے بہت بڑی خوشی کا تھا۔ انہیں زندگی میں کبھی توجہ نہیں ملی تھی۔ نہ ہی انہوں نے توجہ کی طلب بھی کبھی نہیں کی۔ کبھی کسی نے ان کی اتنی پرواہ نہیں کی، ان کی تالیف قلب کا ایسا خیال نہیں رکھا' کبھی کسی نے ان سے اتنی محبت نہیں کی۔ انہوں نے چاہا بھی نہیں۔ اور اب بغیر مانگے انہیں اتنا کچھ مل گیا تھا۔ اور وہ ناشکرا پن کر رہے تھے۔

اس لمحے حمید احمد نے ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے پوری طرح تسلیم کر لیا کہ مدیحہ کی محبت بے حد عظیم ہے۔ اور وہ خود بھی قابل فخر کردار کی مالک ہے۔ جب مدیحہ نے انہیں سب کچھ بتایا تھا تو انہوں نے بڑی حسرت سے سوچا تھا کہ کاش کسی نے ایسی محبت ان سے بھی کی ہوتی۔ مگر پھر انہوں نے ملنے پر اس محبت کی ناقدری کی، تحقیر کی۔ ناشکرا پن کیا انہوں نے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس نعمت کو قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن کفران نعمت تو نہ کریں۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر خدا ایسی عظیم محبت انہیں سونپ دے تو وہ بھی ایسے ہی مجبور اور بے اختیار ہوں گے' جیسی مدیحہ ہے۔ اور انہیں یاد تھا کہ انہوں نے یہ خواہش بھی کی تھی۔ انہوں نے مدیحہ کی کیفیات سننے کے بعد اپنے لئے بھی وہی کچھ چاہا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ انہوں نے اب تک زندگی گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مدیحہ کی محبت قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن اب وہ اس کی تحقیر بھی نہیں کریں گے۔ اسے ہلکا کبھی نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اب کبھی اس سے ان کا سامنا نہیں ہو گا۔ اب وہ کبھی نہیں ملیں گے۔

ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ یہ تیس ہزار روپے وہ مدیحہ کو واپس کر سکتے تھے۔ لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ ایک تو اس سے مدیحہ کی دل آزاری ہوتی۔ اب وہ سمجھ سکتے تھے کہ مدیحہ نے یہ سب کچھ بڑے خلوص سے 'فرض سمجھ کر کیا تھا۔ دوسرے اس کے لئے انہیں پھر مدیحہ سے ملنا پڑتا۔ اور ملتے تو کچھ بھی ہو جاتا۔ وہ رقم سامنے جائے بغیر بھی اس تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اس کے جواب میں یہ بھی ممکن تھا کہ مدیحہ اپنا وعدہ بھول کر ان سے ملنے چلی آئے۔

بہتر یہی ہے کہ وہ اسے وعدہ شکنی کا کوئی جواز فراہم نہ کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور اس تیس ہزار کو بھول ہی جائیں۔

اگلے روز انہوں نے تیس ہزار کی رقم کو فکسڈ ڈپازٹ کر دیا۔

☆

پچھلا مہینہ بلقیس بیگم کے لئے ڈراؤنے خواب کی طرح گزرا تھا۔ اس نے انہیں جسمانی طور پر ہی نہیں، روحانی طور پر بھی تھکا دیا تھا۔

پہلے وحید کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ اس کے ساتھ ہسپتال میں رہیں۔ پھر وحید گھر آیا تو حمید احمد پریشان رہنے لگے۔ اور ان کے پوچھنے پر بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اور انہیں یاد تھا کہ جس دن وہ صاحب آئے جو حمید کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر ایک خط اور ایک لفافہ دے کر چلے گئے تھے' اس دن وہ خط پڑھنے کے بعد حمید احمد پرسکون نظر آئے تھے۔ ان کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔

مگر اسی رات انہوں نے بلقیس بیگم کو ایک پریشان کن خبر سنائی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وحید کے دماغ کا ایک آپریشن ہونا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ خبر سن کر متوحش ہو گئی تھیں۔ "اس کے لئے تو بہت پیسوں کی ضرورت پڑے گی بیٹے۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں اماں۔ بیس پچیس ہزار کا خرچا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بندوبست ہو چکا ہے۔"

"مگر یہ اس قدر اچانک....! یہ تمہیں کب پتہ چلا۔"

"جس دن وحید کو ہسپتال سے چھٹی ملی تھی، اسی دن ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"مجھے ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا۔ تم نے بھی نہیں بتایا۔"

"جان کر نہیں بتایا اماں۔ مجھے معلوم تھا، آپ بہت پریشان ہو جائیں گی۔" حمید احمد کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

بلقیس بیگم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو یہ بات تھی، جس کے لئے تین دن حمید احمد پریشان رہے اور ہر بار ان کے پوچھنے پر یہی بتایا کہ کالج کی کوئی پریشانی ہے۔ انہوں نے ایک بار بھی اصل بات نہیں بتائی۔ کیا گھر کے افراد کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ حمید آپریشن کی وجہ سے نہیں، اخراجات کی طرف سے پریشان تھے۔ آپریشن تو آپریشن

ہے۔ ہونا ہے تو ہونا ہے۔ اس میں تو بس دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن پیسے کی پریشانی آدمی کو بہت ہراساں کر دیتی ہے۔

"پیسوں کا بندوبست کیسے ہوا؟" انہوں نے حمید احمد سے پوچھا۔

"ایک ٹیوشن مل گئی اماں۔ جو صاحب آج آئے تھے، وہ تیس ہزار کا چیک دے کر گئے ہیں۔"

"کیا سال بھر پڑھانا ہوگا؟"

حمید احمد ہنسنے لگے۔ "ارے نہیں اماں، مشکل سے ایک مہینہ سمجھ لیں۔"

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ دنیا کو اتنا جانتی سمجھتی نہیں تھیں۔ لیکن اتنا سمجھ سکتی تھیں کہ ایک ماہ پڑھانے کی فیس تیس ہزار روپے نہ کوئی مانگ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دے سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ وحید کے آپریشن کا سن کر دہل گئی تھیں۔ آپریشن اور وہ بھی دماغ کا!

پھر اگلے دن حمید احمد نے کہا۔ "اماں.... آج ہسپتال چلنا ہے۔ یہ معاملہ جتنی جلدی خیریت سے نمٹ جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ صرف تین دن لگیں گے۔"

چنانچہ ایک ہفتے میں دوسری مرتبہ وہ وحید کے ساتھ پھر ہسپتال پہنچ گئیں۔ ہسپتال کے وہ چار دن جیسے ان کی زندگی کے تھے ہی نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اس عرصے میں انہوں نے کتنے وظائف پڑھے۔ اللہ کے کتنے ناموں کا ورد کیا۔ بس وہ یہی کچھ کرتی رہیں۔ نماز پڑھتی رہیں اور وحید کی زندگی اور صحت کے لئے دعا کرتی رہیں۔

اور آپریشن کے بعد وہ ڈاکٹر کے سامنے رو پڑیں۔ "سب ٹھیک ہو گیا ہے اماں۔" ڈاکٹر نے انہیں دلاسا دیا۔

"یہ تو آپ نے پچھلی بار بھی کہا تھا۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولیں۔ "اور اس کے بعد آپریشن کر ڈالا بچے کا۔"

"اس میں اسی کی بہتری ہے اماں۔ یہ ضروری تھا اور آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ معاملہ سنگین بھی نہیں نکلا۔"

"مجھے یہ بتائیے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔ اب انشاء اللہ اس کے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

گھر آ گئیں۔ اگلے روز سے حمید احمد کی کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس شام کو حمید ...ہر ہوئے۔ ان کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ انہیں ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔ گاڑی ...لینے کے لئے آئے گی اور گاڑی ہی چھوڑ کر جائے گی۔

...قیس بیگم نے گاڑی کو دیکھا تو ان کی الجھن دور ہو گئی۔ ٹیوشن پڑھانے کے تیس ہزار تو کیا ...لاکھ بھی مل سکتے ہیں۔

دن گزرتے گئے۔ بلقیس بیگم کے لئے وہ عرصہ بڑی اداسی کا تھا۔ انہیں غم اس بات کا تھا کہ ...کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ وحید کے ساتھ تو وہ پہلے جیسی ہی تھیں۔ لیکن حمید احمد سے بس ...رنا ہی بولتی تھیں۔ بس ایک بار انہوں نے حمید احمد سے پوچھا تھا۔ "جہاں تم ٹیوشن ...انے جاتے تھے، وہ لوگ جان پہچان کے تھے؟"

"نہیں اماں۔ اجنبی لوگ تھے۔" حمید احمد نے جواب دیا تھا۔ اس روز بلقیس بیگم کا مان ...ہی ٹوٹ گیا تھا۔

...ہینے گزر گئے۔ حمید احمد کو احساس بھی نہیں ہوا۔ مصروفیت ہی اتنی تھی۔ پھر مصروفیت ہی ...تھی۔ پھر مصروفیت کم ہوئی تو شاید انہیں احساس ہو گیا۔ ایک دن انہوں نے ان سے کہا ...کیا بات ہے اماں۔ بہت چپ چپ رہتی ہیں آپ۔ میرے پاس بیٹھتی بھی نہیں آج ..."

"کچھ نہیں بیٹے۔ بولوں تو کیا بولوں۔"

"کچھ بولیں نا۔ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟"

"تم سے کیسی ناراضگی۔" وہ پھٹ پڑیں۔ "تم تو میرے لئے اپنے ہو۔ مگر میں تمہارے لئے ...نہیں۔"

حمید احمد گھبرا گئے۔ انہوں نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ خدا ...ہے۔ میں آپ کو اپنی ماں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔"

"...یہی کہا تھا تم نے مجھ سے پہلے دن۔" بلقیس بیگم نے اداسی سے کہا۔ "یہ میرا گھر ہے، تم ...بیٹے اور وحید میرا پوتا ہے۔"

"...ہوا کیا ہے اماں، بتائیں تو۔"

"گھر کے افراد سے کوئی کچھ چھپاتا ہے۔ تم نے مجھے وحید کے آپریشن کے متعلق نہیں

بتایا۔"

"میں جانتا تھا اماں کہ آپ پریشان ہو جائیں گی۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں ایک آدمی پریشان رہے، یہ کافی ہے، ایک تو بچارہ ہے۔"

"اور میں تمہیں پریشان دیکھ کر پریشان نہیں ہوئی۔"

"خدا کی قسم اماں، میں آپ کو اپنی اماں ہی سمجھتا ہوں۔ میں اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔"

"میں تمہارا اعتبار کیسے کروں؟ تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔"

حمید احمد بھونچکے رہ گئے۔ بلقیس بیگم نے بہت سخت لہجے میں بات کہی تھی۔ "کیا کہہ رہی ہیں اماں؟"

اب تو بلقیس بیگم پھٹ ہی پڑیں۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے تم سے اتنی شکایتیں ہوں گی کبھی۔ مجھے بہت شکایتیں ہیں تم سے۔ تم نے مجھ سے چھپایا کہ وحید کو کوئی تکلیف ہے، جس کے لئے آپریشن ضروری ہے۔ تم پریشان رہے اور پریشانی کا سبب مجھ سے چھپاتے رہے۔ اور تم نے اس لڑکی مدیحہ کو سب کچھ بتا دیا۔ . . ."

"یہ غلط ہے اماں۔"

لیکن بلقیس بیگم کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ "تمہیں پیسے کی طرف سے پریشانی تھی۔ تم نے مجھے پتہ بھی نہیں چلنے دیا۔ اور اس مدیحہ سے مدد مانگ لی۔ مجھ سے تو تم نے ان کے گھر آنے پر کہا تھا. . . . یہ کیا بلا پیچھے لگا لی آپ نے۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اور خود کیا کیا؟ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس سے جل رہی ہوں۔ مجھے تو وہ اتنی اچھی لگتی ہے کہ میرے بس میں ہو تو اسے بہو بنا لوں۔ اس گھر میں لے آؤں۔ تمہاری ناپسندیدگی دیکھ کر میں نے تم سے یہ بات نہیں کی۔ ورنہ میں تو بھانپ چکی تھی کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور تم نے مجھ سے بالا ہی بالا اس سے اپنی ضرورت بھی کہہ دی۔ میں تمہاری ماں مر گئی تھی کیا۔"

حمید احمد منہ کھولے سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "آپ پتہ نہیں کیا کچھ کہے جا رہی ہیں۔" انہوں نے احتجاج کیا۔ "میں نے کسی کو اپنی ضرورت نہیں بتائی۔ مدیحہ کو تو بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آپ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں مدیحہ سے رقم کیسے مانگ سکتا تھا۔"

"تم باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے ہو۔" بلقیس بیگم نے غصے سے کہا۔ "تم نے خود مجھے بتایا کہ

[illegible] ایک مہینے کی فیس تیس ہزار روپے دی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہ ممکن نہیں [illegible] میں نے تم سے پوچھا کہ جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے، وہ جاننے والے ہیں۔ تم [illegible] اجنبی ہیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ تم مدیحہ کے گھر جاتے ہو۔"

[illegible] نہیں. . . .

[illegible] حمید احمد کا منہ کھل گیا۔ "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

[illegible] گاڑی تمہیں لے جاتی اور واپس لاتی تھی، وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ اور وہ وہی گاڑی تھی، [illegible] مدیحہ یہاں آئی تھی۔"

[illegible] حمید احمد نے گہری سانس لی۔ "میں نے صرف اس لئے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈر تھا، نجانے کیا قیاس کریں گی اور مجھ سے الٹی سیدھی ضد کرنے لگیں گی۔"

[illegible] اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ اور ماں کو چھوڑ کر اس سے مالی مدد طلب کر سکتے [illegible]

بلقیس بیگم رونے لگیں۔

[illegible] حمید احمد کو بھی غصہ آ گیا۔ "میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔ آپ سے نہیں مانگ سکتا تو [illegible] سے کیا مانگوں گا۔ خدا کی قسم، میں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ میں تو بس اللہ سے مانگتا [illegible] میں تو مکان بیچنے والا تھا۔"

[illegible] مجھ سے کیوں نہیں کہا تم نے؟"

[illegible] کہتا تو سوائے آپ کو پریشان کرنے کے کیا حاصل ہوتا۔ آپ اتنی بڑی رقم کا بندوبست [illegible] سے کرتیں؟"

[illegible] ایسا نہیں ہے حمید۔ تیس پینتیس ہزار تو میرا بینک میں پڑا ہے۔ پھر لالو کھیت والا مکان چار پانچ لاکھ کا تو وہ ہے ہی۔ جب سے تمہارے پاس آئی ہوں، تم نے مجھے کچھ خرچ [illegible] نہیں دیا۔ اور میرے پاس جو کچھ ہے، وہ تمہارا اور وحید کا ہے۔ مجھے دکھ اسی بات کا تو [illegible] تم نے مجھے ماں کہا ہے لیکن سمجھا نہیں۔ تم اتنی معمولی سی رقم کے لئے پریشان ہوتے [illegible] اور تم نے مجھے پتہ بھی نہیں چلنے دیا۔ اور مدیحہ سے. . . ."

[illegible] . . . اب نہ کہئے گا یہ بات۔" حمید احمد نے غصے سے کہا۔ پھر انہوں نے اماں کو پوری [illegible] اب آپ جس بات پر بھی مجھ سے خفا ہیں، اسے بھول جائیے اور مجھے معاف کر [illegible] انہوں نے آخر میں کہا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں، میں اپنی اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی [illegible] آپ میرے لئے اماں ہی ہیں۔"

بلقیس بیگم انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "مسئلہ یہ ہے بیٹے کہ تم م
کرنے سے بھی ڈرتے رہے ہو اور اس سے بھی کہ تم سے محبت کی جائے۔ اسی لئے کہ تم نے
کسی کو دل کی، روح کی گہرائی سے نہیں چاہا۔ کسی نے تم سے محبت کی تو تم نے اسے قبول نہ
کیا۔ اس پر دھیان نہیں دیا اور تم نے محبت کی خواہش بھی نہیں کی۔ اسی لئے تم تنہا ہو۔ ا
لئے تم ڈرتے بھی ہو۔ جن کے پاس محبت کی طاقت ہو، نہ وہ تنہا ہوتے ہیں، نہ چھوٹے مو
بحرانوں سے گھبراتے ہیں۔ وہ اپنا دکھ، اپنی پریشانی کسی محبت کرنے والے کو بتاتے ہیں۔ ا
کا خوف ان کے سامنے نکالتے ہیں اور ان سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی
ستانے والی کمی ہے تمہارے اندر۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "تمہیں معاف کرنے
سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے خفا رہ ہی نہیں سکتی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ
سے جو زبانی تعلق تم نے قائم کیا ہے، اب اسے پکا کر لیا جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم خو
تبدیل کر لو.... میری خاطر، وحید کی خاطر اور خود اپنی خاطر۔"

حمید احمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "جو کہیں گی، میں کر لوں گا۔ میں آپ کو کھونا نہ
چاہتا اماں۔"

"میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ آئندہ ضرورت کے وقت تمہیں
مجھ سے مانگنا نہیں پڑے۔"

حمید احمد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "اس کی ضرورت نہیں اماں۔ میں آپ کی
وحید کی قسم کھاتا ہوں کہ ضرورت پڑے گی تو آپ سے کہہ دوں گا۔ ویسے آپ یقین کریں
پریشانی میں مجھے یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ورنہ میں ا
پریشان ہوتا بھی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتی ہوں۔ اب میں تم سے دوسری بات کروں گی۔ یہ مدیحہ بہت
اچھی لڑکی ہے۔ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔"

حمید احمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "آپ کی دونوں باتیں درست ہیں اماں۔ لیکن
دوسری پر مجھے اعتراض ہے۔"

"محبت پر کسی کا زور کب ہوتا ہے بیٹے۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے۔ جیسے مجھے تم سے ہو گئی۔"

"لیکن اس کا حق نہیں۔ اس کے اور میرے بیچ ایک بہت مختلف، بہت نازک رشتہ ہے۔"

بلقیس بیگم نے گہری سانس لی۔ "تم بہت پڑھے لکھے ہو۔ عقل اور سمجھ میں مجھ سے بہت
مگر پھر بھی میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"...م بھی نہیں اماں.... پلیز۔" حمید احمد گھگیانے لگے۔ "ابھی تو میں ایک ایسی بات کو قبول
...نے کی کوشش کر رہا ہوں، جسے قبول کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔"

"بات پر بات کرو، تبھی سمجھ میں آتی ہے۔ تبھی آسان ہوتی ہے۔ غلط بات پر ڈٹ جانا تو
...بات نہیں۔ پڑھے لکھوں کو تو یہ زیب بھی نہیں دیتا۔"

"پلیز اماں۔" حمید احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "اس پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔ ابھی
...ما۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" بلقیس بیگم نے کہا۔ ان کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔



حمید احمد باہر جانے کے لئے دروازہ کھول ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور وحید اندر آیا۔
''میں تمہیں دیکھنے کے لئے نکل رہا تھا۔'' انہوں نے ذرا خفگی سے کہا۔ ''مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔''

وحید ہانپ رہا تھا۔ ''اسی لئے تو بھاگتا ہوا آیا ہوں۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے اس کے ساتھ کھڑے کھڑے دیکھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ ماشاءاللہ ان کے کندھے تک پہنچ گیا تھا۔ ''چلو.... ہاتھ منہ دھو لو۔'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ معمول کے مطابق اسے پڑھانے کے لئے بیٹھے۔ یہ ان کے لئے خوشی کا وقت ہوتا تھا۔ وہ بہت برائٹ لڑکا تھا۔ پڑھنے میں ہمیشہ دلچسپی لیتا تھا۔ انہوں نے اس کی تربیت ایسی کی تھی کہ وہ ذہن سے سوچتا تھا۔ کتاب کو صرف پڑھتا نہیں تھا، غور کرتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ اس سے انہیں بڑی امیدیں تھیں۔ اس کا مستقبل روشن بھی دکھائی دیتا تھا۔

وحید طبعاً بھی بہت نیک اور سعادت مند تھا۔ اس نے کبھی انہیں پریشان نہیں کیا۔ باقاعدگی سے سکول جاتا۔ وقت پر کھیلنے جاتا۔ ہوم ورک دل لگا کر کرتا۔ اس کے علاوہ پڑھائی میں دلچسپی لیتا۔ وقت پر سوتا اور وقت پر اٹھتا۔ حمید احمد کو اپنے سکول کے زمانے کے ایک ٹیچر کی بات یاد آئی۔ وہ کہتے تھے 'یہ بڑے لوگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں۔' حمید احمد اللہ سے دعا کرتے کہ ان کا بیٹا ہمیشہ ایسا ہی رہے۔

ہوم ورک مکمل ہو گیا۔ حمید احمد اس سے سکول کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک وحید نے کہا۔ ''ابو.... آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے اچھا دوست باپ ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ''بالکل سچ ہے۔ تمہیں کوئی شک ہے اس میں؟''

''ٹھیک تو نہیں ہے ابو۔ لیکن میرے دوست میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ آپ تو نہیں کھیلتے۔'' وحید نے اعتراض کیا۔

حمید احمد کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ انہیں کھیلنے کی کبھی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اور بات مہلت کی بھی نہیں۔ ان کے اندر امنگ اور خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ کچھ کرنے، کچھ بننے کی کوشش میں لگے رہے۔ ''میں تمہارے ساتھ کھیلتا بیٹے۔ لیکن میں کبھی کھیلا ہی نہیں۔ مجھے کوئی کھیل بھی کھیلنا نہیں آتا۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ انہیں ایک اور زاویہ سوجھ گیا۔ ''دوسری بات یہ ہے بیٹے کہ باپ بیٹے کی عمر کا فرق بھی آڑے آ جاتا ہے نا۔ بیٹا جوان ہوتا ہے.... توانائیوں سے بھرپور اور باپ مضمحل ہوتا ہے۔ اس کے پاس اسٹیمنا نہیں ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیل پایا۔''

انہوں نے وحید کے چہرے کو دیکھا۔ وہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ مزید وضاحت ضروری تھی۔ ''جن لڑکوں کے ساتھ تم کھیلتے ہو، ضروری نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ ہاں، وہ تمہارے ہم جولی بہر حال ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''اصل میں دوست کی تعریف سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوست وہ ہے بیٹے، جو ضرورت کے وقت آپ کی مدد کرے۔ پریشانی میں آپ کی دل جوئی کرے۔ کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق آپ کو صائب مشورہ دے۔ جس سے آپ دل کی بات بے دھڑک کہہ سکیں اور وہ اسے راز رکھے۔ وہ اس بات کی تشہیر کر کے آپ کو اوروں کے سامنے شرمندہ نہ کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ سے بے غرض محبت کرتا ہو۔ آپ کی بہتری کو سب سے مقدم جانتا ہو۔ اور وہ آپ سے جواب میں کچھ بھی نہ چاہے۔ تم جنہیں دوست سمجھتے ہو، وہ تمہارے ہم جولی ہیں۔ تمہیں ساتھ کھیلنے کے لئے، وقت گزاری کے لئے ان کی ضرورت ہے اور انہیں تمہاری۔ ہاں، ان میں سے کوئی تمہارا دوست بھی بن سکتا ہے۔ وہ جو اس تعریف پر پورا اترتا ہو گا۔ مگر سب سے اچھا دوست باپ ہی ہوتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا ابو۔'' وحید نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے میں نے جاوید کو بتایا تھا کہ رات کو اکیلے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے تو اس نے یہ بات دوسرے لڑکوں.... میرا مطلب ہے ہم جولیوں کو بتا دی۔ اب سب ڈرپوک کہہ کر میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

”یہ تو چھوٹی بات تھی۔ اگر تم کوئی بڑی بات اسے بتا دیتے تو کیا ہوتا۔ نہیں بیٹے، دل کی بات صرف سچے دوست سے کہنی چاہئے۔“ حمید احمد نے کہا۔ ”اور بیٹے، دوست کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہو، اس نے آپ سے زیادہ دنیا دیکھی ہو تبھی تو وہ آپ کو صحیح مشورہ دے سکے گا۔ اچھا یہ بتاؤ‘ آج تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔“

وحید ہچکچانے لگا۔ ”ابو.... میرے دوست سگریٹ پینے لگے ہیں۔ وہ مجھے بھی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا، میں ابو کو بتائے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ اس پر وہ مجھے ڈرپوک ڈرپوک کہہ کر مذاق اڑانے لگے میرا۔ مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“

حمید احمد کا دل بری طرح دھڑکا۔ بیٹا اب حساس عمر میں داخل ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ”تمہارا دل چاہتا ہے سگریٹ پینے کو؟“ انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

وحید پھر ہچکچایا۔ ”جی ابو، چاہتا تو ہے۔“

”کیوں؟“ حمید احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”اس لئے کہ میرے دوست سگریٹ پیتے ہیں۔“

”یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ تمہارے دوست تو اپنے ابو سے چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں تو اس وجہ سے کیا تم بھی ایسا ہی کرو گے؟“ حمید احمد کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

”نہیں ابو۔ اچھا آپ بتائیں۔ سگریٹ بری چیز ہے؟ سگریٹ پینا بری بات ہے؟“

”مجھے پتا نہیں۔ اس لئے کہ میں نے کبھی سگریٹ پیا ہی نہیں۔“ حمید احمد نے سچائی سے کہا۔ ”مگر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔“

وحید احمد وہیں بیٹھا رہا۔ چند منٹ میں حمید احمد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا ایک سگریٹ تھا۔ ”میں پورا پیکٹ خریدنا چاہتا تھا۔ مگر مہنگا بہت ہے۔ میں نے سوچا، تجربہ تو ایک سگریٹ میں بھی ہو سکتا ہے۔“

وحید بڑے اچنبھے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ”جاؤ.... جا کر ماچس لے آؤ کچن سے۔“

وحید گیا اور ماچس لے آیا۔ حمید احمد نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور دیا سلائی جلا کر سگریٹ جلائی۔ ”اب ایک کش میں لوں گا۔ پھر تم لینا۔ اس کے بعد اس پر بات کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔“

وحید سر ہلاتے ہوئے بہت غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ حمید احمد نے بہت گہرا کش لیا۔ دھواں تیزی سے ان کے حلق میں بھرا اور انہیں پھندا لگ گیا۔ سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ کھانستے کھانستے دہرے ہوئے۔ وحید پریشان ہو کر ان کی پیٹھ سہلانے لگا۔ ”کیا ہوا ابو؟“ وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔ حمید احمد کھانسے جا رہے تھے۔

بلقیس بیگم نے ان کے بری طرح کھانسنے کی آواز سنی تو پریشان ہو کر باہر نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ ”کیا ہو گیا؟“

”کچھ نہیں.... اماں.... تجربہ کر رہے تھے.... پھندا لگ گیا۔“ حمید احمد نے بمشکل کہا۔

”ناک چٹکی سے بند کرو اور منہ کھول کر چھوٹا سا گھونٹ لو۔“ بلقیس بیگم نے ہدایت کی۔ حمید احمد نے ہدایت پر عمل کیا۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ ”آپ جائیے اماں۔ پانی کا گلاس یہیں چھوڑ جائیے۔ پھندا دوبارہ بھی لگ سکتا ہے۔“

”کر کیا رہے ہو تم دونوں۔“ بلقیس بیگم نے بھنا کر کہا۔ ان کی نظر گرے ہوئے سگریٹ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔

حمید احمد نے وحید کی طرف دیکھا‘ جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ”ابو.... اب اور کش نہیں لیجئے گا۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ حمید احمد نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں پاگل ہوں کہ بلاوجہ تکلیف اٹھاؤں۔ اب تو تمہیں کش لینا ہے بیٹے۔“

وحید کا چہرہ فق ہو گیا۔ ”میں....؟ نہیں ابو۔ میں نہیں پیوں گا۔“

حمید احمد سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس طرح کش لیا تھا کہ پھندا لگے۔ اور وحید ڈر بھی گیا تھا۔ اب وہ اسے یہیں چھوڑ دیتے تو تلقین ادھوری رہ جاتی۔ یہ ضروری تھا کہ وحید کش لے۔ اور اسے بھی پھندا لگے۔ لیکن یہ امکان بھی تھا کہ اسے پھندا نہ لگے۔ مگر حمید احمد اس بات پر تکیہ کر رہے تھے کہ ہر بیٹے کا آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ ہر کام اپنے باپ کے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ جب وہ کش لے رہے تھے تو وحید انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ تو انہیں یہ رسک لینا ہی تھا۔ اس کے بغیر یہ سبق نامکمل ہی رہتا۔ ”نہیں بیٹے! ایک کش تو تمہیں لینا ہی ہو گا۔ اپنے

لئے اچھے اور برے کا فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔" انہوں نے گری ہوئی سگریٹ اٹھائی اور بیٹے کی طرف بڑھائی۔

سگریٹ لیتے ہوئے وحید کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ ملتجی نگاہوں سے حمید احمد کو دیکھ رہا تھا۔ "بس ایک کش لو.... گہرا کش۔ میں دوسرے کو نہیں کہوں گا۔" حمید احمد نے کہا۔

وحید نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہونٹوں میں لی اور کش لیا۔ وہ کش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا اور گھبراہٹ اور خوف بھی تھا۔ اس کا حشر حمید احمد سے بھی زیادہ خراب ہوا۔ وہ تو لوٹ پوٹ ہو گیا۔ حمید احمد کا دل کٹنے لگا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ بڑی اور مسلسل تکلیف سے بچانے کے لئے یہ تکلیف پہنچانا ضروری تھا۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور بلقیس بیگم والی ہدایات دہرائیں۔

بلقیس بیگم پھر کچن سے نکل آئی تھیں۔ مگر ان کے پہنچتے پہنچتے وحید کی طبیعت سنبھل گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ پہلے باپ کو پھندا لگا اور اب بیٹے کو۔" وہ بگڑ کر بولیں۔

"کچھ نہیں اماں۔ ایک تجربہ کر رہے ہیں ہم لوگ۔" حمید احمد نے بے حد معصومیت سے کہا۔

مگر اس بار بلقیس بیگم کی نظر سگریٹ پر پڑ گئی۔ وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ "تو سگریٹ پی رہے ہو تم لوگ۔ یہ ذلیل چیز...." انہوں نے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "حمید احمد! تم نے تو اپنی زندگی میں کبھی اس بدبودار چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جھوٹ بولنے سے جو بدبو پیدا ہوتی ہے منہ میں' اس سے کچھ ہی کم بدبو ہو گی اس کی۔"

"اماں' ہم سمجھنا چاہ رہے تھے کہ لوگ سگریٹ کیوں پیتے ہیں آخر۔ کوئی لطف تو آتا ہو گا۔" حمید احمد بولے۔

"تو لطف آ گیا تھا۔ لوگ تو شوق میں شروع کرتے ہیں۔ پھر عادی ہو جاتے ہیں اس کے۔" بلقیس بیگم نے وحید کو لپٹا لیا۔ "میرے بچے پر تو تم رحم ہی کرو۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ معاف کر دیں۔ اب نہیں پئیں گے۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر وحید سے بولے۔ "اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"خود ہی پھینک دو۔ یہ آئندہ کبھی اسے چھوئے گا بھی نہیں۔" بلقیس بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔

حمید احمد نے چپل سے سگریٹ کو مسل دیا۔ "ٹھیک ہے اماں۔ اب آپ کھانا تو پکا لیں۔"

بلقیس بیگم بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ حمید احمد نے بیٹے سے کہا۔ "یار' مجھے تو

بڑی فضول چیز ہی لگی۔ لیکن ضروری نہیں کہ تم بھی میرے خیال سے اتفاق کرو۔ تو تم چاہو تو سگریٹ پی لیا کرو۔"

"نہیں ابو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے اس سے۔ لیکن ابو' ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمیں برا لگا۔ میرے دوستوں کو کیوں نہیں لگتا۔"

"ایک بات یاد رکھو بیٹے۔ کوئی چیز بھی سب کے لئے ایک جیسی نہیں ہوتی۔" حمید احمد نے کہا۔ "کوئی چیز کسی کے لئے ہوتی ہے' کسی کے لئے نہیں۔ لگتا ہے' سگریٹ ہمارے لئے نہیں ہے۔"

"جی ابو۔" وحید نے بڑی شدت سے سر ہلایا۔ "تجربے سے یہی ثابت ہوا ہے۔"

حمید احمد مطمئن ہو گئے۔ یہ امکان بہت قوی ہو گیا تھا کہ وحید اب سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔

☆

وہ کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ بالکل اچانک بارش شروع ہو گئی.... تیز بارش۔ حمید احمد برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئے اور صحن کے پختہ فرش پر بوندوں کا رقص دیکھنے لگے۔ برآمدے کا شیڈ والا بلب انہوں نے روشن کر دیا تھا۔ اس روشنی میں گرتی ہوئی بارش کا منظر انہیں بے حد مسحور کن لگ رہا تھا۔

ایک گھنٹا ہو گیا۔ بارش نہیں رکی۔ انہوں نے اندر جا کر دیکھا۔ اماں بھی سو چکی تھیں اور وحید بھی۔ بارش بھی عجیب چیز ہے۔ مختلف لوگوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے سکون ملتا ہے۔ کچھ بے چین ہو جاتے ہیں۔ کچھ کو نیند آنے لگتی ہے اور کچھ کی نیند اڑ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے خوشی اور سرمستی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ لوگ اس سے کھیلنے لگتے ہیں۔

حمید احمد کے لئے اب یہ یادوں کو جگانے والا موسم تھا۔ ابتدا میں تو وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ بارش جب بھی ہوتی' ان کے اور اماں کے لئے تکلیف اور پریشانیاں لاتی۔ وہ سو نہیں پاتے تھے۔ پھر اللہ نے انہیں ٹھکانا دے دیا۔ تب بارش ہوتی تو انہیں پہلے دور کے ٹپکتے ہوئے مصائب یاد آتے۔ وہ باہر نکلتے اور گلیوں میں اور سڑکوں پر سیلاب کی کیفیت دیکھتے تو بارش کے لئے ان کی نفرت دوچند ہو جاتی۔ پورے شہر کو عذاب میں مبتلا

کردیتی ہے یہ بارش!

پھر ایک دن بارش کی جھڑی میں اچانک مدیحہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ان ے
انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کچھ لوگوں کو بارش اچھی بھی لگتی ہے۔ یہ موسم انہیں پاگل کر
ہے۔ انہیں یہ جان کر بہت حیرت ہوئی۔

اس روز انہوں نے مدیحہ کے ساتھ آدھا دن گزارا تھا۔ وہ چند گھنٹے ان کے لئے آگہی
تھے۔ اس روز انہوں نے بہت کچھ سمجھا' سیکھا اور جانا تھا۔ ایسا بہت کچھ جس سے وہ بے
تھے۔ ان کے بہت سے نظریات کی اصلاح ہو گئی تھی۔ وہ حیران ہوئے تھے کہ آدمی اپنے
چھوٹے.... بہت چھوٹے کسی، شخص سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس روز انہوں
بارش کو ایک اور رخ سے دیکھنا سیکھا تھا۔ بارش میں ایک پہلو لطافت کا ہوتا ہے۔ یہ مدیحہ
انہیں بتایا تھا۔ اور اس روز انہوں نے محبت کو دیکھا اور سمجھا تھا کہ وہ کوئی کتابی اور افسانوی
نہیں۔ وہ تو ایک نعمت ہے' جو خوش نصیبوں کو عطا کر دی جاتی ہے۔ انہیں اس کچی عمر کی ا
پر رشک آیا تھا اور انہیں محرومی کا احساس بھی ہوا تھا۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ با
اور محبت ہم آہنگ ہیں۔ دونوں ہی آدمی کو مست اور بے خود کر دیتے ہیں۔ اور اس
بے خودی میں آدمی بڑے سے بڑا خطرہ بے دھڑک مول لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور ان
گھنٹوں کی رفاقت نے آخر میں انہیں آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس دن کے بعد بارش کے ساتھ ان کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ ہاں' وہ یادیں اب بھی
تھیں۔ مگر انہیں پرانے مصائب یاد نہیں آتے تھے۔ انہیں مدیحہ کے ساتھ گزرے ہو
چند گھنٹے مکمل جزئیات کے ساتھ یاد آتے تھے۔ بارش میں وہ محبت کے.... اور اس
محرومی کے بارے میں سوچتے تھے۔ انہیں ایک شعر یاد آتا تھا....

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اور وہ سوچتے تھے کہ انہیں وہ دل ہی نہیں ملا تو شکایت کیسی؟ محرومی پر گلہ کیا؟

اس وقت بھی وہ یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ یہ سب باتیں پانچ سال پرانی تھیں۔ برآمد
میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے برسات کے ان چند گھنٹوں کو گزار لیا۔ مگر بات یہیں پر نہیں رکی
وہ مدیحہ کے ساتھ گزارے ہوئے ہر پل کو دوہراتے تھے۔ اس کے گھر کی اسٹڈی

پہلانے سے لے کر آخری دن رخصت ہونے تک کا ہر پل۔ مگر تین سال تک بات یہیں
کی محدود رہی۔ پھر اماں نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا' جو انہیں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔
انہیں یاد تھا' وحید کے آپریشن کے بعد اماں نے ان سے مدیحہ کے موضوع پر بات کرنے
کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس وقت انہوں نے اماں کو ٹال دیا تھا۔ اماں بھی طویل عرصے تک
چپ بیٹھی رہیں۔ مگر تین سال کے بعد انہوں نے دوبارہ بات چھیڑی اور اس بار حمید احمد
انہیں روک نہیں سکے۔

اماں اپنی کہتی رہیں۔ وہ مدیحہ کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ "وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"
انہوں نے آخر میں کہا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"اسے میری بہو بنا دو۔"

"ضرور بنا دیتا۔ لیکن وحید ابھی بہت چھوٹا ہے اماں۔" حمید احمد نے شگفتگی سے موضوع کی
سنجیدگی کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔

"مسخرا پن مت کرو۔" اماں نے بگڑ کر کہا۔ "تم جانتے ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

حمید احمد بھی سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ ممکن نہیں ہے اماں۔" انہوں نے کہا۔ "اس کی اور میری
عمر میں بہت بڑا فرق ہے۔"

"کچھ ایسا فرق بھی نہیں ہے۔ تم چالیس کے ہو گے۔ اور وہ تئیس چوبیس کی تو ہے۔"

"دھاندلی نہ کریں اماں۔ وہ بیس اکیس کی ہے اور میں بیالیس کا۔ دگنے سے زیادہ کا فرق ہے
اس کی اور میری عمر میں۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" اماں نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمارے مذہب نے سب
کچھ واضح کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں دو افراد کے درمیان شادی کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ آپس
میں نامحرم ہوں اور ایک دوسرے کو ناپسند نہ کرتے ہوں۔ کامیاب شادی وہ ہے' جس میں
دونوں ایک دوسرے سے خوش رہیں۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ اس کی دونوں مثالیں تو
قرآن پاک میں موجود ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی حضرت خدیجہؓ اور حضرت
عائشہؓ سے شادی۔ آپؐ نے شادی میں عمر کے فرق کی پوری طرح نفی کر دی تھی۔"

حمید احمد ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے

مدلل انداز میں بات کر سکتی ہیں۔ مگر ان کی تو پہلی ہی بات ایسی تھی کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے۔ ایسے کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ "اماں، آپ اتنا بڑا حوالہ کیوں دے رہی ہیں۔ ہم تو انسان ہیں...."

"گستاخانہ بات مت کرو حمید احمد۔" اماں نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ حضورؐ نے کوئی کام بھی اپنی خوشی کے لئے 'اپنی ذاتی ضرورت کے لئے نہیں کیا۔ آپؐ کا ہر فعل، ہر عمل نظیر ہے۔ امت کے لئے جائز اور ناجائز میں فرق ہے۔ امت کی رہنمائی کے لئے ہے۔ تبھی تو رسول کریمؐ کی سنت پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ تم اس پر کیسے بات کر سکتے ہو۔"

حمید احمد دم بخود رہ گئے۔ واقعی.... اب اس پر بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی انہوں نے کہا۔ "اماں.... یہ اسلامی معاشرہ کب ہے۔ یہاں تو ایسی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"تو کیا اس ڈر سے تم سنت رسولؐ سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ دو گے؟ تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ تم کہاں ہو گے.... اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔"

اس بار حمید احمد لرز کر رہ گئے۔ لیکن اماں 'استاد اور شاگرد کے درمیان احترام کا رشتہ ہے۔ میں اس رشتے 'اس تعلق کو بدنام کرا دوں۔ مطعون ہو جاؤں؟"

"ہاں۔" اماں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کہتے ہیں کہ استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے، یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟ تو بیٹے 'استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے.... احترام کے لحاظ سے۔ مگر باپ نہیں ہوتا۔ اگر استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہوں تو ان کی شادی میں قباحت نہیں۔ کہو تو میں مثالیں دوں.... اور وہ بھی بڑے لوگوں کی؟"

"نہیں اماں۔ اُس کی ضرورت نہیں۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا۔ "لیکن آپ اس پر مصر ہیں کہ میں مدیحہ سے شادی کروں۔ جبکہ میں شادی بارہ سال پہلے بھی کر سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کی کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"یہ بھی غیر فطری بات ہے۔ اور شادی کے لئے میں یوں کہہ رہی ہوں کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"میں تو نہیں کرتا اس سے محبت۔" حمید احمد

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ وہ تو محبت کرتی ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گی تو تم بھی کرنے لگو گے۔"

"دیکھئے اماں۔ شادی کی شرط یہی ہے نا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں اور خوش رہ سکیں۔" حمید احمد کو بھی جواب سوجھ ہی گیا۔ "تو سچ یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔"

اب کے اماں بھونچکی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے سنبھل کر کہا۔ "تم یہ بات ضد میں کہہ رہے ہو حمید احمد۔ میں دیکھ چکی ہوں کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔" حمید احمد نے اس وقت اسے اپنی کامیابی سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس روز ان کی تمام دلیلیں رد ہو گئیں۔ تمام دفاعی حصار توڑ دیئے گئے۔ ان کے پاس صرف ایک جواز رہ گیا.... ناپسندیدگی کا۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ وہ مدیحہ کو ناپسند نہیں کر سکتے۔ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو اس پر رشک کرتے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ ان کا موقف کمزور پڑ گیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد جب بھی کبھی بارش ہوئی اور انہوں نے بلا ارادہ مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کیا تو انہوں نے چونک کر خود سے پوچھا کہ کیا وہ ناپسندیدگی کے باعث ایسا کر رہے ہیں۔ انہیں خود بھی یہ سوال مضحکہ خیز لگا۔ کوئی کسی کو ناپسندیدگی سے اتنی شدت سے تو یاد نہیں کرتا۔ پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ وہ ایک سچے اور HONEST آدمی ہیں۔ تو کیا وہ واقعی ایسے ہیں؟ اس کا جواب انہوں نے اکڑ کر دیا۔ "میں ایسا ہی ہوں۔"

اس کے نتیجے میں بحث چھڑ جاتی۔ "یہ بتاؤ کہ تم جو مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو اس طرح یاد کرتے ہو 'تو یہ محبت نہیں ہے؟" ان کے اندر بیٹھا وکیل استغاثہ پوچھتا۔

"نہیں۔ یہ محبت ہوتی تو میں اپنا وعدہ پورا کرتا 'جو میں نے مدیحہ سے کیا تھا۔ میں اس کے لئے اعتراف کرتا اور اپنی کالج کی جاب چھوڑ دیتا۔"

"تو پھر کیوں یاد کرتے ہو اسے؟ اس کا کوئی سبب تو ہو گا۔" وکیل استغاثہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گئے۔ "یہ احمقانہ سوال ہے۔ کوئی کسی کو کسی بھی وجہ سے یاد کر سکتا ہے۔ صرف

محبت ہی تو اس کی وجہ نہیں ہوتی۔" انہوں نے اعتراض کیا۔

"اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" ان کے اندر بیٹھے جج نے رولنگ دی۔ "سوال کا جواب دیا جائے۔"

حمید احمد سوچتے رہے۔ "دیکھئے می لارڈ۔ ملزم سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا ہے۔" استغاثہ نے وار کیا۔

"میں سوچ رہا ہوں می لارڈ۔" حمید احمد نے کہا۔ "دراصل مدیحہ سے میرا تعلق بہت ہے۔ ہمارے درمیان احسان کا رشتہ ہے۔ وہ میری محسنہ ہے۔ اس نے بروقت خون نہ دیا ہوتا تو شاید آج میرا بیٹا زندہ نہ ہوتا۔ اور اگر اس نے درپردہ میری مدد نہ کی ہوتی تو میں مکان اونے پونے بیچ چکا ہوتا اور بے گھر ہوتا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی اپنے محسن کو اچھے انداز میں یاد نہ کرے۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔" آخر میں ان کا لہجہ فاتحانہ ہو گیا۔

جج نے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ سنایا۔ "استغاثہ اپنے موقف کو موثر انداز میں پیش کرنے اور فیصلہ کن شواہد سامنے لانے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ ملزم کی دلیل کمزور ہے۔ اس کے بیان سے عدالت کی تشفی نہیں ہوتی۔ تاہم یہ عدالت شبہے کا فائدہ دیتے ہوئے اسے بری کرتی ہے۔"

ہر بارش میں یہی کچھ ہوتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ پھر برآمدے میں پڑے تخت پر لیٹ کر بارش کا نظارہ کرتے ہوئے حمید احمد کو اونگھ آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری طرح سو گئے۔

انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شادی میں شریک ہیں۔ وہ ایک جوان اور خوش شکل دولہا کے پاس بیٹھے ہیں۔ نکاح خواں نکاح نامے کا فارم بھر رہا ہے۔ وہ اس میں دیکھتے ہیں، دلہن کے نام کے آگے مدیحہ حامد لکھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی ان کے دل و دماغ میں آندھیاں چلنے لگی ہیں۔ وہ اٹھ کر زنان خانے کی طرف بھاگتے ہیں، جہاں دلہن عورتوں میں گھری بیٹھی ہے۔ دلہن کا چہرہ سہرے میں چھپا ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر سہرا اٹھاتے ہیں تو ان کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ وہ مدیحہ ہے۔

اب خواب میں تمام عورتیں غائب ہو گئیں۔ بس وہ اور مدیحہ رہ گئے۔ "مدیحہ.... تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟" انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا کروں۔ ساری عمر تو نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ ممی اور پاپا نے مجبور کر دیا مجھے۔"

"نہیں ہو سکتا۔ ابھی لوگ تم سے قبول کرانے آئیں گے۔ تم انکار کر دینا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اپنے والدین کی بے عزتی تو نہیں کرا سکتی۔"

"کوئی بے عزتی نہیں ہو گی۔ میں تم سے شادی کروں گا۔"

"اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ بھی سوچا آپ نے؟"

"لوگوں کی کیا اہمیت ہے۔ اصل چیز تو ہماری خوشی ہے۔"

"لوگوں کی اہمیت ہے حمید صاحب۔ بہت اہمیت ہے۔ سب سے زیادہ اہم تو لوگ ہی ہوتے ہیں۔" مدیحہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "انسان معاشرتی جانور ہے۔ جہاں گنجا ہونا معیوب ہو، لوگ وہاں گنجے نہیں ہوتے۔ ہمیں اس معاشرے میں لوگوں کے درمیان رہنا ہے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے، جو اس معاشرے کو پسند نہیں۔"

حمید احمد کو یاد تھا۔ ان کی بات انہیں لوٹائی جا رہی تھی۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں انکار کرنا ہو گا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آپ اپنے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں حمید صاحب! میں انکار نہیں کروں گی۔"

حمید احمد بیٹھ گئے اور مدیحہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "مدیحہ.... تمہیں میری محبت کی قسم انکار کر دو۔"

"سوری حمید صاحب۔" مدیحہ نے کہا۔ "میں جانتی ہوں، آپ مجھ سے کبھی شادی نہیں کریں گے۔"

حمید احمد اصرار کرتے رہے اور مدیحہ اپنی جگہ ڈٹی رہی۔ بالآخر حمید احمد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بس یہی کہے جا رہے تھے.... "میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ۔ میرا یقین کرو، مجھ پر اعتبار کرو۔" لیکن مدیحہ انکار کئے جا رہی تھی۔

حمید احمد کی آنکھ کھلی تو وہ سچ مچ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ان کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ وہ نیند اور بے اختیاری کے درمیان معلق تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ خواب سے بیدار ہوئے ہیں لیکن خواب کی کیفیت کو جھٹکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ابھی تک خواب کے اس لمحے میں موجود تھے۔ چند لمحوں میں کیفیت کچھ بہتر ہوئی۔ ان کی دھاڑیں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ لیکن آنسو اب بھی بہے جا رہے تھے اور وہ مسلسل کہے جا رہے تھے۔ "میں تمہیں

کسی اور کی نہیں بننے دوں گا میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ ....."

ان کی ہچکیاں تھمیں۔ ہوش و حواس بحال ہوئے' تب بھی ان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ انہیں ایک جھٹکا سا لگا۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ ان کی یادداشت میں موجود تھے.... گونج رہے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ برسات تھم چکی تھی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتا چلا کہ اندر کی برسات جاری ہے۔ ان کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہے جارہے ہیں۔

"اب ملزم سے پوچھا جائے می لارڈ کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔" اندر بیٹھے وکیل استغاثہ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"ملزم جواب دے۔" جج نے ان سے کہا۔

"می لارڈ، میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے مدیحہ سے محبت ہے۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ ان کی سماعت تک بھی پہنچی۔

حمید احمد نے جھرجھری لی۔ تو میں ہار گیا۔ وہ بڑبڑائے۔ اور میں ایک سچا اور HONEST آدمی ہوں۔ میں اپنا وعدہ بھی پورا کروں گا۔

انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھے سوچ رہے۔ تو یہ دن زندگی کا اہم ترین دن بن گیا ہے۔ آج ایک عہد ختم ہوا اور دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔ آج سے تدریس کا پیشہ میرے لئے نہیں رہا۔ اب کیا کرنا ہے، یہ بعد میں سوچیں گے۔ اور آج جاکر مدیحہ کے سامنے اعتراف بھی کرنا ہے.....

وہ گھبرا گئے۔ روبرو؟ یہ تو بہت مشکل ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اتنی بڑی بات.... اتنے برسوں کے بعد.... اور وہ بھی آمنے سامنے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ خط بھی تو لکھا جاسکتا ہے۔ وہ پرسکون ہوگئے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ خط لکھیں گے اور آج ہی پوسٹ کردیں گے.... رجسٹرڈ ڈاک سے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ ایسے بوجھ کو جلدی اتار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔



ان کے سر اور داڑھی کے بال پوری طرح سفید تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ آنکھیں لکی چمک دار تھیں کہ آر پار دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر ایسا رعب تھا کہ نگاہ ٹھہرانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی عبا پہنے ہوئے تھے۔

مدیحہ ان کے سامنے نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔

"میں تیرے لئے ایک بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں بچی۔" بزرگ نے کہا۔ "جن سجدوں پر تو شرمندہ ہوتی رہی ہے' انہیں قبول کرلیا گیا ہے۔ تیرے سجدوں کی سچائی کی راہ سے ہر رکاوٹ ہٹالی گئی ہے۔ تیری نمازیں مقبول ہوگئی ہیں۔ ہر کھوٹ دور کردیا گیا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" مدیحہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"تو یہی چاہتی تھی نا بچی؟"

"جی ہاں! میں یہ بھی چاہتی تھی۔"

"تو کچھ اور بھی چاہتی تھی۔ وہ اب بھی چاہتی ہے؟"

"جی ہاں میرے بزرگ۔" مدیحہ کی آواز لرزنے لگی۔

"میں ایک اور خوش خبری بھی لایا ہوں تیرے لئے۔" بزرگ نے کہا۔ "آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاء اللہ مل جائے گا۔"

بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا....

اذان کی آواز سے مدیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہاتھ اب بھی اسے اپنے سر پر رکھا محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ میں' پورے وجود میں جیسے سکون سا پھیلتا جارہا تھا۔ پھر لمحوں میں اس ہاتھ کی موجودگی کا احساس معدوم ہوگیا۔ مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ چند لمحوں میں اس خواب کی سچائی اس

پر روشن ہو گئی۔ پہلی بار نماز پڑھتے ہوئے ایسا ہوا کہ حمید احمد کا چہرہ اس کے تصور میں نہیں تھا۔ چہرہ کیا' اس کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں تھا۔ اس نے اس سوچ کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اب وہ مکمل یکسوئی اور ارتکاز کے ساتھ اپنے رب کے حضور موجود تھی۔ اس کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

نماز کے بعد اس نے تسبیح پڑھی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اسی لمحے خواب والے بزرگ کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجے.... آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاءاللہ مل جائے گا۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سجدے میں گر گئی۔ اے اللہ.... آپ سے تو کچھ بھی مانگا جا سکتا ہے۔ آپ جو چاہیں دے دیں۔ میرے مہربان رب.... زندگی آپ کی عطا کردہ نعمتوں' آپ کی عنایات سے معمور ہے۔ سب کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے۔ مگر بندے کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ دونوں کی.... میری اور حمید صاحب کی دنیا اور آخرت کی بہتری کے ساتھ' سچی خوشیوں' محبت اور ہم آہنگی کے ساتھ....

اس نے وہی کچھ مانگا' جو وہ ہر نماز کے بعد مانگتی تھی۔ مگر آج دعا کے بعد اس سکون کا احساس ہوا' جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے اندر یقین ابھرا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے۔

اس نے معمول کے مطابق نسیمہ کو جگایا اور خود بالکونی میں چلی گئی۔ وہاں کرسی پر بیٹھ کر اس نے باہر جانے پہچانے منظر کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ ایک سال پہلے جب وہ اس فلیٹ میں نئی نئی آئی تھی تو اسے یہ سب کچھ کتنا عجیب لگا تھا۔ مگر اب وہ مانوس ہو گئی تھی۔ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے.... زخم محبت کے سوا۔

محبت! جب اس نے حمید احمد کو آخری بار اپنے ڈیفنس والے گھر سے رخصت کیا تھا۔ اس بات کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ پانچ سال.... پانچ صدیوں جیسے! کتنا کچھ ہو گیا تھا اس عرصے میں۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بس ایک چیز نہیں بدلی تھی.... حمید احمد کی محبت!

امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ بی اے آنرز میں اس کا خاص مضمون اسلامک اسٹڈیز تھا۔ پھر پہلا بڑا واقعہ پیش آیا۔ سمیعہ باجی اور نعیم بھائی کے درمیان علیحدگی ہوئی۔ گھر کے لوگ تصفیہ کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔ لیکن بات بنی نہیں۔ سمیعہ باجی نے خلع لے لیا۔

مدیحہ کے لئے وہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ سمیعہ باجی کی نعیم بھائی سے محبت اور پھر طویل انتظار کے بعد شادی نے اس پر بڑا گہرا اور ان مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی بے غرض' بے طلب محبت انہی کی وجہ سے طلب آلودہ ہوئی تھی۔ اتنی محبت' اتنا انتظار' اتنا ایثار.... اور اس کے بعد ایک سال کے اندر علیحدگی! یہ سب کیا ہے؟ کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے؟

اس نے یہی سوال باجی سے کیا۔ باجی افسردہ ہو گئیں۔ "نہیں.... ضروری نہیں۔ بس اپنا اپنا نصیب ہے۔"

"مگر کیوں باجی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اور کیا آپ کی محبت ختم ہو گئی؟ اور نعیم بھائی کی محبت؟"

"نہیں گڑیا۔ میری محبت بھی وہی ہے اور نعیم کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔"

"تو پھر؟"

"سب کچھ وہی ہے۔ بس فضا بدل گئی۔ اور محبت کو فضا کا بدلنا راس نہیں آتا۔"

"میں سمجھی نہیں باجی۔"

"شادی ہوئی تو میں بہت خوش تھی۔ لیکن شادی کے بعد دھیرے دھیرے پتہ چلنے لگا کہ نعیم اب وہ نہیں رہے' جن کا میں نے آٹھ سال انتظار کیا تھا۔ اس میں ان کا اتنا قصور نہیں۔ غلطی میرے ڈیڈی اور ممی کی ہے۔ وہ ابتدا ہی میں انہیں قبول کر لیتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نعیم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے پانے کے لئے بڑے جتن کئے۔ بے ایمانیاں کیں' کرپشن میں ملوث ہوئے' احسان کرنے والوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ صرف چار سال میں وہ یونہی لالو کھیت سے ڈیفنس سوسائٹی نہیں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے معمولی جاب سے اسٹارٹ کیا تھا اور اب ان کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ انہوں نے اپنی اچھائیاں ترک کیں اور برائیوں کو اپنایا۔ صرف چار سال میں وہ اس سب کچھ کے عادی ہو گئے۔ وہ نعیم نہیں رہے' جن سے میں محبت کرتی تھی۔ اور انہوں نے یہ سب کچھ میری خاطر کیا۔" باجی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اور جب میں نے کہا کہ میری خاطر یہ سب کچھ چھوڑ بھی دو۔ پہلے جیسے ہو جاؤ۔ تو انہوں نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں پاگل ہوں۔ وہ یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا بڑی مشکل سے انہوں نے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ اسے بلاوجہ کیوں گنوائیں۔ اور

اس دنیا میں کامیابی کرپشن سے ہی ملتی ہے۔ خود بھی حرام کھاؤ اور دوسروں کو بھی حصہ دو کیونکہ قاعدے قانون سے یہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔ پلاٹ بھی نہیں ملتا۔ بلڈنگ تعمیر کرنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ اور تعمیر کے بعد بلڈنگ پاس بھی نہیں ہوتی۔ اتنے آبجیکشن لگتے ہیں کہ بندہ جواب سوچتے سوچتے پریشان ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ' میں کیا کرتی۔ میں وہ لڑکی ہوں' جس نے ایک شخص سے محبت کی' اس سے شادی کے خواب دیکھے۔ گھر والوں سے بغاوت کی۔ بیسیوں رشتے ٹھکرائے اور عمر نکل جانے کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس شخص کا آٹھ برس تک انتظار کرتی رہی۔ اور جب وہ ملا تو وہ بھی ویسا ہی بن چکا تھا' جیسوں کے رشتے میں نے ٹھکرائے تھے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزارتی' جس کے پاس پرانی چیزوں میں صرف اپنا نام رہ گیا ہے۔ جس کی پوری شخصیت' تمام نظریات تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ تو اجنبی تھے میرے لئے۔ میں علیحدہ ہونے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔"

مدیحہ یہ سب جان کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ تو کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن نہیں۔ حمید احمد ایسے نہیں۔ وہ اپنے اصول نہیں چھوڑتے۔ اور اگر انہوں نے چھوڑ دیئے تو کیا اس پر بھی یہی گزرے گی' جو سمیعہ باجی پر گزر رہی ہے؟

سمیعہ باجی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ "کیا بات ہے مدیحہ۔ لگتا ہے' تم بھی محبت کی چوٹ کھا بیٹھی ہو۔"

جواب میں مدیحہ نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ وہ اپنی بہترین سہیلی سے بھی یہ بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنا آپ بہت بوجھل لگنے لگتا تھا۔ سو اس نے چوٹ کھائی ہوئی سمیعہ باجی کو اپنا رازدار بنا لیا۔

سمیعہ باجی نے اس کی روداد بڑی توجہ سے سنی۔ پھر بولی۔ "بلاشبہ تمہارے حمید صاحب بڑے آدمی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ انا سے بھی کام لے رہے ہیں۔"

"بڑے آدمی تو وہ ہیں۔" مدیحہ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کی دوسری بات میں سمجھی نہیں۔"

"بھئی' جب تم ان کی شاگرد نہیں رہیں تو مسئلہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اب یہ انا ہی تو ہے کہ جو منہ سے نکل گیا' اٹل ہے۔ دوسرے وہ اپنے مضمون میں چاہے عالم ہوں لیکن عمومی طور

مما علم کی کمی ہے۔ انہوں نے اس معاملے کو اسلامی نکتہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی ...ش ہی نہیں کی۔"

...ہی میں نے بھی کہا تھا۔" مدیحہ بڑے جوش سے بولی۔ "لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے میں ...ا قائل نہیں کر سکی۔"

...دیکھو.... اسلام میں رشتوں کے متعلق سب کچھ واضح ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے ...شتوں کے بارے میں حکم دیا ہے کہ انہیں توڑا نہ جائے۔ بلکہ درگزر سے کام لے کر قائم ...جائے۔ وہ سب خون کے رشتے ہیں۔ ماں باپ' بہن بھائی' دادا دادی' نانا نانی' چچا ...ی' خالہ ماموں۔ اور وہ سب سگے۔ اور اسلام میں واضح طور پر منہ بولے رشتوں کو بالکل ...نہیں دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹی کہہ دے' بنا لے یا سمجھنے لگے تو اس سے کوئی نہیں پڑتا۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے لئے محرم بھی نہیں بن جائیں گے۔ بلکہ انسے ...م میں اچھا بھی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اور اسلام دین فطرت ہے۔ انسان کو اسلام سے زیادہ ...نے بھی نہیں سمجھا۔ خود انسان نے بھی نہیں۔ چنانچہ جب یہ تاکید کی گئی کہ بیٹی اور باپ ...الکل تنہا نہ رہیں۔ کیونکہ ان کے درمیان تیسرا' شیطان ہوتا ہے' تو سب کچھ واضح کر ...ا۔ ایسے میں استاد بے چارے کی کیا بساط ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی کشش بہت بڑی ...ت ہے۔ ایسے میں استاد شاگرد کی یا شاگرد استاد کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو یہ غیر ...ا نہیں۔ اور وہ محبت اگر سفلہ نہ ہو' نفسانی خواہشات کے ہاتھوں بے لگام نہ ہو تو ...ب بھی نہیں۔ اور شادی کو تو معیوب کہا ہی نہیں جا سکتا۔ نکاح تو برائی کو' برائی کے ...ہ کو مسدود کرتا ہے۔ اسے تو بس مستحسن ہی کہا جا سکتا ہے۔ کجا یہ کہ کوئی اس پر شرم ...ہ۔ تو یہ تو گمراہی ہے۔

...تمہارے پروفیسر صاحب نے بلاوجہ ہی اسے مسئلہ بنا لیا۔ اور یہ سوتیلے پن کا بھی کوئی بڑا ...ئلہ۔ اسلام نے کسی کو شوہر یا بیوی کی موت یا طلاق کے بعد دوسری شادی سے منع ...کیا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری شادی نہ کرنے کے مقابلے میں دوسری ...نا میں زیادہ بہتری ہے۔"

"آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں باجی۔" مدیحہ نے کہا۔ "کاش' میں یہ سب کچھ ان ...کہہ پائی ہوتی۔"

"تو اب کہہ دو۔"

"اب نہیں کہہ سکتی۔ میں وعدہ کر چکی ہوں کہ ان سے کبھی رابطہ نہیں رکھوں گی۔"

"احمقانہ وعدہ ہے یہ۔" سمیعہ باجی نے تیز لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی ہو' میں اسے پورا کروں گی۔" مدیحہ بولی۔ "اور انہوں نے بھی وعدہ کیا تھا مجھ سے۔" اس نے انہیں حمید احمد کے وعدے کے متعلق بتایا۔ "مجھے ان کے اعتراف کا انتظار رہے گا۔"

"ایسی انا والے کبھی وعدہ پورا نہیں کر سکتے۔"

"نہیں باجی۔ جس دن انہیں احساس ہو گیا' وہ ہار مان لیں گے۔ میں جانتی ہوں انہیں۔" مدیحہ نے کہا تھا۔

اسلامک اسٹڈیز میں اسے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ اس مضمون کو بڑی محبت اور لگن سے پڑھ رہی تھی۔ وہ ہر چیز' ہر بات' ہر عمل کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھتی تھی۔ اور جب وہ شرعی حکم سے ملکی قانون کو متصادم دیکھتی تھی تو اسے بہت افسوس ہوتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے اور شریعت نافذ ہو جائے تو لوگوں کو ہزاروں غیر ضروری' تکلیف دہ اور اذیت ناک مسائل سے نجات مل جائے۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ اسلام کے نام پر ووٹ لینے والے اقتدار میں آنے کے بعد خود شریعت سے نظریں چرانے لگتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ غیر شرعی قوانین کا دفاع بھی کرنے لگتے ہیں۔ تین سال بعد اس نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کا امتحان فرسٹ کلاس پوزیشن لے کر پاس کیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک لیکچرار شپ کا اور دوسرے وکالت کا.... وفاقی شرعی عدالت کے لئے۔ اس سلسلے میں اس کی سمیعہ باجی سے بات بھی ہوئی۔ "میں لیکچرار شپ کو ترجیح دوں گی۔" اس نے کہا۔

"لیکن شرعی عدالت میں اسکوپ زیادہ ہے۔ تم جج بھی بن سکتی ہو۔"

"یہ اس سے بڑا کام ہے کہ میں دوسروں کو پڑھاؤں۔ تلقین کروں کہ وہ اپنے طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ معاشرے میں سدھار پیدا ہو۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔"

"لیکن باجی' اس سے پہلے میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

اور اس نے ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسس پر کام شروع کر دیا۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ زندگی میں سب سے بڑا طوفان آ گیا۔ سپر ہائی وے پر ایک خوف ناک حادثے میں ممی اور پاپا دونوں جاں بحق ہو گئے۔ اور ابھی ان کی قبروں کی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی کہ بہن بھائیوں کے درمیان دولت کی تقسیم پر جھگڑے شروع ہو گئے۔

مدیحہ کے لئے بڑا خوف ناک اور روح فرسا تجربہ تھا۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے ہی سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ ان کے لئے دولت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن در حقیقت وہ نفاق کے سوا کچھ نہیں چھوڑ کر جاتے۔ ان کی اولاد کے درمیان بس نااتفاقی' نفرت' عدم یقین اور اندیشے رہ جاتے ہیں۔

گھر کا پہلے سے جو رنگ تھا' اس میں وہ بس گزارہ ہی کر رہی تھی۔ لیکن ممی اور پاپا کے بعد اس کا وہاں رہنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اس کے اکاؤنٹ میں معمولی رقم موجود تھی۔ اس نے اپنی گاڑی لی اور نسیمہ کے ساتھ یونیورسٹی روڈ کے اس فلیٹ پر چلی آئی' جو اس کے نام تھا۔ وہ اپنے تھیسس میں لگ گئی۔ بعد میں وراثت کے کیس کا عدالت میں فیصلہ ہوا۔ جو ملنا تھا' اسے بھی مل گیا۔ لیکن وہ گھر کے نفرت بھرے ماحول سے بچی رہی۔

کاروبار' جائیداد اور نقد رقم کی تقسیم کے بعد سب اپنی اپنی زندگی اپنے انداز میں گزارنے کے لئے آزاد ہو گئے۔ آپس میں ملنا جلنا بھی کم ہی رہ گیا۔ دولت کی خواہش نے رشتوں کو توڑ دیا تھا۔ مدیحہ بہت تنہا تھی۔ لیکن وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا تھیسس مکمل ہونے والا تھا۔ زندگی میں بس ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اسے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے اختیار میں کچھ تھا ہی نہیں۔ تو فکر کیوں کرتی۔

اور آج..... آج تو اسے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہے۔ اس نے وہ نماز ادا کی' جس کی اسے برسوں سے آرزو تھی۔ اور اس نے وہ دعا کی تھی' جس نے اس کے دل کو سکون بخشا تھا۔ لگتا تھا' زندگی مکمل ہو گئی ہے۔

آہٹ سن کر وہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر نسیمہ کو دیکھا۔ وہ اسے ناشتے کے لئے بلانے آئی تھی۔

☆

اب کیا کیا جائے؟ یہ بہت مشکل سوال تھا۔ ساری زندگی انہوں نے بس ایک ہی کام کیا

تھا۔ اور اب وہ اس کے اہل نہیں رہے تھے۔ مگر کچھ تو کرنا ہے۔ متبادل تو ضروری ہے۔ روزگار کا معاملہ ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کچھ کرنا ہی نہیں آتا تھا....

"ارے.... تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک۔" بلقیس بیگم نے حیرت سے کہا۔

"اب چھٹی ہی چھٹی ہے اماں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

بلقیس بیگم سناٹے میں آگئیں۔ "کیا مطلب؟"

حمید احمد نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور التجائیہ لہجے میں بولے۔ "دیکھیں اماں اس بار میں آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔ لیکن مجھے تین مہینے کی مہلت چاہئے۔ یہ میرے لئے ضروری ہے۔ آپ اس دوران مجھ سے کچھ نہیں پوچھئے گا۔ پھر میں خود آپ سے بات کروں گا۔"

"ناشتہ لاؤں تمہارے لئے؟"

"صرف میرے لئے نہیں، اپنے لئے بھی۔" حمید احمد مسکرائے۔ "اب ہم ناشتہ ساتھ کیا کریں گے.... ہر روز۔"

بلقیس بیگم بھی مسکرا دیں۔

ناشتے کے دوران بھی حمید احمد اسی سوالی پر سوچتے رہے۔ جو کچھ وہ کرتے رہے تھے، وہ انہیں بہت محبوب تھا۔ اس کے چھوٹنے کا صدمہ ایسا تھا کہ کئی دن تک وہ اس سے شل رہتے۔ لیکن انہیں تو ایسے میں بھی سوچنا تھا۔ اور یہ ایسا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ان کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ انہیں ایسا کچھ کرنا تھا کہ جس کے کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہو۔ جیسی کالج میں پڑھا کر ہوتی تھی۔ اتنی خوشی تو کسی کام میں نہیں مل سکتی۔ تو اس سے کم سہی، لیکن خوشی ہو ضرور۔

بہت سوچنے پر بھی انہیں کچھ سجھائی نہیں دیا۔ انہوں نے سوچا، جلدی کیا ہے۔ پہلے یہ صدمہ جھیل لیں۔ پھر کچھ نہ کچھ سوجھ ہی جائے گا۔ اب ایک دن میں تو سب کچھ ہونے سے رہا۔ برسوں کا ساتھ چھوٹا ہے۔

وہ پوسٹ آفس گئے اور دونوں خط رجسٹری کر آئے.... اپنا استعفیٰ بھی اور مدیحہ کا خط بھی۔ پھر وہ اماں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ سارے موضوع ختم ہو گئے تو انہیں چپ لگ گئی۔ دل گھبرانے لگا۔ وہ اس طرح گھر کبھی بیٹھے ہی نہیں تھے۔ انہیں کالج یاد آنے

لگا.... اپنی کلاسیں یاد آنے لگیں۔

وحید کے سکول سے آنے کا وقت قریب آیا تو ان کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ وحید انہیں گھر دیکھے گا تو کتنا خوش ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اندیشے ستانے لگے۔ اگر وحید کو پتا چلا کہ اب وہ گھر میں رہا کریں گے تو اس کا دل سکول سے اچاٹ ہو جائے گا۔ اور وہ ان کے گھر رہنے کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر وہ کچھ کریں گے اور ظاہر ہے کہ زیادہ دیر گھر سے دور رہیں گے تو وہ سمجھوتا نہیں کر پائے گا۔

وہ گھبرا کر گھر سے نکل آئے۔ لیکن جاتے کہاں۔ ایسی وقت گزاری کی تو انہیں کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وقت کیسے گزارا جاتا ہے۔ وہ سڑکوں پر پھرتے رہے۔ تھک گئے تو ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک فیملی روم کا رخ کیا تھا۔

تھکی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا کر انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو پہلی بار انہیں مدیحہ کا خیال آیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ انہوں نے اب تک اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں، جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مدیحہ کا خیال آنے پر انہیں طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کا سبب ایک بڑی تبدیلی تھی۔ پہلی بار وہ مرد بن کر سوچ رہے تھے۔ اور انہیں آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ پروفیسر نہیں تھے۔ لہٰذا کسی ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ وہ کھل کر سانس لے سکتے تھے۔ وہ مدیحہ کے بارے میں آزادی سے سوچ سکتے تھے۔

ان کا دل عجیب سے انداز سے دھڑکنے لگا۔ رات وہ خواب دیکھ کر جاگے تھے اور انہوں نے اضطراری طور پر مدیحہ کی محبت کا اعتراف کر لیا تھا۔ اب وہ سمجھے کہ اتنے عرصے سے وہ خوفزدہ تھے کہ ان سے انجانے میں بد دیانتی سرزد ہو رہی ہے۔ شاید انہیں احساس تھا کہ انہیں مدیحہ سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا شعور مزاحمت کر رہا ہے۔ انہیں اس کا ادراک نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ شعور کی مزاحمت فطری ہے۔ وہ ہتھیار ڈالتے تو انہیں اپنی عمر بھر کی کمائی، اپنے پروفیشن سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ لیکن ممکنہ بد دیانتی کا احساس شاید انہیں اندر ہی اندر ڈستا رہا تھا۔ تبھی تو پہلا موقع آتے ہی انہوں نے اس محبت کا اعتراف کر لیا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ انہوں نے خود سے اعتراف کیا۔ استعفیٰ لکھا اور مدیحہ کو اعتراف محبت کا خط لکھا۔ یہ سب کچھ کیا۔ مگر انہوں نے اس محبت کے بارے میں نہیں سوچا' جس کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ مگر اس فیملی روم میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اب انہوں نے اس محبت کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے مدیحہ کو ایک عام لڑکی کی حیثیت سے ایک عام مرد کی نظر سے دیکھا۔ ان کا وجود خوشی سے بھر گیا۔ سودا مہنگا نہیں۔ بلکہ سستا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ مدیحہ ایسی لڑکی ہے' جس کے لئے دنیا بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کا ذہن' اس کی روح' اس کا دل اس کے ظاہری حسن سے بڑھ کر حسین ہے۔ اگر وہ اپنی اس محبت کے ساتھ انہیں مل جائے تو زندگی خوب صورت ہو جائے گی۔

اچانک ان کے دل میں ایک خدشہ جاگا۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی ہے.... بہت بڑے گھرانے کی۔ اور وہ خود اب کچھ بھی نہیں رہے وہ اب ایک ایسے آدمی ہیں' جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ جس کا حال تک درست نہیں۔ تو ایسے میں مدیحہ انہیں کیسے مل سکتی ہے۔ پھر انہوں نے سوچا' یہ سب کچھ مدیحہ جانتی ہے۔ لیکن وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کی طرف بڑھی تھی تو اس کے پیچھے کوئی یقین تو ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مدیحہ نے انہیں اپنی محبت کی جو کیفیات بتائی تھیں' جن پر انہیں رشک آیا تھا' اب وہ خود پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے۔ چائے کی پیالی ختم کرتے کرتے انہیں جیسے نشہ ہو گیا۔ سرشاری کی عجیب کیفیت تھی۔ وجود کے اندر گہرائی میں سکون ہی سکون تھا۔ لیکن ایک بے تابی تھی' جس نے اوپر کے پانیوں میں تلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ بے تابی.... اس بات کی بے تابی کہ وہ مدیحہ کو دیکھیں' اس سے باتیں کریں۔ انہیں ایسی بے تابی کبھی کسی چیز کے لئے ہم نہیں ہوئی تھی۔

وہ سوچتے اور حساب لگاتے رہے۔ انہوں نے مدیحہ کو جو رجسٹرڈ خط بھیجا ہے' وہ کل نہیں تو شاید پرسوں اسے ملے گا۔ مدیحہ کا رد عمل کیا ہوگا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ خط پڑھتے ہی دوڑی چلی آئے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خط میں اسے پابندی سے آزاد کر دیا تھا کہ وہ ان کے گھر نہیں آ سکتی۔ وہ آئے گی۔ اور وہ کتنی خوش ہو گی۔ کتنی شکایتیں' کتنی باتیں کرے گی وہ اس سے۔ اور اب اس کے انداز میں کیسا کھلا والہانہ پن ہو گا۔ انہیں اس کا کلاس روم میں بکھر کر

والہانہ نظروں سے دیکھنا یاد آیا۔ اور انہیں بہت اچھا لگا۔ صرف اس لئے کہ وہ فیری کی قید سے آزاد ہو گئے تھے۔

اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے رہے۔ انہیں خیال آیا کہ اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اماں کا بہو والا ارمان بھی پورا ہو جائے گا۔ وہ یہی تو چاہتی تھیں۔ اور مدیحہ تو انہیں پسند بھی ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔

پھر اچانک انہیں وحید کا خیال آیا۔ وہ پریشان ہو گئے۔ اس سب سے اہم مسئلے پر انہوں نے سوچا ہی نہیں۔ وحید اتنی بڑی تبدیلی کو قبول کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔ وحید کی خاطر ہی تو انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ تو اب کیسے کر سکتے ہیں۔

انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے وحید کو ٹٹولیں گے۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔

اس شام ہوم ورک مکمل کرانے کے بعد انہوں نے بات چھیڑی۔ "یار بیٹے' تمہیں امی کی کمی محسوس ہوتی ہو گی؟" انہوں نے وحید سے پوچھا۔

وحید نے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ "بہت زیادہ ابو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"حالانکہ نہیں ہونی چاہئے۔ اماں تم سے اتنی محبت کرتی ہیں۔"

"وہ تو دادی ہیں۔ امی تو امی ہوتی ہے۔" وحید نے سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے ہمت کر کے کہا۔ "میں سوچتا ہوں کہ تمہارے لئے ایک امی لے ہی آؤں۔"

وحید تو اچھل ہی پڑا۔ "سچ ابو۔ مزہ آ جائے گا۔"

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟ میں تو شروع سے یہی چاہتا ہوں۔"

"آپ نے کبھی بتایا نہیں۔"

"میرا خیال تھا' آپ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا.... یہ بتاؤ کہ تم کیسی امی چاہتے ہو۔"

"مس جیسی۔" وحید نے بے ساختہ کہا۔ پھر حمید احمد کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وضاحت

کی۔ ”جیسی میری امی تھیں۔ ان سے ملتی جلتی صورت ہو۔ اور اتنی ہی بڑی ہوں، جتنی ہ
امی تھیں۔ کیسا مزہ آئے گا۔ اب وہ مجھ سے تھوڑی ہی بڑی ہوں گی نا؟ پھر بھی میں بچوا
طرح ان کی گود میں لیٹ جاؤں گا۔ وہ مجھے بچوں کی طرح پیار کریں گی۔ کریں گی نا؟“

”ہاں ‘ کیوں نہیں؟“ حمید احمد کا دل بھر آیا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وحید
اندر محرومی کا یہ احساس اتنا شدید ہو گا۔ وہ اسے سوتیلی ماں سے بچانے کی کوشش کرتے
تھے۔ اور وہ ماں کی آرزو کر تا رہا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ ایک بار کھو جائے تو ماں کبھی نہیں ا
چودہ سالہ بیٹا انہیں اس وقت چار سال کا لگ رہا تھا۔

”آپ کب لائیں گے امی کو؟“

”دیکھو بیٹے ‘ دعا کرو۔“

اب اہم سوال یہ تھا کہ کیا مدیحہ، وحید کو خوش کر سکے گی؟ اور یہ پریشان کن سوال
خوش آئند بات یہ تھی کہ مدیحہ میں سلمہ کی شباہت تھی۔ وحید کے ذہن میں عمر کا جو تصو
‘مدیحہ اس پر بھی پوری اترتی تھی۔ وہ وحید کی ماں تو نہیں ‘ بڑی بہن جیسی بن سکتی تھی۔
انہیں یقین تھا کہ وہ اسے پیار بھی بہت دے گی۔

اس رات حمید احمد ٹھیک سے سوئے نہیں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خو
دیکھ رہے تھے۔ وہ خوش تھے۔ قدرت نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری کر دی تھیں۔
پر جو انہوں نے رشک کیا تھا ‘ وہ رنگ لے آیا تھا۔ انہیں مدیحہ کی محبت تو پہلے ہی سے ملی
تھی۔ اب انہیں مدیحہ جیسی محبت بھی مل گئی تھی.... مدیحہ کے لئے۔

اگلے روز بھی وہ وحید کے سکول سے واپس آنے سے ذرا پہلے تک گھر میں بیٹھے رہے۔
ایک فرق تھا۔ گزشتہ روز وہ پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔ لیکن اس روز انہیں اس بات
فکر بھی نہیں تھی۔ یہ محبت کا کمال ہے۔ ہر فکر ماسوا کو مٹا دیتی ہے۔

اس روز بھی وہ اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور مدیحہ کے تصور سے کھیلتے رہے۔ وہ خو
تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ پہلی بار ان کی زندگی میں بہار آ رہی ہے۔ اس روز ریسٹورنٹ
بیٹھے بیٹھے انہیں ایک خیال آیا۔ انہوں نے سوچا ‘ محکمہ ڈاک والے کبھی کبھی غیر معمو
مستعدی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے ‘ خط آج ہی پہنچ جائے۔ بلکہ ممکن ہے ‘ پہنچ
گیا ہو۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مدیحہ اس وقت ان کے گھر میں بیٹھی ہو۔

اس خیال نے انہیں بے تاب کر دیا۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ گھر پہنچ کر انہیں
پتا ہوئی کہ مدیحہ نہیں آئی ہے۔ لیکن آس نہیں ٹوٹی۔ کچھ یہ خیال بھی تھا کہ اتنی جلدی
ملنے کا در حقیقت کوئی امکان نہیں ہے۔

اگلے روز بھی یہی کچھ ہوا۔ مگر وہ شام ان کے لئے بہت سخت تھی۔ وہ سراپا سماعت
.... گاڑی رکنے کی آواز ‘ کسی دستک کے منتظر۔ دروازے پر دستک ہوتی تو وہ لپکتے۔ لیکن
دروازہ کھول کر مایوس ہوتے۔ کبھی کوئی پڑوسن نظر آتی اور کبھی وحید کے کسی دوست کا چہرہ۔
مدیحہ بہر حال نہیں آئی تھی۔

اگلے روز بارہ بجے کے قریب وہ گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
اس بار انہوں نے بڑے یقین سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھولنے پر انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔
البتہ دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ دروازے پر پوسٹ مین کھڑا تھا۔ مدیحہ نہیں آئی....
کیوں؟ اس نے خط بھیجا ہے! زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

پوسٹ مین نے ان کی طرف خط بڑھایا اور ایک پرچا.... ”اس پر سائن کر دیں۔“
تو رجسٹری ہے۔ مگر اتنی جلدی! انہوں نے دستخط کئے اور خط لیا۔ اپنی تحریر.... وہ
بوکھلے رہ گئے۔ ”یہ کیا.... ؟ خط واپس آ گیا میرا؟“

”جی سر۔ وجہ لفافے پر لکھی ہے۔“ پوسٹ مین نے کہا اور چلا گیا۔

انہوں نے دروازے پر کھڑے لفافے پر ٹیڑھی میڑھی تحریر پڑھی۔ ”مکتوب الیہ اب اس
پتے پر نہیں رہتا۔ نیا پتہ معلوم نہیں۔“ کچھ دیر تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر آیا تو
انہیں لگا کہ آسمان ان کے سر پر آ گرا ہے۔

اس کیفیت میں گھر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”اماں ‘
میں جا رہا ہوں خدا حافظ۔“ پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

☆

تین دن گزر گئے۔ کیسے گزرے ‘ یہ حمید احمد کو پتہ ہی نہیں چلا۔ انہیں کچھ خیال ہی نہیں
تھا۔ وہ ہوش مندانہ انداز میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک وحشت تھی ‘ بے تابی تھی ‘
اضطراب تھا۔ وہ کسی طرح اڑ کر مدیحہ تک پہنچ جائیں.... پوسٹ مین بن کر.... اور وہ خط
لے آئیں۔ اس کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

چوتھے دن انہوں نے جھرجھری لی' جیسے کسی طویل نیند سے جاگے ہوں۔ یہ وہ کیفیت تو نہیں جو میں نے مانگی تھی۔ وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑائے۔ یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ انہوں نے سوچا کہ خود مدیحہ کے گھر جائیں' مکینوں سے پوچھیں کہ یہ لوگ کہاں ملیں گے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ آدمی لاپتہ ہو جائے۔ ڈھونڈا تو جا سکتا ہے۔ لیکن نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ ان کی حالت' ان کی کیفیت تو دیوانوں کی سی ہے۔

اچانک مدیحہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی۔ "اقبال کا ایک شعر آپ کی نذر کرتی ہوں حمید صاحب! یہ میرے دل سے دعا بن کر نکلا ہے۔ خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں۔"

تو وہ دعا قبول ہو گئی۔ انہوں نے خود سے کہا۔ مدیحہ نے کیسے دیکھ لیا تھا.....! یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں سینے میں سمندر لئے بیٹھا ہوں۔ بس اس میں تلاطم نہیں تھا۔ موجیں تھیں لیکن اضطراب سے محروم تھیں۔ اور اب طوفان آ گیا تو موجیں اچھلنے' آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے کی عادی ہو گئیں۔

انہوں نے وقت کی رہ گزر کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیا تھے..... اور کیا ہو گئے۔ معلم..... عاشق۔ اب آئینہ دیکھیں تو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بڑھی ہوئی شیو' نیند سے محروم جلتی' متورم آنکھیں' مسکا ہوا لباس۔ وہ تو تیاگی ہو گئے۔ ہاں سچ مچ۔ سب کچھ تو تیاگ دیا انہوں نے۔ ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور وہ بے کار بھی ہیں' بے روزگار بھی! اور یہ سب کچھ جس کے لئے کیا' وہ انہیں نہیں ملا۔ شاید کفرانِ نعمت کی سزا ہے۔

استعفیٰ واپس بھی تو لیا جا سکتا ہے۔ دنیا اندھیری دیکھ کر گھبرائے ہوئے ذہن نے سوال اٹھایا۔

چپ کم ظرف! انہوں نے اسے ڈپٹ دیا۔ یہ تجارت تھوڑا ہی ہے۔ محبت ہے۔ اہلیت کو بیٹھے تو منصب چھوڑ دیا۔ یہ تو دیکھ کہ پہلے سے بڑا منصب مل گیا ہے۔

ہاں..... بہت بڑا منصب ہے۔ ذہن نے جل کر کہا۔ دوسروں کو علم بانٹتے تھے۔ اب نکمے ہو۔ لفنگوں کی طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہو۔ یہ تو سوچو کہ اب کرنا کیا ہے۔ خود فاقے کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ کیا اماں اور بیٹے کو بھی بھوکا مارو گے۔ اور بیٹے کی تعلیم؟

جوان ہوتے بیٹے کا باپ..... اور وہ بھی عاشق نامراد!

میں تو بامراد ہوں۔ انہوں نے جواب دیا۔ لیکن تیری یہ بات برحق کہ کچھ ہر لوکیوں
ہوگا۔ مگر کیا کروں؟
ل بھی کہتا تھا کہ کچھ ایسا کر' جس میں خوشی ملے۔ مگر ایسا کیا ہے۔ خوشی تو محبت سے ہے۔
بت..... میں نے کب کسی چیز سے محبت کی کہ مجھے خوشی ملے۔ کیا کروں؟

سڑکوں پر چلتے رہتے۔ تھکتے تو ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتے۔ اب تو گھر واپس جانے کا خیال نہیں آتا تھا۔ دیر سے گھر جانے لگے تھے۔ اماں نجانے کیسے ضبط کئے بیٹھی تھیں۔ اب بھی نہیں پوچھا انہوں نے۔

یک دن وہ چلتے چلتے ٹھٹکے۔ وہ ایک سٹال تھا۔ سٹال والے نے فٹ پاتھ پر ترپال بچھا کر ترتیب سے لگائی ہوئی تھیں۔ ان کی نظر بچوں کی کہانی کی ایک کتاب پر جم گئی۔ کتاب کا بہت خوب صورت تھا۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ وہ چار رنگوں بہت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی گئی کتاب تھی۔ ان کا دل کتاب کی محبت سے سرشار ا۔ وہ آٹھ نو سال کے لڑکے بن گئے۔ انہیں یاد تھا کہ وہ کہانیوں کی کتابوں کے لئے تے۔ اس زمانے میں کتابیں اتنی اچھی نہیں چھپتی تھیں۔ اور سستی بھی ہوتی تھیں۔ کی ان کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ کتاب خرید سکتے۔

اس لمحے بجلی کی طرح ایک خیال ان کے دماغ میں کوندا۔ انہیں اس پر سوچنا تھا۔ وہ رنٹ میں جا بیٹھے اور چائے منگوا لی۔

ریسٹورنٹ سے نکلے تو فیصلہ کر چکے تھے!

☆

"اتنی بہت سی کتابیں؟" اماں نے کہا۔ کتابیں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔

"اتنی خوب صورت کتابیں!" وحید کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں خواب ہی خواب تھے۔

"ہاں بیٹے۔ ان میں جتنی تم چاہو، لے سکتے ہو۔" حمید احمد بولے۔

"سچ ابو؟" وحید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

حمید احمد کا دل دکھنے لگا۔ انہوں نے وحید کو کبھی کہانیاں نہیں پڑھنے دی تھیں۔ انہوں نے یہ خیال بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کتابوں سے محروم رہے ہیں۔ اس کی تلافی وہ وحید کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ محرومی کا دکھ سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے اسے محروم کر دیا تھا۔ "ہاں بیٹے، جتنی چاہو، لے لو۔" انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر ابو، آپ اتنی کتابوں کا کیا کریں گے؟"

"بچوں تک پہنچائیں گے۔"

اس شام ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد وحید بیٹھا کہانیوں کی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اس کی خوشی دیکھ کر حمید احمد کے دل میں بھی خوشی بوند بوند گر رہی تھی۔ انہوں نے درست فیصلہ کیا تھا۔ خوشی، خوشی بانٹنے سے ملتی ہے، یہ راز انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔

اور وحید کو جیسے ہوکا ہو گیا تھا۔ اس کے سونے کا وقت گزر چکا تھا اور وہ اب بھی ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ "بیٹے.... تم یہ روز پڑھ سکتے ہو۔ سب آج ہی پڑھ ڈالو گے؟" انہوں نے اسے ٹوکا۔

"میں روز پڑھ سکتا ہوں ابو؟ پرامس؟"

حمید احمد نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "پکا پرامس۔ اب سو جاؤ۔"

اگلے روز حمید احمد نے اپنی تیاری شروع کی۔ وہ کپڑے کا ایک پورا تھان لائے تھے۔ اسے پھر انہوں نے اس پر کتابوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ کتابیں رکھنے کے بعد انہوں نے بڑی نزاکت سے اسے تہ کیا اور گٹھری کی طرح باندھا۔ اس طرح کہ کتابیں مڑیں بھی نہیں۔ وہ یہ کام اس مہارت سے کر رہے تھے، جیسے برسوں سے کرتے آ رہے ہوں۔

اماں انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ "تمہارا کیا ارادہ ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا۔ "یہ کندھے پر رکھ کر گلی گلی کتابیں بیچتے پھرو گے؟"

"جی ہاں اماں۔ اس میں کوئی برائی ہے؟"

"برائی تو نہیں۔ لیکن یہ کام تمہارے شایان شان بھی نہیں۔"

"ارے اماں.... شان تو بس اوپر والے کی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔ "اور اسی میں میرے لئے بہت بڑی خوشی ہے۔"

"یہ کام تم اور طرح سے بھی کر سکتے ہو بیٹے۔" اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔

اب حمید احمد اماں کو کیسے سمجھاتے کہ یہ ان کے لئے کتنا اہم ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس دور میں کوئی یوں کتابیں بیچنے کے لئے نہیں نکلتا۔ لیکن ان کے بچپن میں تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ اب بھی جایا کریں گے۔ کچھ تو محرومی کا ازالہ ہو گا۔ "اماں.... میں نے آپ سے ایک مہلت مانگی تھی نا۔ وہ مجھے دے دیں۔" انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "پھر میں اور آپ بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ مگر ابھی مجھے میری مرضی کرنے دیں۔ پہلی بار تو میں سچی خوشی کمانے نکل رہا ہوں اماں۔ مجھے دعا دیں۔"

مگر حمید احمد بازو پر گٹھری چڑھا کر گھر سے نکلے تو اماں رونے لگیں۔ کالج میں پڑھانے والا ایک آدمی، جس نے کبھی بوجھ نہیں اٹھایا، آج اس طرح گھر سے نکل رہا ہے!

☆

حمید احمد کو پہلی بار پتہ چلا کہ ان کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ بچپن میں انہوں نے اس طرح کتابیں بیچنے والے کو دیکھا تھا۔ اور اس کا ہر انداز انہیں یاد تھا۔ وہ اسی کی طرح گٹھری بناتے، اسی کی طرح کندھے پر رکھ کر چلتے، بوقت ضرورت اس کے انداز میں گٹھری اتار کر کھولتے، کتابیں نکالتے اور دوبارہ اسی طرح بند کرتے۔ فرق اتنا تھا کہ وہ بوجھ اٹھانے کے عادی نہیں تھے۔ جلدی تھک جاتے تھے۔ ان کے کندھے دکھ جاتے تھے۔ وہ کبھی گٹھری کو دائیں کندھے

پر لیتے، کبھی بائیں پر۔ اور پہلے ہی دن انہیں اپنے بچپن کے کتب فروش کی قوت برداشت پر رشک آنے لگا۔ بڑا تحمل تھا اس میں۔ کوئی ان سے گٹھری اترواتا، کتابوں کا جائزہ لیتا اور کتاب نہ لیتا تو ان کی دوبارہ گٹھری باندھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ گٹھری یا اس کے سر پر دے ماریں یا اس سے اپنا سر پھوڑ لیں۔ مگر کتاب بکنے پر جو خوشی ہوتی تھی، اس کا کوئی بدل ہی نہیں تھا۔ اور جو پہلی کتاب انہوں نے بیچی تھی، اسے تو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے تھے۔

پہلے دن تو وہ دس قدم چل کر لڑکھڑا گئے تھے۔ تب انہوں نے پہلی بار خود کلامی کی تھی۔ بعد میں تو وہ اس کے عادی ہو گئے۔ اور پہلی بات جو انہوں نے خود سے کہی، وہ یہ تھی.... اب لدی ہیں نا گدھے پر کتابیں۔ چلتے رہو۔ اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ عشق کے راستے پر ان کا پہلا قدم ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ عشق اور انا میں بڑا بیر ہے۔ دونوں ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ یہ سفر ان کے لئے اپنی انا کو کچلنے کا ہے۔

وہ چلتے رہے۔ ہر تھوڑی دور کے بعد وہ تھک کر بیٹھ جاتے اور ہانپنے لگتے۔ سانس یوں لگتا تھا کہ قابو میں ہی نہیں آئے گی۔ اور ہر بار دوبارہ گٹھری اٹھانے کے لئے انہیں پہلے سے زیادہ ہمت کرنی پڑتی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا گٹھری اٹھانے کو۔ انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ اتنا مشکل کام ہے تو وہ اسے شروع ہی نہ کرتے.... لیکن اب شروع کر دیا تھا تو واپسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ دوپہر تک ان کی بوہنی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی کتاب نہیں بکی۔ کوئی گاہک ہی نہیں ملا۔ کسی نے انہیں روکا بھی نہیں۔ گٹھری کھلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوپہر کے وقت ایک عورت نے انہیں روکا تو وہ خوش ہو گئے۔ بالآخر.... بالآخر....!

"اے چاچا.... کپڑا بیچ رہے ہو کیا؟" عورت نے پوچھا۔ "چادریں بھی ہیں؟"

"نہیں آپا۔ کتابیں ہیں۔" حمید احمد نے بڑے تحمل سے کہا۔ ورنہ ان کا دل جل گیا تھا۔

"اے میں تمہیں آپا لگتی ہوں؟" عورت نے تپ کر کہا۔ "اور سنو، ماتھے پر بورڈ ہی لگوا لو کہ تم کتابیں بیچ رہے ہو۔ ایسے کتابیں بیچتے تو کسی کو نہیں دیکھا۔"

حمید احمد کی بوہنی تو نہیں ہوئی۔ لیکن اس پھیری والی تجارت کے کئی رموز ان پر کھل گئے۔ پہلا یہ کہ گاہک کو مخاطب کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپا تو وہ عورت ہو ہی نہیں سکتی

اس نے اس طرح کسی کو کتابیں بیچتے نہیں دیکھا تھا۔ تو وہ بعد کے دور کی ہی پیداوار ہوئی۔ دوسری بات سائن بورڈ کی تھی۔ وہ چلتی پھرتی دکان تھے۔ اپنی پیشانی پر بورڈ نہیں لگا سکتے مگر آواز تو لگا سکتے تھے۔ گاہک کو پتا تو چلے کہ یہ دکان کس چیز کی ہے۔

تو وہ صدائیں لگائیں؟ انہوں نے حیرت سے سوچا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو بہت دھیمی آواز میں بولنے والے ہیں۔ یہ ان سے نہیں ہو سکے گا۔

کیوں نہیں ہو سکے گا؟ دل نے انہیں بری طرح جھڑکا۔ خوشی کمانے نکلے ہو۔ خوشی یونہی نہیں ملے گی۔ چلو صدا لگاؤ۔

انہوں نے ذہن میں ایک صدا کو ترتیب دیا اور اس کی خوب ریہرسل کی۔ اس کے باوجود پہلی بار صدا لگاتے ہوئے ان کے انداز میں اعتماد نہیں تھا۔ اور جب انہوں نے صدا لگائی تو وہ خود انہوں نے بھی بمشکل ہی سنی۔ وہ شرمندہ ہو گئے۔ مگر وہ کوشش کرتے گئے اور گلا کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ اپنی ایک صدا پر وہ جھوم اٹھے۔ یہ ہوئی نا بات۔

"کتابیں لے لو.... بچوں کی ننھی منی رنگین کتابیں۔ کتابیں لے لو۔"

کتاب تو نہیں بکی۔ مگر انہیں بھوک ایسی لگی کہ برداشت کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ایسی بھوک تو انہیں کبھی نہیں لگی تھی۔ اتنا بوجھ اٹھا کر کبھی اتنا پیدل بھی تو نہیں چلا تھا۔ انہوں نے جھنجھلا کر سوچا۔

چنانچہ کھانا انہوں نے اپنی جیب سے کھایا اور ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد آدھے گھنٹے تک وہاں سے چلنے کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔

پھر وہ دوبارہ چل پڑے۔ آواز لگاتے ہوئے مگر ابھی تک انہیں عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ آواز لگاتے اور اِدھر اُدھر دیکھتے۔ انہیں لگتا، تمام لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں.... اور اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں.... دیکھو تو، پروفیسر صاحب پھیری والے بن کر کتابیں بیچ رہے ہیں۔ اس احساس کے باوجود وہ آواز لگاتے رہے۔ اب پیچھے تو نہیں ہٹا جا سکتا۔

"انکل.... انکل...." وہ کسی بچے کی آواز تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے وہ بچہ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور پیشانی بے حد روشن تھے۔ اس کے کپڑوں اور قمیض پر جا بجا بہت خوب صورت، رنگین سٹکر لگے ہوئے تھے۔ "انکل.... آپ کے

پاس رنگین کتابیں ہیں؟"

"ہاں بیٹے۔" حمید احمد نے بے حد اعتماد سے کہا۔ "ابھی دکھاتا ہوں۔" پہلے گاہک نے انہیں اعتماد سے بھر دیا تھا۔ انہوں نے گٹھری اتار کر کھولی اور کتابیں دکھانا شروع کیں۔ کتابیں پھیلانے کے بعد انہوں نے بچے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"یہ کتنے کی ہے انکل.... اور یہ....؟"

"یہ ایک روپے کی۔ یہ دو روپے کی اور یہ پانچ...."

بچہ کتابوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ساری کتابیں سمیٹ کر گھر لے جائے۔ حمید احمد نے سوچا، یہ لڑکا کم از کم دس کتابیں لے گا۔

مگر پھر ایک بہت بڑی کیمیاوی تبدیلی رونما ہوئی بچے کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے جانے کے لئے پلٹا....

"کیا ہوا؟ کتاب نہیں لو گے؟" حمید احمد نے اسے پکارا۔

بچے نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ "سوری انکل۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آ گئی۔

حمید احمد کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ "تو کیا ہوا۔ پیسے کل دے دینا۔"

"نہیں انکل۔ مجھے کتاب نہیں لینی۔"

"کیا تمہیں پیسے نہیں ملتے؟"

"بہت ملتے ہیں انکل۔ بہت.... لیکن میں خرچ کر دیتا ہوں۔" بچے کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ "مجھے تو سب سے زیادہ پیسے ملتے ہیں۔"

"تمہارے ابو دیتے ہوں گے؟"

"نہیں۔" بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ اب وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میرے ابو تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ مجھے امی پیسے دیتی ہیں۔"

حمید احمد نے بچے کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہاں بیٹھو بیٹے۔" اب وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔ اب وہ ایبی سینیا لائن کا علاقہ تھا۔ بچے کی جگہ وہ خود تھے۔ اور بچے کی شرٹ اور نیکر پر لگے سٹکرز کی جگہ بھدے، بدنما پیوند نظر آ رہے تھے۔ دنیا نے بہت

کر لیا ہے حمید احمد۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ اب غربت اور یتیمی کے پیوند چھپانے کے سٹکرز فراہم کر دیئے گئے ہیں۔

منو.... تم کوئی سی ایک کتاب پسند کر لو۔"

"لیکن انکل، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"تم ایک کتاب پسند تو کرو۔"

یہ کام بچے کے لئے بہت مشکل تھا۔ حمید احمد اسے محسوس کر سکتے تھے۔ یہ کام تو ان کے لئے بھی مشکل ہی ہوتا۔ بالآخر بچے نے ایک کتاب پسند کر لی۔

"تو میاں حمید احمد، یہ کتاب کل تک کے لئے تمہاری ہوئی۔ کل یہ واپس کر دینا تو میں دوسری دے دوں گا۔" حمید احمد کا دل ایک سچی خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے کتاب کو ...ہوئے سات سالہ حمید احمد کو 35 سال بعد ایک کتاب دے کر اس کی محرومی کا ازالہ کر ...

بچے کی نگاہوں کی شکر گزاری تو ان کی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن حیرت کا سبب وہ نہ سمجھ سکے۔ بچے کے جملے نے انہیں سمجھا دیا۔

انکل.... میرا نام حمید احمد نہیں، عقیل احمد ہے۔"

ایک ہی بات ہے بیٹے۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔" حمید احمد کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔

انکل.... یہ خیرات تو نہیں ہے نا؟" بچے نے پوچھا۔

حمید احمد کا جی چاہا کہ وہ رو دیں۔ "نہیں بیٹے۔ یہ ایک قرض تھا مجھ پر۔ بہت تاخیر سے اتارا ...مانے۔"

بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "شکریہ انکل۔ اب میں جاؤں؟"

جاؤ بیٹے، یاد رکھنا، کل دوسری کتاب۔"

حمید احمد کی بوہنی تھی۔ وہ خوشی کمانے نکلے تھے اور انہوں نے پہلی خوشی کمائی تھی.... ...ھی خوشی۔

پھر انہوں نے پیسے بھی خوب کمائے۔ وہ بچوں میں گھر گئے تھے۔ بچے بھی خوش تھے اور وہ ... لیکن شام کو گھر پہنچنے کے بعد وہ ڈھے گئے۔ انہیں لگتا تھا کہ کندھے بری طرح سوج گئے ... اس رات انہیں ایسی نیند آئی کہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

دوسرا دن بہت سخت تھا۔ گٹھری لے کر نکلنے کا تو تصور ہی نا ممکن تھا' ان کا جسم بستر
اٹھنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ لیکن قدم اٹھانے کے بعد وہ پیچھے ہٹنے کے قائل نہیں تھے
اس روز گٹھری اٹھاتے ہوئے ان کی چیخ نکل گئی۔ اماں رونے لگیں۔ "کیوں اپنے اوپر ظ
کرتے ہو حمید احمد؟"

"یہ ظلم نہیں اماں۔ میں بہت سچی خوشیاں کما رہا ہوں۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ بھی خو
ہو جائیں گی۔"

دوسرے دن انہوں نے ایک بہت اہم رمز سمجھا۔ پہلے روز آواز لگانے کے بعد ان
بکری شروع ہوئی تھی۔ دوسرے روز انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف آواز لگانے کا کما
نہیں تھا۔ اس وقت سکولوں کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ اب آوازیں لگانے پر بھی کوئی نہیں
رہا تھا۔ بڑوں کو بچوں کی کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہاں' وہ بچہ عقیل موجود تھا۔ اس تک پہنچنے سے پہلے حمید احمد کئی بڑے کاروباری فیصلے
چکے تھے۔ ابھی تک وہ صرف پیدل چلے تھے اور اپنے ہی علاقے میں رہے تھے۔ اب انہو
نے سوچا کہ وہ ہر روز ایک نئے علاقے میں جائیں گے۔ بس میں سفر کریں گے تو گٹھ
اٹھانے کی مشقت بھی کم ہو گی۔ اور وہ ہاف ٹائم یا چھٹی کے وقت کسی سکول کے گیٹ پر
گٹھری پھیلا کر بیٹھیں گے۔ بچوں کی کتابیں بچوں ہی کے لئے تو ہیں نا۔ اور انہوں نے ا
فیصلہ عقیل کے لئے بھی کیا تھا!

انہوں نے عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دی۔ "کل سے میں شام کو آیا کر
گا.... مغرب کے وقت۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"تم سکول نہیں جاتے بیٹے؟" انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"نہیں انکل۔ امی کہتی ہیں' اگلے سال داخلہ دلائیں گی۔"

اس روز حمید احمد رکے رہے۔ بچہ اپنے گھر گیا تو انہوں نے اسے دیکھا اور مکان نمبر نو
کر لیا۔ اب وہ ہر مہینے اس بچے کی تعلیم کے لئے کچھ رقم منی آرڈر کریں گے۔ انہوں
خوشی سے سوچا۔

آنے والے دنوں میں سب کچھ بہتر ہوتا گیا۔ جسم' ٹانگیں اور کندھے مشقت کے بدو

ہوتے مضبوط ہو گئے۔ آواز لگانے میں ان کی جھجک ختم ہو گئی۔ ان کا سکولوں والا
بہت کامیاب رہا۔ ہر روز وہ ایک مختلف علاقہ کور کرتے۔ شام کو وہ اپنے علاقے میں
عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دیتے اور گھر لوٹ آتے۔
نہیں یاد بھی نہیں تھا کہ کتنے دن ہو چکے ہیں۔ وہ اس معمول کے عادی ہو چکے تھے اور اس
بہت خوش تھے۔ زندگی انہیں نعمتوں سے معمور لگنے لگی تھی۔ بہت اچھی بھوک لگتی تھی
اچھی نیند آتی تھی۔ اور دونوں میں بے اندازہ لذت ملتی تھی۔
سکولوں سے ہٹ کر غریبوں کی کچی بستیاں ان کا کاروباری میدان تھیں۔ ایک بار تو وہ
سینا لائن بھی چلے گئے۔ مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ وہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔
روز انہوں نے عائشہ باوانی سکول کے سامنے اپنا گٹھری بازار لگایا۔ سکول کی چھٹی کے
ب وہ فارغ ہوئے تو ان کے قدم بے اختیار کالا پل کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ایک بے
ے عالم میں چل رہے تھے۔ پل پار کر کے جب وہ اس مقام پر پہنچے' جہاں برسات کے
ن مدیحہ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی' تو وہ بری طرح ٹھٹکے۔ ان کے قدم
گئے۔ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔ جواب انہیں معلوم تھا۔
کن بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے گٹھری اتار کر رکھی اور ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔
نے کا انداز تو شاید بہانہ تھا۔ اصل میں خود کو ٹٹولنا اور کریدنا مقصود تھا۔
ر تھوڑی سے دیر میں انہوں نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ خود کو اچھی طرح سمجھ لیا.... اپنے
چھپے ہوئے کو جان لیا۔ یہ کتابیں بیچنے کا فیصلہ کرنے کے بعد سے انہیں ایک بار بھی مدیحہ
کی محبت یا خود اپنی محبت یاد نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ محبتیں نہ صرف موجود تھیں۔ بلکہ ان
طن کی نامعلوم گہرائیوں مین روبہ عمل تھیں۔ وہ جو کچھ کرتے رہے تھے، جو کچھ کر
تھے، اس کے ظاہری محرکات اور تھے۔ لیکن حقیقی محرک وہ محبتیں تھیں، جو اُن سے
چھپے یہ سب کچھ کرا رہی تھیں۔ انا بہت توانا ہو تو محبت دب کر رہتی ہے اور محبت دب کر
تو بڑی قوت بن جاتی ہے۔ محبت سچی ہو تو جانتی ہے کہ انا اس کے راستے کی سب سے
رکاوٹ ہے۔ وہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کا سامان کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے
کے راستہ صاف کر دیتی ہے۔
پروفیسر حمید احمد بہت انانیت پسند تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی ایک شاگردہ

سے محبت کو قبول کریں۔ انہیں تو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت کو قبول کر لیں۔ یہ ان کے اور ان کے پیشے کے وقار اور مرتبے کے منافی تھا۔ اس کے لئے وہ آسمان سے اتری ہوئی محبت کو بھی ٹھکرا سکتے تھے۔ اور انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ محبت نے خود کو باطن کی گہرائیوں میں' سات پردوں کے پیچھے چھپا لیا۔ وہ دب گئی اور دب کر کام کرتی رہی۔ پھر ابھرنے کا موقع ملا تو وہ ابھری اور اس نے خود کو منوا لیا۔ مگر اب بھی وہ انا سے برتر نہیں تھی۔

پروفیسر حمید احمد نے استعفیٰ دیا.... صرف انا کی خاطر۔ محبت نے ان کی انا کو ان کے اور ان کی انا کے خلاف ہی استعمال کیا تھا۔ وہ اپنا وعدہ کیسے پورا نہ کرتے۔ پورا نہ کرتے تو انا مجروح ہوتی۔ وہ ضرب کاری اسے ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیتی۔

اور محبت کا تقاضا تھا کہ پروفیسر حمید احمد محبوب کو تلاش نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے گھر جا کر کچھ تو معلوم کریں۔ کچھ تو جانیں۔ لیکن ایک باوقار سفید پوش پروفیسر ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب اس بنگلے میں رہتے ہیں' وہ کیا سوچیں گے۔ اس کے بارے میں کیا کیا گمان کریں گے۔ اور وہ ان سے کیا پوچھیں گے....؟ کیسے پوچھیں گے؟ نہیں' یہ تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن ان کا مرتبہ' ان کی شان تو کم نہیں ہوئی۔ وہ یہ نہیں کر سکتے تھے۔

سو محبت نے راہ نکالی۔ اس نے سچی خوشی کمانے کے نام پر انہیں پھیری والا.... آواز لگا کر چیزیں بیچنے والا بنا دیا۔ ان سے بھاری گٹھری اٹھوا کر انہیں میلوں پیدل چلنے والا بنا دیا۔ مرتبہ' شان' وقار.... کچھ بھی نہیں رہا۔ اب تو وہ یہ کر سکتے ہیں.... اور انہیں کرنا ہے۔

"میں محبت ہوں پروفیسر صاحب....! سچی محبت۔ آئندہ کبھی میری نفی نہ کرنا۔" محبت نے کہا۔ اور حمید احمد نے جان لیا کہ اپنی انا کو وہ شہر کی بستیوں' گلیوں میں' سڑکوں پر بچھا کر اس پر وزن اٹھائے چلتے رہے ہیں۔ انا کو اپنی اوقات معلوم ہو چکی ہے۔

انہوں نے گٹھری اٹھائی اور چل پڑے۔ لیکن انا کچلی جانے کے باوجود بھی زندہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس طرف جائے' جہاں کبھی وہ مدیحہ کو پڑھانے کے لئے جاتے تھے.... بڑی لمبی سی کار میں۔ آج کتابوں کی گٹھری اٹھائے وہ پیدل وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔ مگر محبت اب زیادہ طاقت ور تھی۔ قدم انہیں اسی طرف لے گئے۔ انہیں تو اس وقت پتہ چلا' جب ان کی نظر اس بنگلے پر پڑی۔ "بچوں کے لئے ننھی منی کہانیاں.... رنگین کتابیں لے لو۔ بچو

...کتابیں لے لو۔"
...پہ کیا کرتے ہو؟ انا نے احتجاج کیا۔ ایک تو اس طرح یہاں چلے آئے اور پھر فخر سے آواز
...لگا رہے ہو۔
...کیوں نہ لگاؤں۔ یہ وہ کام ہے' جس نے مجھے سچی خوشی دی ہے۔ انہوں نے پھر آواز لگائی۔
...وں کی رنگین کتابیں...."
...اور اگر صدا سن کر وہ خود باہر نکل آئی تو؟ انا نے انہیں ڈرایا۔
...اول تو وہ یہاں ہے نہیں۔ اور اگر ہو اور نکل بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو رد کئے
...نے کے لئے بھی تیار ہوں۔
...وہ بنگلے کی طرف چلے.... آواز لگاتے ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ بیل دیں گے۔ انا نے پھر
...اج کیا۔ لیکن انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ انہیں انا کو اس طرح روندتے دیکھا تو عزتیں
...نے والے کی رحمت جوش میں آ گئی۔ گیٹ کے اندر موجود چھوٹا سا گیٹ کھلا اور ایک نو دس
...کے بچے نے جھانکا۔ "انکل.... آپ اندر آ جائیے۔ مجھے کتابیں لینی ہیں۔"
...وہ بنگلے میں داخل ہوئے۔ بچہ انہیں لان میں لے گیا۔ وہاں گارڈن چیئر پر ایک خاتون
...ا تھیں۔ "ممی.... کتابوں والے انکل آ گئے۔" بچے نے اس سے کہا۔
..."کتابیں دکھائیے ذرا۔" خاتون نے بے حد شستہ لہجے میں کہا۔
...مید احمد نے گٹھری اتار کر رکھی' کھولی اور کتابیں پھیلا دیں۔ پھر وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے
...۔ سامنے اسٹڈی کی کھڑکی نظر آ رہی تھی' جہاں سے وہ اس لان کو دیکھتے رہے تھے۔ آج
...ہاں ایک مختلف حیثیت میں بیٹھے تھے۔
..."تم کتابیں پسند کر لو بیٹے۔" خاتون نے کہا۔
..."میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"
...خاتون نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "پوچھئے۔ کیا بات ہے؟
..."آپ لوگ یہاں نئے آئے ہیں؟"
..."ایک سال ہو گیا۔" خاتون نے جواب دیا۔ "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"
..."میں یہاں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ پہلے حامد صاحب رہتے تھے۔"
..."ہاں۔ کوئی سوا سال پہلے ان کا اور ان کی مسز کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے

بعد ہم نے یہ بنگلا خرید لیا۔"

"لیکن انہوں نے یہ بیچا کیوں؟"

"جائیداد پر خوب جھگڑے ہوئے، بہن بھائیوں میں۔ پھر انہوں نے اسے بیچ کر کیش میں CONVERT کر لیا۔"

"ایک بیٹی مدیحہ بھی تھی ان کی۔ وہ مجھ سے کتابیں لیتی تھی۔"

"بچوں کی کتابیں؟" خاتون نے انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں۔ وہ مجھے کتابوں کے نام لکھ دیتی تھیں۔ وہ میں لا دیتا تھا۔"

"اوہ۔ وہی ایک معقول لڑکی تھی پورے گھر میں۔ وہ جائیداد کے قضیے میں کبھی نہیں الجھی۔ ایک وہی ہے، جس سے میں کبھی نہیں ملی۔ جھگڑے شروع ہوتے ہی اس نے یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"کہاں گئی تھیں، یہ نہیں معلوم آپ کو؟"

"پتہ تو مجھے ان میں سے کسی ایک کا بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے، مدیحہ کے سوا سب ABROAD چلے گئے۔" خاتون نے کہا۔ پھر بچے کی طرف مڑیں۔ "کتابیں پسند کر لیں تم نے؟"

بچے نے کتابیں دکھائیں۔ حمید احمد نے قیمت بتائی اور خاتون نے ادائیگی کر دی۔ حمید احمد نے گٹھری باندھ کر اٹھائی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر انہوں نے اسٹڈی کی کھڑکی کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ان کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔

وہ گٹھری اٹھا کر چل دیئے۔ ان کے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ چلو.... یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تلاش ختم ہو گئی۔ جانے والے نے کہیں کوئی نشان، کوئی سراغ نہیں چھوڑا کہ اس تک پہنچا جا سکے۔

انہیں اپنی مایوسی پر حیرت ہونے لگی۔ کیا اندر کہیں انہیں یہ یقین تھا کہ مدیحہ کا پتہ مل جائے گا؟ وہ اسے پا لیں گے؟ ہاں یہی بات ہے۔

کفرانِ نعمت کرنے والے مغرور اور خود پسند انسان، تو نے یہ سوچا کیسے؟ ان کے اندر کسی نے تند آواز میں کہا۔

یہ سب درست ہے۔ حمید احمد نے بے حد عاجزی سے سوچا۔ میں نے کفرانِ نعمت کیا....

ن بے خبری میں.... ایک اچھے جذبے کے تحت۔ اپنے اصول اور اپنے پیشے کی عزت کی
ط۔ اور شاید میں مغرور بھی تھا اور خود پسند بھی۔ لیکن میں نے تلافی کی کوشش بھی تو کی۔
نے وہ سب کچھ تیاگ دیا، جس کی وجہ سے کفرانِ نعمت کی خطا سرزد ہوئی تھی مجھ سے۔
نے خود کو خاک میں ملا دیا۔ کتابوں کی اس گٹھری کا بوجھ تو کچھ بھی نہیں، میں اپنے
زاف کا بوجھ اٹھائے شہر بھر میں پھرتا پھرا ہوں۔ خود کو کم سزا تو نہیں دی میں نے۔ اور کیا
ں؟

یہ تمام سزائیں کچھ بھی نہیں۔ اندر کی آواز نے کہا۔ تیری اصل سزا یہ ہے کہ جو محبت
بن مانگے، بلا کسی شرط کے مل رہی تھی، اب اس سے محرومی کے ساتھ پوری عمر گزار
ے۔ اب وہ تجھے کبھی نہیں ملے گی۔

میں نے ملنے کی آرزو بھی کب کی ہے۔ میں تو صرف اعتراف کا قرض اتارنا چاہتا ہوں۔

یہ موقع بھی تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ مل گیا تو وہ بھی مل جائے گی تجھے!

اچانک حمید احمد نڈھال ہو گئے۔ وہ گٹھری اٹھانا اب ان کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے
ری اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ وہ تھکن ایسی تھی، ایسا اضمحلال تھا کہ ان کا پورا جسم شل
ر رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی گزری تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ "کہاں
گے؟" ٹیکسی والے نے پوچھا۔ انہوں نے بتا دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اب وہ گھر کے سوا
ں نہیں جا سکتے تھے۔

☆

ولو.... آج تم جلدی گھر آ گئے۔" اماں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

اس وقت چار بجے تھے۔ تھکن ایسی تھی کہ حمید احمد بیڈ پر گر گئے اور گرتے ہی بے سدھ ہو
۔ وہ سو کر اٹھے تو چھ بجے تھے۔ وحید کرکٹ کھیلنے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ برآمدے میں تخت پر
بیٹھے۔ اماں ان کے لئے چائے لے آئیں۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔ وہ ان کے پاس ہی
گئیں۔ "آج تو میں تم سے بات کر سکتی ہوں حمید احمد؟" انہوں نے پوچھا۔

ارے اماں.... آپ کو اجازت کی ضرورت ہے کیا۔" حمید احمد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں
۔ "مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔"

"ضرورت تو نہیں ہے۔ پھر بھی پوچھ رہی ہوں۔ حالانکہ تمہاری مانگی ہوئی تین ما
مہلت پوری ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔" حمید احمد چونکے۔ انہیں یاد بھی نہیں تھا۔ "تین مہینے ہو گئے۔ وقت کیسے گزر جا
ہے۔ پتہ بھی نہیں چلا۔"

"مجھ سے پوچھو۔ ایک ایک دن گنتی کرتی رہی ہوں میں۔" اماں کے لہجے میں شکا
تھی۔ "تمہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔ اچھا.... اب تم بتاؤ گے یا مجھے پوچھنا پڑے گا؟"

"نہیں اماں۔ میں بتاؤں گا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر انہیں ایک ایک بات بتا دی۔ شر
سے آخر تک۔

اماں افسردہ تھیں۔ انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "غم نہ کرو بیٹے۔ اللہ بچھڑے ہوؤ
ملانے والا ہے۔ میرا رواں رواں تمہارے لئے دعا کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر اماں نے کہا۔ "آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟"

حمید احمد نے منٹوں میں بہت کچھ سوچ اور سمجھ لیا۔ کچھ فیصلے تو انہوں نے پہلے ہی کر
تھے۔ اب تین مہینے کی خود ساختہ قید سے رہائی ملی تھی تو وہ جانتے تھے کہ انہیں زندگی کی بس
نئے سرے سے بچھانی ہے۔ "اماں.... پوری زندگی میں نے کتاب سے محبت کی ہے
انہوں نے کہا۔ "پہلے پڑھتا رہا۔ پھر پڑھانے لگا۔ اب پڑھانا چھوٹ گیا ہے تو کتاب بیچنے
سوا کیا کر سکتا ہوں۔"

"اسی طرح.... گٹھری...." اماں نے گھبرا کر کہا۔

"میری پوری بات سن لیں اماں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ کہیں۔ مجھے ہی کہنے دیں
حمید احمد نے ان کی بات کاٹ دی۔ "یہاں چورنگی پر، سرسید گرلز کالج کے ساتھ کچھ اچھ
موقع کی دکانیں ہیں۔ میں وہ خرید کر دکان چلانا چاہتا ہوں۔ اور اماں' میں چاہتا ہوں کہ آ
اپنا مکان بیچ دیں' اپنی تمام جمع پونجی مجھے سونپ دیں تاکہ میں یہ سب کچھ کر سکوں۔"

اماں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اتنا روئیں کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
احمد گھبرا گئے۔ "کیا ہوا اماں.... کیا بات ہے۔ برا لگا آپ کو؟"

اماں نے خود کو سنبھالا اور انہیں خود سے لپٹا لیا.... بھینچ لیا۔ "مجھے برا لگے گا.... پاگ
ارے آج تو میں زندہ ہو گئی ہوں۔ حمید احمد.... تم نے بہت اچھا کیا کہ پروفیسری چھوڑ د

بھی تم سے ڈرتی تھی۔ گھبراتی تھی۔ تمہارا رعب تھا مجھ پر۔ میں تم سے محبت بیٹوں کی سی
تی تھی لیکن عزت پروفیسروں کی سی۔ اور میں سمجھتی تھی کہ تمہیں مجھ سے محبت بالکل
ہے۔ مگر بیٹے' آج تم نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم مجھے ماں
...مانتے ہو۔ یہ بات مجھے کہنی پڑتی تو اتنی خوشی نہیں ہوتی مجھے۔ ارے اماں سے کچھ
تھوڑا ہی جاتا ہے اسے بس بتا دیا جاتا ہے کہ ہمیں یہ ضرورت ہے اور یہ چاہئے۔ تم نے
خوش کر دیا حمید احمد! خدا تمہیں خوش رکھے۔ آج تم نے مجھے مان دے دیا۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ حمید احمد بھی تھے۔

اماں.... مجھے اظہار نہیں آتا۔ لیکن خدا کی قسم' میں نے آپ کو اپنی اماں کی طرح ہی سمجھا
۔ میں نے ان سے محبت نہیں کی.... موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن آپ سے میں نے محبت کی
اماں۔ سچ مچ محبت کی ہے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہے تھے۔

"آج مجھے یقین آ گیا بیٹے۔"

حمید احمد نے آنکھیں پونچھ دیں اور افق پر نظریں جما دیں۔ جیسے وہاں مستقبل کو دیکھنے کی
شش کر رہے ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کا ایک نیا عہد شروع ہو رہا ہے!

☆

وحید کے لئے وہ ایک بہت خاص دن تھا۔ آج یونیورسٹی میں ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے
لے سمسٹر کا پہلا دن تھا۔ یہ اس کے نصابی تعلیم کے آخری دور کا نکتہ آغاز تھا۔ اسلامک
ڈیز کے لئے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ اس نے ایم اے عربی میں ٹاپ کیا تھا۔

وہ ناشتہ کر چکا تھا۔ دودھ کا گلاس سامنے رکھ کر اس نے "دی نیوز" میں جین ڈکسن کے
YOUR HOROSCOPE کا جائزہ لیا۔ یہ بات نہیں کہ اس کا
ASTROLOG پر یقین ہو۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے وہ اس کی عادت بن چکا تھا۔ وہ
روز اسے دیکھتا تھا۔ لیکن فوراً ہی بھول جاتا تھا۔

اس نے TAURUS کا احوال پڑھا۔ "آپ جس محبت کے خواب دیکھتے ہیں، آج شاید
آپ کو نظر آ جائے۔ ممکن ہے' بعد میں کبھی آپ محسوس کریں کہ یہ وہ محبت نہیں ہے۔
ید آپ کو بس محبت سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لئے جلد بازی نہ کریں۔ یہ موٹے چھلکے والا
وٹ ہے۔ اسے توڑنے میں احتیاط نہیں کریں گے تو اس کا مغز ضائع ہو جائے گا۔"

عجیب سی پیش گوئی ہے۔ وحید نے سوچا۔ خیر.... مجھے کیا۔ یہ تو ہے کہ محبت مرا
کمزوری ہے۔ لیکن ایسی نہیں کہ مجھے دل پھینک بنادے۔ یونیورسٹی میں دو سال گزار
ہوں۔ مگر لڑکیوں سے میری جھجک آج بھی ویسی ہی ہے۔ کبھی محبت ہو ہی گئی تو اظہار مج
نجانے کیسے کروں گا۔

اسی وقت حمید احمد بھی ناشتے کی میز پر آگئے۔ وحید نے انہیں سلام کیا۔ "ارے....
تیار بیٹھے ہو!" حمید احمد نے سلام کا جواب دینے کے بعد حیرت سے کہا۔ پھر انہیں یاد آ
"اوہ.... آج سے تمہاری ایم اے اسلامک اسٹڈیز کی کلاسیں شروع ہو رہی ہیں؟"

"جی ابو۔ آج پہلا دن ہے۔" وحید نے جواب دیا۔

حمید احمد بیٹے کو بڑی محبت اور فخر سے دیکھ رہے تھے۔ ماشاءاللہ قد میں ان سے بھی اونچا
تھا۔ ذہین بھی وہ بہت تھا۔ پڑھائی کے میدان میں بھی وہ ان سے آگے جا رہا تھا۔ اس نے
ہی اپنے لئے منزل کا تعین کیا اور اس تک پہنچنے کی پلاننگ بھی کی۔ ایم اے عربی وہ کر چکا
اب اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کر رہا تھا.... اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ۔

حمید احمد اسے دیکھتے تو ہر دکھ' ہر پریشانی بھول جاتے۔ اسے دیکھتے تو اللہ کے لئے شکر
کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا اور وہ اپنی مرحوم اماں کو یاد کرتے۔ اماں کو جتنا انہوں
دیکھا تھا، دکھوں میں، غربت میں، پریشانیوں میں، مگر بس ایک ہی فکر کرتے دیکھا تھا۔ ان
فکر.... اس لئے کہ وہ اپنے ابا کی نسل کو جاری رکھنے کا وسیلہ تھے۔ اور اب ان کا بھی بیٹا
تھا۔ وہ وحید کو اسی طرح دیکھتے' اس کی فکر ویسے ہی کرتے' جیسے اماں ان کے لئے کرتی تھیں
وہ ان کی نسل آگے بڑھانے کا وسیلہ تھا۔ وہ بہت اہم تھا ان کے لئے۔

وحید نے دودھ کا گلاس خالی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابو.... دادی اماں.... میں
ہوں۔"

"وِش یو آل دی بیسٹ!" حمید احمد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

وحید کے جانے کے بعد اماں نے حمید احمد کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "
اب اس کی شادی کی فکر کرو حمید احمد۔" انہوں نے کہا۔ "اللہ میرا یہ بہو والا ارمان بھی پو
کردے۔ پھر میں سکون سے مر سکوں گی۔"

حمید احمد کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو اماں مدیحہ کے ملنے کے امکان سے دستبردار ہو گئیں

پوتے کے ارمان کے لئے انہوں نے انہیں چھوڑ کر وحید سے آس لگالی۔ ٹھیک تو ہے۔
مرنے کی بات نہ کیا کریں اماں۔"

اماں ان کے چہرے کی کیفیت دیکھ چکی تھیں۔ انہیں وہ بات منہ سے نکالتے ہی افسوس
نے لگا تھا۔ "اللہ میری اصل آرزو پوری کردے تو کیا بات ہے۔" انہوں نے ہاتھ ملتے
ے کہا۔ "بہو تو بیٹے کی بیوی ہوتی ہے۔ پوتے کی بیوی میں وہ بات کہاں۔"

مجھے تو بھول ہی جائیں اماں۔" حمید احمد کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ویسے بھی اب تو
آگیا ہے۔"

بڑھاپا کیسا۔ ایک بات یاد رکھو حمید احمد۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔" اماں تیز لہجے میں
۔ پھر انہوں نے تیزی سے گفتگو کا رخ بدلا۔ "تمہاری دکان کیسی چل رہی ہے؟"

اللہ کا شکر ہے اماں۔ اب تو وہ جگہ سونے کی قیمت کی ہے۔ اور دکان بھی بہت اچھی چل
ہے۔"

ں نے پان کی تھالی لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ "تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟"

ید احمد نے پان بنایا اور اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ "آج دیر سے جاؤں گا اماں۔ دکان شعیب
لے گا۔ رات میں چابی اسے دے آیا تھا۔"

یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے تم پر۔ تمہیں قابل اعتماد ملازم مل گئے۔ لوگ ترستے ہیں اس
کو۔"

بے شک اماں۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے وہ دکان خریدی تھی تو انہیں
ار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور دکان کے لئے تو مشہور ہے کہ پہلے سال چٹی' دوسرے سال
ر تیسرے سال کھٹی۔ کہتے ہیں کہ تین سال ثابت قدمی سے ڈٹے رہو' تب کہیں دکان
ہے۔ اب حمید احمد سوچتے تھے کہ شاید ایسا ہوتا تو وہ ٹھہر ہی نہیں پاتے۔ انہوں نے ایسے
ات کے ساتھ کاروبار شروع کیا تھا' جو آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ
عمر ڈھل رہی ہے۔ وہ تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عدم
کا احساس بھی بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ تجارت کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ ایسے
یک اجنبی میدان میں قسمت آزمائی....!

لیکن اللہ کی مہربانی سے ان کی دکان ابتدا ہی سے چل پڑی۔ چند مہینوں میں یہ حال ہو گیا کہ وہ اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں رہا۔ پھر خوش قسمتی سے انہیں اچھے اور ایمان دار ملاز مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمیشہ ان کو عزت دی، ان کی قدر کی اور ان کی ضرورتوں کا خیا رکھا۔ اب وہ کفران نعمت کرنے سے بہت ڈرتے تھے۔

ان آٹھ برسوں میں انہیں وہ معاشی استحکام ملا، جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ اب تو صرف دکان ہی لاکھوں کی تھی۔ اور ان کی ماہانہ آمدنی کا اوسط بھی لاکھ اوپر ہی تھا۔ مگر انہوں نے اپنا مکان اور رہن سہن نہیں بدلا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ انہوں مکان کو ڈھنگ سے بنوالیا۔ باقی ان کے طرز زندگی اور ان کے اخراجات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ یہ سوچ کر پس انداز کرتے رہے کہ کبھی وحید کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سو اب ان بینک بیلنس لاکھوں میں تھا۔

اس اعتبار سے انہیں آسودہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بے حد ناآسودہ تھے۔ ا ناآسودگی کا سبب یہ نہیں تھا کہ مدیحہ ان کی زندگی میں نہیں آئی۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ انہو نے تو ایسا کوئی خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو ا وعدہ کیا تھا اور وقت آنے پر اسے پورا کیا تھا۔ اس طرف سے بھی انہیں طمانیت تھی۔ آسودگی کا سبب صرف اور صرف محبت تھی۔ اور ایک سبب یہ تھا کہ وہ محبت کو آسودگی ا طمانیت فراہم کرنے والی نعمت کی حیثیت سے جانتے تھے۔

محبت کے بارے میں جو کچھ وہ جانتے تھے، وہ صرف کتابی تھا یا پھر ان کے پاس مدیحہ کا حوا تھا۔ ان دونوں حوالوں نے محبت کی کچھ اور ہی تصویر کھینچی تھی۔ شعر و ادب کے حوالے محبت ایک ایسا نہایت طاقتور جذبہ تھا، جو آدمی کی کایا پلٹ کر دیتا تھا۔ وہ نزاکت ف سوچوں کی خوب صورتی اور حسن نظر کو فروغ دیتا تھا۔ وہ تخلیقی جوہر کو توانائی بخشتا تھا۔ آدمی کو کہیں سے کہیں لے جاتا تھا۔ وہ انسان میں ایسے جذبے، ایسے خواص، ایسے اوصا پیدا کرتا تھا کہ انسانیت بھی اس پر فخر کرنے لگے۔

اور مدیحہ کو دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ آسودگی اور طمانیت کیا ہوتی ہے۔ ان کیفیات سن کر انہیں بلاوجہ رشک نہیں آیا تھا۔ انہوں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ محبت ایک ٹین ایجر.... ایک عام سی لڑکی کو کیسی قابل فخر بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور انہوں

ی کو ہر مرحلے میں دیکھا تھا۔ سپردگی کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کے تو اضطراب میں بھی ی اور سکون تھا۔ اس میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی، کڑواہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔ اس ضبط تھا، گہرائی تھی، ایثار کی خو تھی، خود نمائی کی نفی تھی۔ وہ بغیر احساس دلائے، بغیر نے آئے مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس میں بے غرضی تھی۔ خلوص تھا اور اس خلوص میں ت تھی۔ اس میں پالینے کی، قابض ہو جانے کی ہوس نہیں تھی۔ تبھی تو انہوں نے محبت آرزو کی تھی!

لیکن انہیں محبت ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ ان کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ انہیں محبت ہوئی پستی میں چلے گئے.... ہر اعتبار سے۔ انہیں وہ پیشہ ترک کر دینا پڑا، جس میں ان کی ت اور توقیر تھی۔ وہ سرگرداں ہوئے۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرے۔ وہ گویا مٹی میں لے۔ اور انہیں ملا کچھ بھی نہیں۔ نہ بے خودی و سرمستی، نہ خوشی، نہ سکون۔ انہیں ملا تو نے، بے چین کرنے والا اضطراب۔ انہیں ملا تو احساس نارسائی۔

گر نہیں.... محبت نے ایک چیز ان کو دی.... تصور۔ ورنہ وہ کبھی تصوراتی آدمی نہیں ہے۔ وہ تو بے حد عملی تھے۔ وہ کبھی کسی چیز کو پانے کی آرزو نہیں کرتے تھے۔ دل میں رزو پیدا ہوئی تو وہ اس پر سوچتے۔ تخمینہ لگاتے۔ فیصلہ کرتے کہ وہ ان کے لئے ممکن ہے یا ں۔ ممکن ہوتا تو وہ اس کے لئے نپی تلی کوشش شروع کر دیتے۔ ان کے سامنے ایک ہدف تا کہ وہ اتنے عرصے میں یہ چیز حاصل کر لیں گے اور اگر وہ ان کے خیال میں ممکن نہ ہوتا تو اس کا خیال دل سے نکال دیتے۔ قصہ ختم۔ یہ ان کے مزاج میں نہیں تھا کہ وہ تصور میں حاصل کریں اور اس پر خوش ہوں۔ یہ ان کے لئے منفی چیز تھی۔

گر اس رات، جب وہ دن میں مدیحہ کے بنگلے پر گئے تھے اور انہیں پتہ چلا تھا کہ مدیحہ کا ال نہیں مل سکتا، وہ سونے کے لئے لیٹے تو ان کے تصور میں بڑا جیتا جاگتا منظر آ گیا۔ ہوں نے دیکھا کہ وہ مدیحہ کے روبرو مجرموں کی طرح کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنا خط اسے ہے۔ "یہ امانت تم تک پہنچانے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کہاں کہاں نہیں پھرا۔" کہہ رہے ہیں۔

لیکن اس تصور میں بھی طمانیت، سکون، بے خودی، لذت.... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ان کے۔ مدیحہ نے خط پڑھا اور بڑی بے رخی سے انہیں دیکھا۔ "سوری سر۔" اس کے لہجے

میں بھی بے رخی تھی۔ "میں بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ آپ کا موقف درر
ہے۔ استاد اور شاگرد ہونے کی حیثیت سے مجھے اور آپ کو ایک دوسرے سے محبت کر
کوئی حق نہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی آپ کی محبت سے توبہ کر لی تھی۔ آپ بھی توبہ
لیں۔ اور ویسے بھی اب تو میری شادی ہونے والی ہے۔"

تصور میں حمید احمد پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "توبہ میں نہیں کر سکتا۔" انہوں نے عاج
لہجے میں کہا۔ "کیونکہ ترک محبت میرے بس میں نہیں۔ اور میں تم سے شادی کی درخوا
کرنے نہیں آیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ پورا کر دیا ہے
قرض تھا مجھ پر۔ میں صرف اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"آپ کس وعدے کی بات کر رہے ہیں۔" مدیحہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اس نے کہا۔ "ارے.... وہ:.... مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ چلیں، ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر وہ جاگتے رہے۔ انہیں نیند نہیں آئی۔ سینے میں ایک آگ
لگی ہوئی تھی، جو پانی پینے سے بجھنے والی نہیں تھی۔

☆

تصور معمولی سے ردوبدل کے بعد ان کا روز کا معمول بن گیا۔ دن بھر وہ دکان میں
رہتے۔ انہیں مدیحہ کا خیال بھی نہ آتا۔ رات کو وہ دکان بند کر کے گھر آتے۔ کھانا
کچھ دیر اماں سے اور وحید سے باتیں کرتے۔ ان کا بس چلتا تو وہ رات بھر ان سے
کرتے۔ صرف اس تصور سے بچنے کے لئے۔ لیکن بچنا ممکن نہیں تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ
انہیں گھیر لیتا۔

نہیں اس بات کی خوشی تھی کہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ وہ خوش تھے کہ انہوں نے
کی دکان کر لی۔ عاشقی اور پروفیسری کا کوئی جوڑ نہیں۔ پروفیسری میں فرصت بہت
ہے۔ آدمی سوچتے سوچتے، تصور کرتے کرتے پاگل ہو جائے۔ اور دکان.... وہ بھی
ہوئی دکان، آدمی کو مہلت ہی نہیں دیتی۔ یعنی عشق ہو جائے تو آدمی کے لئے دکان کر
ہی میں بہتری ہے۔

رات کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کاش زندگی میں رات نہ ہوتی۔

یک دن انہوں نے ذرا سا غور کیا تو ان کی سمجھ میں آ گیا کہ خرابی ان کے اپنے اندر ہے۔
انے محبت کو جرم سمجھ کر قبول بھی کیا ہے۔ وہ اس پر فخر نہیں کرتے۔ بلکہ شرمندہ ہیں۔
ور میں بھی ایثار کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ محبوب کی دل بستگی کا نہیں سوچتے۔ وہ تصور
بھی مدیحہ کے اس جواب پر نہیں کڑھتے۔ اس کے سامنے عاشقوں کی طرح عاجزی سے
اتے ہیں۔ وہ اس سے نہیں کہتے کہ وہ اس کے بغیر نہیں جی سکتے۔ وہ نہیں کہتے کہ تم اب
رے شادی نہیں کر سکتیں۔ انہیں خیال نہیں آتا کہ یہ سن کر مدیحہ کو خوشی ہو گی۔ وہ
ار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ محبت جس کا وہ اعتراف کر رہے ہیں، وہ زبردستی اُن پر مسلط
ی گئی ہے۔ وہ مجبور ہیں۔ ورنہ یہ کبھی ہوتا ہی نہیں۔ یہ محبت کیا ہے؟ کیا یہ محبت ہے؟
واب واضح تھا۔ محبت تو یہ ہے۔ مگر ایسی محبت ہے، جس کی عزت نہیں کی جا رہی ہے۔

اگر اسے ترک کرنا ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پہلی فرصت میں اسے ترک کر دیتے۔ وہ ان کے لئے کوئی پسندیدہ چیز نہیں تھی۔ بلکہ بے حد ناپسندیدہ تھی۔ تو پھر محبت کے وہ خوب صورت ثمرات انہیں کیوں ملیں' جو خود کو محبت کے سپرد کر دینے والوں کو ملتے ہیں۔

تو زندگی بے کیف تھی۔ وہ مشین کے انداز میں وقت گزار رہے تھے۔ سمجھ میں آنے کے بعد انہوں نے بڑی بھرپور کوشش کی کہ خود کو محبت کے سپرد کر دیں۔ انہوں نے اپنے معمول کے تصور میں ترامیم کی کوششیں کیں۔ لیکن وہ ناکام ہو گئیں۔ تبدیلی کی کوشش کرتے تو تصور کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا۔

کچھ اور ہوا یا نہیں' یہ شعر ان کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آ گیا....

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ہاں مگر ظرف سے آواز بدل جاتی ہے

☆

اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں طلباء اور طالبات نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑے تھے۔ ایم اے پریویس کے پہلے سمسٹر کے پہلے دن کا آغاز ہو رہا تھا۔ افتتاحی کلاس فقہ کی ہونی تھی۔ ڈاکٹر جبیں کو کلاس لینی تھی۔

اتنی دیر میں وحید کی تین لڑکوں سے دوستی ہو چکی تھی۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی ایک گھنٹا تھا۔ وہ ان دوستوں کے ساتھ کینٹین کی طرف چل دیا۔ وہ راستے میں تھے کہ سمیع نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ.... دیکھو.... ڈاکٹر جبیں...."

وحید کو ڈاکٹر جبیں کے بارے میں بہت تجسس تھا۔ فقہ جیسا مضمون اور پڑھانے والی ایک عورت۔ یہ بات اسے اتنی انوکھی لگی کہ اس کے سامنے یہ حقیقت بھی اتنی غیر اہم لگنے لگی کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ "کہاں.... کہاں؟" اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"زیادہ ایکسائیٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں۔" ظفر نے اسے ٹوکا۔ "وہ سامنے جو مکمل پردے میں ہیں، وہ ڈاکٹر جبیں ہیں۔"

وحید نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ یونیورسٹی میں تو وہ اسے غیر معمولی بات ہی لگی۔ ڈاکٹر جبیں کا پورا جسم ایک بڑی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ چادر بھی عجیب تھی کہ برقع جیسی ہی تھی۔ اس میں نقاب بھی تھی۔ ڈاکٹر جبیں نے اسے چہرے پر اس طرح لیا تھا کہ صرف ان کی

آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کے پیر بھی موزے میں چھپے ہوئے تھے۔

وہ ان کے قریب سے گزر گئیں۔ "یہ ڈاکٹر جبیں ہیں؟" وحید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی جناب! اور یہ فقہ پڑھاتی ہیں۔" ظفر نے کہا۔ "مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"یونیورسٹی میں اس طرح کا منظر دیکھ کر حیرت نہیں ہونی چاہئے!"

"کس بات پر؟" سمیع بولا۔

"اس پردے پر بھائی۔"

"فقہ پڑھانے والا باشرع ہو تو حیرت کیسی۔" نوید نے کہا۔

"فقہ پڑھانے والا یونیورسٹی میں آئے ہی کیوں؟" وحید نے اعتراض کیا۔

"کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ اور علم بانٹنے والے کی تو مسلمان معاشرے میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔"

"یہ کام وہ گرلز کالج میں بھی کر سکتی ہیں۔ مردوں کے درمیان آنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ سوال تم انہی سے کر لینا۔" سمیع نے کہا۔ "سنا ہے، کلاس میں یہ بڑی لبرل ہوتی ہیں۔ ویسے تو سخت خونخوار مشہور ہیں۔ ان سے ڈرتے ہیں سب۔"

"ان میں ایسی تو کوئی بات نہیں کہ ڈرا جائے ان سے۔" وحید نے بے حد سچائی سے کہا۔ سچ یہ ہے کہ وہ ان سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے انہیں سرسری نظر کے باوجود بہت غور سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں اور وہ اس طرح کا لڑکا نہیں تھا مگر اس کا جی چاہا تھا کہ ان کا چہرہ دیکھے۔ وہ یقیناً بہت حسین ہو گا۔

وحید کھو سا گیا۔ سب چائے پی رہے تھے اور وہ ڈاکٹر جبیں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر جبیں کی وہ ایک جھلک اس کے تصور میں تمام تر جزئیات کے ساتھ محفوظ ہو گئی تھی اور جزئیات تھیں ہی کتنی۔ ایک نقاب والی چادر اور آنکھوں میں کتنی جزئیات ہو سکتی ہیں۔ مگر وہ بہت زیادہ لگ رہی تھیں۔ اس نے انہیں سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ لیکن بہت گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ چادر میں چھپا ہوا، قیاس کے امکان سے باہر جسم، نقاب میں چھپا ہوا چہرہ جو بڑا پاکیزہ سا تجسس بیدار کرتا تھا' درحقیقت ایک بڑی شخصیت کا استعارہ تھا۔ وہ اس حوالے سے ان کے بارے میں سوچ سکتا تھا اور بہت زیادہ سوچ سکتا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اسے سوچنا

ہے۔

کہتے ہیں کہ آنکھیں باطن میں کھلنے والی کھڑکیاں ہوتی ہیں اور وہ آنکھیں.... ڈاکٹر جبیں کی آنکھیں.... وہ بے حد شفاف تھیں۔ ان میں پاکیزگی تھی اور بہت گہرائی تھی۔ ان میں اوپر نرمی تھی۔ لیکن نیچے گہرائی میں سختی تھی.... بہت زیادہ سختی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ دیکھ نہیں سکا تھا۔ موقع ہی کہاں ملا تھا۔ وہ آگے نکل گئی تھیں۔ مگر یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اوپر نرمی اور نیچے سختی۔ بات برعکس ہوتی تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

وہ ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ عجیب بات ہے۔ ایسا پردہ اور یونیورسٹی میں پڑھانا۔ کیا وہ کلاس میں بھی اسی طرح آئیں گی؟ پھر اسے سمیع کا جملہ یاد آگیا.... سنا ہے' کلاس میں یہ بڑی لبرل ہوتی ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ کلاس میں نقاب اٹھ جاتی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی دل میں اشتیاق جاگا۔ وہ ان کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔

''چلو یار۔ اب اٹھ چلیں۔'' ظفر نے اسے چونکا دیا۔

☆

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سب طالب علم ہیں۔'' ڈاکٹر جبیں کہہ رہی تھیں۔ ''لیکن آپ کو یہ ذہن میں رکھنا ہو گا کہ آپ عام طالب علم نہیں۔ طالب علم کا جو روایتی تصور ہے' آپ کو اس سے مختلف نظر آنا ہو گا۔ اور طالب علم کا روایتی تصور کیا ہے؟ وہ لاابالی اور کھلنڈرا ہوتا ہے۔ غیر سنجیدہ اور بے پرواہ ہوتا ہے۔ اسے زندگی کی رعنائیوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اسے آنے والے کل کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسے بس آج میں.... گرفت میں موجود لمحے کی فکر ہوتی ہے۔ یہ وہ تصور ہے' جس کی حدود سے آپ نکل آئے ہیں۔ پچھلی کلاس تک آپ خود کو تیار کر رہے تھے' خود کو علم کو جذب کرنے کے قابل بنا رہے تھے لیکن اب آپ ایک بے حد عظیم علم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ اب آپ کو جو کچھ سمجھنا اور سیکھنا ہے' وہ زندگی کا علم ہے۔ وہ ہمیں سکھاتا ہے کہ زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ہمیں کس طرح جینا چاہئے۔ کن باتوں کی فکر کرنی چاہئے۔ اب آپ ایک سنجیدہ اور بوجھل طالب علم ہیں۔

اور یہ علم کیا ہے؟ یہ اللہ کی عنایت ہے اپنے بندوں پر۔ یہ خوش خبری ہے.... ماننے والوں کے لئے اور تنبیہہ ہے.... انکار کرنے والوں کے لئے۔ یہ اِتمام حجت ہے اللہ کی طرف سے.... کہ یوم حساب کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اے میرے رب، مجھے ان باتوں کا علم ہی

نہیں تھا۔ کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ نے انبیاء بھیجے، ہدایت بھی' نشانیاں دکھائیں' عذاب بھیجے قوموں پر۔ پھر آخری پیغمبرؐ کو بھیجا۔ قرآن نازل فرمایا۔ ے ابد تک کے لئے محفوظ فرمایا اور پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک لمحے کو ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ انسان کو کیسا ہونا چاہئے، کیسے اٹھنا، بیٹھنا بولنا چاہئے۔ لوگوں سے کیسے برتاؤ کرنا چاہئے۔ کس طرح کے عمل کرنے چاہئیں اور کن موقعوں پر کیا رد عمل ہونا چاہئے۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف حیاتِ طیبہؐ سے معلوم ہوتا ہے۔

تو اب آپ اس علم کی اہمیت کو سمجھیں۔ یہ علم حاصل کرنا لازم ہے۔ یوم حساب جواب طلبی ہو گی تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دراصل آپ بے خبر تھے۔ کیونکہ آپ قرآن نہیں پڑھ سکے یا آپ نے احادیث کا مطالعہ نہیں کیا یا آپ نے سیرتِ پاک نہیں پڑھی۔ یہ تو ایک اور جرم شمار ہو گا۔ اللہ نے سب کچھ آپ کو دے دیا۔ اس سے استفادہ کرنا آپ کا فرض تھا۔''

وحید سحر زدہ سا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

''اخلاق اور اجتماعی رویہ اسلام میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں حقوق العباد کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرتِ پاکؐ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ قرآن میں جو احکامات دیئے گئے' آپ ﷺ نے ان پر عمل کر کے دکھایا۔ زبانِ مبارک سے ان کی تشریح فرمائی۔ یوں اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسے سمجھنا اور اس کے تحت زندگی گزارنا ہمارا فرض ہے اور یاد رکھئے' قرآن پاک کے چار حقوق ہیں مسلمان پر۔ قرآن پڑھے' اسے سمجھے' اس پر عمل کرے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اب شاید آپ اس مضمون کی اہمیت کو سمجھ گئے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ خود کو طالب علم کی حیثیت سے اس مضمون کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔''

وحید اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟''

''جی نہیں۔ میرا آپ سب سے تعلق علم کے حوالے سے ہے۔ آپ کی الجھنیں دور کرنا میرا فرض ہے۔ کہیں کوئی ابہام نہیں رہنا چاہئے۔''

''آپ اس ضابطہ حیات پر عمل کرتی ہیں؟''

''بہت خلوص سے کوشش کرتی ہوں عمل کرنے کی۔ بہر حال کوتاہیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔''

"اسلام نے عورت کے لئے پردے پر بہت زور دیا ہے۔" وحید نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر جبیں مسکرائیں۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ میں پردے کا اہتمام کرتی ہوں۔"

"لیکن کلاس میں تو آپ کے چہرے پر نقاب نہیں ہے۔"

"یہ مجبوری ہے۔ کلاس سے باہر میرے چہرے پر ہمیشہ نقاب رہتا ہے۔"

"مجبوری کیسی؟ آپ کسی گرلز کالج میں بھی پڑھا سکتی تھیں۔"

"میں اس اعتراض کا جواب ذرا تفصیل سے دوں گی۔" ڈاکٹر جبیں نے بڑے تحمل سے کہا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو گھر تک محدود نہیں کیا۔ وہ باہر آ جا سکتی ہے.... پردے کے ساتھ۔ بلکہ اسلام نے عورت کو وہ اہمیت دی' جو مردوں کو نہیں ملی۔ عورت نسلوں کو تعمیر کرتی ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ پردے کا حکم اس کا ثبوت ہے کہ عورت گھر سے نکل سکتی ہے۔ گھر تک محدود رہے تو پردے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں گرلز کالج میں پڑھا سکتی تھی۔ بے شک پڑھا سکتی تھی۔ مگر وہ ایک محدود میدان تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں یہاں یونیورسٹی میں زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ یہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ یہاں اسلام کا نام سب لیتے ہیں۔ عمل کوئی نہیں کرتا۔ سیاست دان منافق ہیں۔ حکمران منافق ہیں۔ اسلامی معاشرے میں ان کی خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں تو وہ شریعت کیوں نافذ کریں۔ سو اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ اسلامی معاشرہ!! اور وہ کیسے بنے گا؟" انہوں نے ذرا توقف کیا۔ "اس کی ایک ہی صورت ہے۔ افراد اپنے طور پر اپنی زندگی میں شریعت کو نافذ کریں.... اسلامی احکامات پر عمل کریں.... تو اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑے گی۔ اور جب اکثریت ایسا کرنے لگے گی تو اسلامی معاشرہ وجود میں آ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یونیورسٹی میں پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ کالج میں' میں صرف لڑکیوں کو پڑھاتی.... مستقبل کی عورتوں کو' جن کی اس معاشرے میں کوئی وقعت نہیں۔ جن کی کوئی سنے گا نہیں۔ جبکہ یہاں لڑکے بھی ہیں۔ معاشرے کے معمار! فیصلے کرنے والے! یہاں میں پردے میں آتی ہوں۔ یہ تبلیغ ہے۔ خاموش تبلیغ۔ صرف میرے اسٹوڈنٹس کیلئے نہیں۔ یونیورسٹی کی تمام طالبات کے لئے۔ لڑکیاں مجھے اس طرح دیکھیں گی تو انہیں

لگے گا۔ کچھ مذاق اڑائیں گی' کچھ اسے سنجیدگی سے نہیں لیں گی۔ لیکن کچھ اس پر غور کریں گی۔ یونیورسٹی کے پرانے طلباء و طالبات اب اس منظر کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہی کامیابی ہے۔ بلکہ میں دیکھتی ہوں' کچھ لڑکیوں نے پردہ شروع بھی کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔

میں اپنے اسٹوڈنٹس سے کہتی ہوں کہ وہ اس مضمون کی اہمیت کو سمجھیں۔ اسے دل میں اور اس کی روشنی دوسروں تک پہنچائیں۔ اسلامی معاشرے کے فروغ کے لئے کام کریں۔ یہ بڑا اجر کا کام ہے۔ ہمارا معاشرہ اس ہنس کی طرح ہے جو مغرب کی تقلید میں کوے کی کوشش کر رہا ہے اور کوا بھی نہیں بن پا رہا ہے۔ ہم سب خود کو سنوار کر اسے سنوار سکتے ہیں۔ میرا یہی مشن ہے۔ یہی آپ سب کا مشن ہونا چاہئے۔" وہ وحید کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "اب آپ مطمئن ہیں؟"

"جی ڈاکٹر۔" وحید نے جواب دیا۔

"اب ایک بات میں بھی آپ سے پوچھ لوں۔" ڈاکٹر جبیں مسکرائیں۔ "یہ آپ نے آنے سے پہلے جو عربی میں ایم اے کیا، یہ محض اتفاق ہے یا....؟"

"یہ بالارادہ ہے مادام۔" وحید بھی مسکرایا۔ "میں اس مضمون کی اہمیت کو سمجھتا ہوں اور قرآن پورے کا پورا عربی زبان میں ہے۔ اس لئے میں نے عربی میں ایم اے کیا۔ صرف ڈگری کے لئے نہیں۔ میں عربی کی استعداد چاہتا تھا۔"

"لیکن ہر چیز کا ترجمہ ہر زبان میں موجود ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے اعتراض کیا۔

"وہ تو ترجمہ کرنے والے کی بات ہوئی نا.... سیکنڈ ہینڈ۔ میں فرسٹ ہینڈ انفارمیشن چاہتا تھا۔ ان میں جتنے بھی اختلافات ہیں' ان میں سے بیشتر کی بنیاد زبان ہے اور زبان کا یہ ہے کہ عربی بہت قدیم زبان ہے۔ لیکن بعثت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا، اس میں زبان بھی شامل تھی۔ لفظوں کے مفاہیم بدل گئے۔ نئی اصطلاحات وجود میں آئیں۔ میں عربی نہیں پڑھوں گا تو بات کیسے سمجھوں گا۔"

"ذرا فرسٹ ہینڈ والی بات کی وضاحت بھی کر دیں۔" ڈاکٹر جبیں نے کہا۔ "قرآن کو سمجھنے کے لئے ہم تفسیر کا سہارا تو لیتے ہیں۔"

"اللہ نے فرمایا اور میرا اس پر ایمان ہے کہ قرآن پاک رہتی دنیا تک کے لئے روشن ہے

اور اس کی مکمل تشریح و تفسیر کبھی نہیں ہو سکے گی۔ گویا ہر آیت کے سینکڑوں ہزاروں پہلو ابھی انسانی نظر اور فہم سے اوجھل ہیں۔ تو میں خود پڑھ کر غور کیوں نہ کروں۔ اگر اللہ کو میرا خلوص' میری نیت پسند آگئی تو کچھ روشنی مجھے براہِ راست بھی تو مل سکتی ہے۔ میں اس کے لئے کوشش کیوں نہ کروں۔"

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے وحید۔" ڈاکٹر جبیں کے لہجے میں خلوص تھا ستائش تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آپ کوئی بڑا کام ضرور کریں گے۔ آپ کے پاس جذبہ ہے' جس کی سچائی کی بڑی اہمیت ہے۔ اچھا.... اب وقت ختم ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ... بشرط زندگی پھر ملیں گے اور ایک ساتھ بہت کچھ سیکھیں گے۔" یوں پہلی کلاس ختم ہو گئی!

☆

اس روز وحید اپنے کمرے کی تنہائی میں خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آیا تھا کہ خود کو سمجھنا اور ٹٹولنا اس کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا۔ او وہ ابتداء ہی سے ایسا لڑکا تھا' جسے اپنے آپ سے 'اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہنا گوارا نہیں تھا۔

اور یہ انقلاب ایک شخصیت کی وجہ سے آیا تھا۔ ڈاکٹر جبیں کی وجہ سے! ابتدا میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے ڈاکٹر جبیں کو کینٹین کے سامنے سے گزرتے دیکھا تو اسے غیر معمولی منظر لگا۔ یونیورسٹی میں اس قدر باپردہ عورت! اور وہ بھی ڈاکٹر.... اسلا اسٹڈیز کی! غیر معمولی بات تو تھی۔ وہ ان کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ غیر معمولی باتوں کے بارے میں تو آدمی سوچتا ہی ہے۔

مگر اس وقت بھی اسے اپنے اندر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں ڈاکٹر جبیں کا چہرہ دیکھنے کا جو اشتیاق پیدا ہوا تھا' وہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب تک وہ بلاشبہ سینکڑوں بے حد حسین لڑکیوں کو دیکھ چکا ہے۔ مگر اسے کسی کی صورت یاد نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ سرسری نگاہ سے دیکھا تھا اور اس کے بعد وہ چہرہ اسے کبھی یاد نہیں رہا تھا۔ ہر چہرہ محو ہو جاتا تھا' سو اس نے ڈاکٹر جبیں کو بھی بظاہر سرسری نگاہ سے دیکھا تھا' لیکن درحقیقت اس نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر بھی اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ پردہ تو گہری نظر پر اکساتا ہی ہے۔

لیکن کلاس میں جب اس نے انہیں نقاب کے بغیر دیکھا تو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ان کا چہرہ بہت حسین تھا۔ لیکن سب سے بڑی بات اس چہرے کی پاکیزگی تھی۔ پاکیزگی ایسی تھی' جیسے کسی میلی نظر نے اسے کبھی مجروح نہیں کیا ہو۔ بلکہ اسے لگا کہ کبھی کسی کو ان پر میلی نظر ڈالنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی ہو گی۔ اور ان کی شخصیت بے حد پروقار تھی۔ اس میں چاند کی سی ٹھنڈک اور سکون تھا۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان کی نگاہیں بے حد گھنی ہے۔

پھر اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا!

اسے یاد تھا۔ باہر اس نے ان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اور حیران ہوا تھا۔ ان آنکھوں کی گہرائی تھی۔ اوپر نرمی تھی لیکن نیچے گہرائی میں سختی تھی۔ اور یہ حیرت کی بات تھی۔ اس نے حیرت کے ساتھ اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ اس کا وہم ہے۔ اس نے سرسری نگاہ میں ان آنکھوں کی گہرائی تک کیسے دیکھ لی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔

مگر اب وہ روبرو تھا۔ اس نے ان آنکھوں میں دیکھا.... ان جھیل آنکھوں میں اترا۔ اوپر نرمی تھی' ٹھنڈک تھی' سکون تھا۔ لیکن ان کی گہرائی میں اترتے ہوئے اچانک اسے دھچکا سا لگا.... اس کو نگاہ کی سختی اور کھولتی ہوئی گرمی کا احساس ہوا۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

اس نے ایسی آنکھیں، ایسی شخصیتیں بہت دیکھی تھیں، جن میں اوپر سختی ہوتی تھی اور اندر نرمی۔ ابو بھی ایسے ہی تھے۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ محتاط لوگوں کی علامت تھی۔ محتاط اور خوف زدہ لوگوں کی' جو تعلقات میں چوٹ کھانے سے ڈرتے تھے۔ وہ اس سختی کو خول کی طرح چڑھائے رکھتے تھے۔ وہ سختی مزاحمت کرتی تھی، آنے والے کو پیش قدمی سے روکتی تھی.... ! اِدھر مت آؤ.... آگے نہ بڑھو.... زخمی ہو جاؤ گے۔ چوٹ کھاؤ گے۔ یہ زمین سنگلاخ ہے۔ لیکن کوئی اس کے باوجود بڑھتا چلا آئے تو پھر نرمی ملتی تھی۔ جو کہتی تھی۔ اب آ گئے ہو تو آ ہی جاؤ۔ یہاں تو نرمی ہی نرمی ہے۔ بس اس سے ناجائز فائدہ مت اٹھانا۔ ہمیں دکھ نہ دینا۔ کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ یہاں ایک پراعتماد اور بے خوف شخصیت تھی' جسے تعلقات میں کسی قسم کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ جو تعلقات کو حدود میں رکھنا جانتی تھی۔ جسے معلوم تھا کہ تعلق ایک خاص حد سے بڑھے گا تو تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ ان آنکھوں میں اوپر نرمی تھی۔ لیکن نیچے جاؤ تو سختی، جو کہتی

تھی.... آپ یہاں تک کیوں آئے؟ آپ کو اس کا حق نہیں۔ واپس جایئے۔ آپ کا یہاں کوئی کام نہیں اور وہ سختی، وہ درشتی ایسی تھی کہ بڑھتے ہوئے قدم ڈگمگا جائیں۔ بے ساختہ پیچھے ہٹیں۔ لیکن وحید پھر بھی نہیں رکا۔ اور آگے اور گہرائی میں اسے کھولتی ہوئی گرمی کا احساس ہوا، جو بڑھتی ہی جارہی تھی، جیسے جھیل کے نیچے لاوا ہو۔ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ آپ مداخلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نتائج کے ذمہ دار بھی آپ ہی ہوں گے اور یہ وہ مقام تھا، جہاں سے وہ گھبرا کر پلٹ آیا تھا۔

اور پھر کلاس میں ڈاکٹر جبیں کی گفتگو! وہ یقیناً ایک غیر معمولی عورت تھیں۔ اتنے خلوص سے اس طرح کی بات تو وہ لوگ بھی نہیں کرتے، جو اسلامی نظام کا پرچار کرتے ہیں۔ سب کا اپنا اپنا انداز اور اپنی اپنی اغراض ہوتی ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر جبیں کا انداز اس معمار کا سا تھا، جو بڑی احتیاط سے کسی بڑی عمارت کی بنیاد رکھ رہا ہو۔ جو بہت دیکھ بھال کر ایک ایک اینٹ لگا رہا ہو کہ کہیں کوئی اینٹ ٹیڑھی نہ لگ جائے۔ ڈاکٹر جبیں کو یقین تھا کہ وہ ایک بڑا کام کر رہی ہیں۔ انہیں اعتماد تھا کہ وہ کامیاب رہیں گی۔ کیونکہ وہ تھوڑے سے افراد کو، اپنے طلباء کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ لوگ سیدھے راستے کو پہچانتے بھی ہیں۔ اسی لئے کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔

وحید انہیں نہیں بتا سکا کہ وہ بھی انہی کی طرح سوچتا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اس نے اپنے لئے مضامین کا انتخاب کیا تھا۔ مگر اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی پہلے سے یہ کام کر رہا ہوگا۔ اسے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

تو اب وہ دونوں مل کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ یہ اشتراک بہت موثر ثابت ہوگا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا لیکن ڈاکٹر جبیں کی حیثیت سینئر پارٹنر کی ہوگی۔ جبکہ اس نے اس پروجیکٹ کے لئے بہت محنت کی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آدمی کاذ سے مخلص ہو تو اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے اور یہ کام تو ذاتی ہے بھی نہیں۔ یہ تو فرض ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ یونہی ہوا میں گرہیں لگا رہا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ ڈاکٹر جبیں کا پروجیکٹ ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے اور اس سے زیادہ محنت کی ہے اس سلسلے میں۔ وہ اسے اپنے ساتھ کیوں شامل کرنے لگیں۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کام

رکتے ہیں۔ کون جانے، وہ ان سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ اسے اپنے طور پر کام کرنا چاہئے۔ جو ریڈٹ ملے، وہ اپنا ہو، کسی اور کا کیوں ہو؟

اسی لمحے دل نے کہا.... محبت میں، میں اور تو کا فرق کہاں رہتا ہے۔ ان کے ساتھ کام رنے کا بھی اجر بھی بڑھے گا اور اس کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

وہ بری طرح بھڑکا۔ یہ محبت کہاں سے گھس آئی اس معاملے میں؟ اس نے احتجاج کیا۔

تو پھر جب سے ڈاکٹر جبیں کو دیکھا ہے، انہی کے بارے میں کیوں سوچے جارہے ہو؟ دل نے ترکی بہ ترکی کہا۔

وحید سناٹے میں آگیا۔ بات سچی تھی۔ اس لمحے سے اب تک اس نے صرف ڈاکٹر بیں کے بارے میں ہی سوچا تھا اور اب بھی اس کے تصور میں ان کا ہی چہرہ تھا۔ یہ سب کچھ تھا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ محبت ہے.... یہ اس کی عقل تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔

یہ اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو یونہی چھوڑ دیتا۔ خود سے بے خبر ہنے کا، یا کوڑا کرکٹ قالین کے نیچے دھکیل کر "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ لگانے کا وہ قائل ہی ہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ اس پر سوچنے لگا۔

اور وحید کوئی عام لڑکا نہیں تھا۔ وہ بائیس سال کا ہو چکا تھا اور تیئسویں سال میں تھا۔ پھر وہ لوگوں میں سے تھا، جن کی شخصیت کم عمری میں ہی بن جاتی ہے۔ وہ نیک اور صالح تھا۔ اس کے پاس کردار کی مضبوطی بھی تھی۔ برسوں سے یہ ہو رہا تھا کہ اس کے اساتذہ.... اور اسے بڑے لوگ بھی اس کے ساتھ احترام آمیز سلوک کرتے تھے۔ ہر جگہ اس کی بات کو بت دی جاتی تھی۔ اس سے رائے لی جاتی تھی اور اس کی رائے کو کبھی بے وزن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھی طلبا بھی اس کی عزت کرتے تھے، کالج کے زمانے میں کچھ لڑکیاں اسے رومانوی انداز میں متاثر ہوئی تھیں لیکن انہیں اس کے اظہار کی ہمت نہیں ہوئی اور خود اس نے کبھی انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

وہ زندگی میں دماغ کی بالادستی کا قائل تھا۔ دل اس کے نزدیک ایک بچے کی طرح تھا، جو سوچے سمجھے کسی بھی چیز کی خواہش کر سکتا تھا اور اس بے لگام بچے کو قابو میں رکھنے کے لئے ہی اللہ نے عقل عطا کی ہے۔ اسی لئے دل میں ابھرنے والی ہر خواہش کو وہ عقل کی کسوٹی پر رکھتا تھا۔ اس میں فائدہ ہے کہ نہیں۔ ہے تو کتنا۔ نقصان کا احتمال تو نہیں ہے۔ اس کے

لئے کتنی جدوجہد کرنی ہوگی۔ مشقت کتنی ہے۔ فائدہ اس کے مطابق ہے یا نہیں۔ خواہش کے پورے ہونے کا امکان بھی ہے یا نہیں۔ یہ سارے حساب لگانے کے بعد وہ اس بارے میں فیصلہ کرتا تھا۔

ڈاکٹر جبیں کے معاملے میں سوچ بچار کے بعد وہ اس ابتدائی نتیجے پر پہنچا کہ بظاہر یہ پہلی نظر کی محبت کا معاملہ ہے۔ لیکن فی الوقت یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ مگر اس کی تردید کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اب خود پر نظر رکھی جائے۔

اس نے اخبار اٹھایا اور ASTROLOGY کے کالم کو دوبارہ پڑھا۔ آپ جس محبت کے خواب دیکھتے ہیں ' آج شاید وہ آپ کو نظر آجائے۔ ممکن ہے 'بعد میں کبھی آپ محسوس کریں کہ یہ وہ محبت نہیں ہے بلکہ آپ کو بس محبت سے محبت ہوگئی تھی۔ اس لئے جلد بازی نہ کریں۔ یہ موٹے چھلکے والا اخروٹ ہے۔ اسے توڑنے میں احتیاط نہیں کریں گے تو اس کا مغز ضائع ہوجائے گا۔

یہ صحیح نکلا ہے۔ وحید مسکرایا۔ دل میں اسے اعتراف کرنا پڑا کہ بظاہر اس پیش گوئی کا ایک ایک لفظ درست معلوم ہورہا ہے۔ ڈاکٹر جبیں درحقیقت موٹے چھلکے والے اخروٹ کی طرح ہیں۔ رہا جلد بازی نہ کرنے کا مشورہ.... تو وہ جلد بازی کا قائل ہی نہیں ہے۔ وہ تو محبت بھی خوب سوچ سمجھ کر ہی کرے گا۔

اس نے اخبار سنبھال کر رکھ دیا۔ یہ اخبار تو ریکارڈ میں رکھنے والا ہے!

☆

وہ چھٹی کا دن تھا۔ اور چھٹی والے دن مدیحہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوجاتی تھی۔ ناشتا دوبارہ سو کر اٹھنے کے بعد ہی کرتی تھی۔ لیکن اس روز وہ عام دنوں کی طرح بالکنی میں جا بیٹھی۔ نسیمہ اس کے لئے چائے بنا کر لے گئی۔ ''شکریہ نسیمہ۔'' مدیحہ نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔

''آج سوؤگی نہیں بی بی؟'' نسیمہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ نیند آہی نہیں رہی ہے۔ خواہ مخواہ بستر پر لیٹنے کا کیا فائدہ؟''

''تو ناشتا بنادوں؟''

''نہیں۔ ناشتے کی بھی خواہش نہیں ہے۔'' مدیحہ نے کہا اور چائے کی پیالی نیچے رکھ کر

یہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم بہت اچھی ہو نسیمہ۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔''

''میں اچھی ہوں بی بی۔ اس لئے کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ نوکر تو اپنے مالک جیسے .... پر اے ہلکے ہوتے ہیں۔'' نسیمہ نے آہ بھر کے کہا۔ ''اور خیال میں کیا رکھتی ہوں۔ رکھ ہی سکتی۔ آپ موقع ہی کہاں دیتی ہیں۔''

''تم سب کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلی آئیں۔ مجھے تنہائی سے بچالیا۔ یہ کیا کم ہے۔'' مدیحہ کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

نسیمہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''صاحب اور بیگم صاحبہ کے بعد وہاں آپ کے سوا میرا کون ا۔ کسی کو نہ میری ضرورت تھی نہ پرواہ۔ اب تو دنیا میں آپ کے سوا میرا کوئی ہے ہی ہیں۔''

''تو پھر تم اتنی ناخوش کیوں رہتی ہو؟''

''ایک بچے کو گود میں کھلالوں تو ہنسی خوشی مر بھی سکتی ہوں۔ بس یہ تمنا ہے بی بی۔''

''تو پھر ڈھونڈوں تمہارے لئے کوئی رشتہ؟'' مدیحہ نے ہنس کر کہا۔

''مجھ سے تو جوانی میں بھی سب ڈرتے تھے۔ بڑھاپے میں کون پوچھے گا مجھے۔'' نسیمہ نے ر آہ بھرتے ہوئے کہا۔

نسیمہ کی زندگی کی ٹریجڈی مدیحہ کو معلوم تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ دس ماہ ارے تھے کہ شوہر بیمار ہوا اور چٹ پٹ ہوگیا۔ دو سال بعد دوسری شادی ہوئی اس بار اہر چھ مہینے بھی نہیں نکال سکا۔ بس پھر اس پر نحوست کی چھاپ لگ گئی۔ شادی تو در کنار ' لا کو اس کا اپنے گھر آنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ماں باپ کے در پر پڑی رہی۔ جب وہ بھی گزر لے تو بے سہارا ہوگئی۔ تب ممی اسے گھر لے آئیں۔ دنیا نے لاکھ سمجھایا۔ مگر ممی اپنی جگہ ڈٹی ہیں۔ ''یہ اب یہیں رہے گی۔''

''نحوست کو گھر میں رکھنا حماقت ہے۔'' ممی کی ایک سہیلی نے سمجھایا۔

''میں نہیں مانتی یہ سب۔ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ کوئی کسی کی نحوست سے کی مرتا۔''

''مگر یہ تو سوچو 'جوان بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ ایسی عورت کو گھر میں رکھنا شوہر الگو دینے کے برابر ہوتا ہے۔'' دوسری سہیلی بولی۔

"حامد ایسے نہیں۔ ہوں تو باہر کیا کی ہے۔ بس یہ یہیں رہے گی۔"

اور مدیحہ کو یاد تھا۔ ممی اتنی سخت تھیں مگر انہوں نے نسیمہ سے کبھی ترش بات بھی نہیں کی۔ اس کی غلطی پر بھی مسکرا کر در گزر کر دیتی تھیں۔ اور پاپا مرحوم تو تھے ہی نرم۔ نسیمہ بھی ان دونوں کو جیسے پوجتی تھی۔ ان کے اشارے پر کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی تھی۔ ممی اور پاپا کے انتقال پر سب سے برا حال اسی کا تھا....

"تو یہ آرزو پوری کرنے کے لئے تمہیں بچہ گود لینا پڑے گا۔" مدیحہ نے تشویش اور فکر مندی سے کہا۔

"نا بی بی نا.... پرایا بچہ میں کیوں پالوں۔" نسیمہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"تو پھر؟" مدیحہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں تو بی بی آپ سے آس لگائے بیٹھی ہوں۔"

مدیحہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ "مجھ سے؟"

"ہاں بی بی۔ آپ کی شادی ہو تو پھر میں بچے کھلاتے کھلاتے عمر گزار دوں اور اتنی خوش ہوں.... اتنی خوش رہوں کہ بس۔"

مدیحہ کو اس کی معصومیت پر پیار آنے لگا۔ "تم نے یہ نہیں سوچا کبھی کہ میری شادی ہوگی تمہارا کیا بنے گا؟"

"میرا کیا بنے گا بی بی!"

مدیحہ کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ "تم مالک بن جاؤ گی اس گھر کی۔"

"وہ کیسے بی بی؟"

"بھئی میں تو رخصت ہو کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔ یہ فلیٹ تمہارے نام کر جاؤں گی۔"

نسیمہ دہل گئی۔ "تو میں یہاں اکیلی رہوں گی؟"

"اور کیا۔ اور یہ تو سوچو کہ پھر تم میرے بچے کیسے کھلاؤ گی۔"

"میں اکیلی یہاں رہوں گی ہی نہیں۔ میں تو آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلی جاؤں گی اور آپ کے صاحب سے کہوں گی کہ بی بی کے جہیز میں آئی ہوں۔"

مدیحہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ "یہ چلتا پھرتا جہیز دیکھ کر وہ مجھے ہی واپس نہ کر دے۔"

"بہت خدمت کروں گی بی بی۔"

مدیحہ نے چائے کی پیالی خالی کر کے اس کی طرف بڑھائی۔ "شکریہ نسیمہ۔ خدمت تو تم ہاں بھی کر رہی ہو۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

☆

نجانے کیا ہوا کہ حمید احمد کی نیند اچٹ گئی۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ تو بہت گہری نیند سو... تھے۔ وہ کسمسائے، کروٹ بدلی اور دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ مگر لگتا تھا کہ نیند اڑ گئی ہے... وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ان کا اندازہ تھا کہ یہ آدھی رات کے بعد کا وقت ہے۔ جی... کہ لائٹ آن کریں اور گھڑی میں وقت دیکھیں۔ لیکن جسم اٹھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ کیا... ہے کہ نیند اڑ گئی۔ کم از کم پڑے آرام تو کرتے رہو۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ گئے۔ اس کا سبب مسلسل ٹپ ٹپ کی آواز تھی۔ تو... بات ہے۔ نیند میں ڈوبے ہوئے دماغ نے کہا۔ اب اس ٹپ ٹپ میں تو نیند نہیں آ سکتی۔ اٹھ... ہی پڑے گا۔

وہ اٹھ کر اٹیچڈ باتھ روم کی طرف گئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا، لائٹ جلائی۔ لیکن نہ باتھ روم میں کوئی نل کھلا تھا، نہ ٹپ ٹپ کی آواز وہاں سے آ رہی تھی۔ اسی وقت انہیں اندازہ ہوا کہ ٹپ ٹپ کی آواز تو باہر سے آ رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے، بارش....

ان کی نیند پوری طرح اڑ گئی۔ وہ دروازے کی طرف لپکے۔ برآمدے میں پہنچتے ہی پتا چل گیا کہ زوردار بارش ہو رہی ہے۔

مکان نئے سرے سے بنواتے وقت انہوں نے برآمدے کی حالت نہیں بدلی تھی۔ صحن بھی کورڈ ایریئے میں تبدیل نہیں کیا تھا۔ اتنے مختصر سے کنبے میں اس کی ضرورت پڑی ہی نہیں۔ برآمدے میں تخت بھی ویسے ہی پڑا تھا۔

انہیں آٹھ سال پہلے کی وہ رات یاد آ گئی، جب انہیں پہلی بار مدیحہ کی محبت کا احساس ہوا تھا۔ اس رات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ برسات کی کوئی رات ان کے حصے میں آئی تھی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ بارشیں اب کم ہی ہوتی تھیں۔ پچھلے تین سال سے تو شہر میں بارش ہوئی ہی نہیں تھی۔

انہیں لگا کہ ان کے دل میں خوشی کے پھول کھل اٹھے ہیں۔ وہ بڑے شوق سے بڑھے اور ہاتھ برآمدے سے باہر بارش کی طرف بڑھایا۔ اگلے ہی لمحے انہیں ہاتھ کھینچ لینا پڑا۔ پانی بہت سرد تھا۔

ایک لمحے میں ان کے پورے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ انہیں خیال ہی نہیں تھا کہ یہ موسم سرما کی بارش ہے۔

کمرے میں تو سردی کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ یہاں برآمدے میں انہیں باقاعدہ سردی لگنے لگی اور اب کمرے میں لیٹنا وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جا کر کمرے سے کمبل لے آئے۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر انہوں نے پیروں سے سینے تک کمبل اپنے اوپر ڈال لیا۔ برآمدے کا بلب انہوں نے پہلے ہی روشن کر دیا تھا۔ اس روشنی میں صحن ایک بہت بڑی کڑاہی لگ رہا تھا، جس میں پکوڑے تلے جا رہے ہوں۔

اچانک ان کے حیطہ نگاہ میں ایک ٹرے داخل ہو گئی پھر کسی نے کہا۔ "لیجئے سر.... گرما گرم کافی پیجئے.... پکوڑے کھائیے اور برسات کے لطف کو دوبالا کیجئے۔"

انہوں نے چونک کر سر گھمایا اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ وہ مدیحہ تھی۔ "تم؟ تم یہاں کیسے؟"

"یہ میرا موسم ہے۔ اس موسم میں تو میں کہیں بھی ہو سکتی ہوں۔"

ان کی زبان پر مدیحہ کی بنائی ہوئی کافی کا ذائقہ مچلا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے سب کچھ غائب ہو گیا۔ مدیحہ بھی اور وہ ٹرے بھی۔

لیکن کافی کی طلب جاگ چکی تھی اور اس کا رویہ ضدی بچے کا سا تھا۔ وہ اسے بہلا نہ سکے۔ مڑ کر کچن کی طرف چل دیئے۔ گھر پر رات کا سکوت طاری تھا۔ پر شور بارش بھی اسے مجروح نہیں کر پا رہی تھی۔ کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ وہ پکوڑے بھی بنا سکتے تھے لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ کافی....

اگلے ہی لمحے ایک مسئلہ ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ "میں کافی کیسے بناؤں گا؟" وہ بڑبڑائے۔ "میں نے کبھی کچن کا کوئی کام نہیں کیا۔"

مدیحہ پھر نمودار ہو گئی۔ اس بار وہ ان کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ "کافی بنانا تو بہت آسان ہے۔" وہ گنگنائی۔ "پانی ابالنے کے لئے رکھا۔ پیالی میں دو چمچے دودھ ڈال کر اس میں

ایک چمچہ کافی پاؤڈر ملا کر خوب پھینٹا۔ پھر اس میں ابلا ہوا گرم پانی ڈالا، دودھ اور چینی ملائی۔ کافی حاضر۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ یہ تو بہت آسان ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "تو بنائیے نا۔"

حمید احمد نے چولہا جلا کر پانی کی دیگچی اس پر رکھی۔ دودھ وہ اس سے پہلے گرم کر چکے تھے۔ وہ کافی پھینٹنے لگے۔ "تم کافی بہت اچھی بناتی ہو۔" انہوں نے ساتھ کھڑی ہوئی مدیحہ سے کہا۔

"کافی بنانا بھی ایک آرٹ ہے حمید صاحب۔"

"ہر چیز 'دنیا کا ہر کام آرٹ بھی ہے اور سائنس بھی۔" حمید احمد نے بلند آواز میں کہا۔ "فرض سمجھ کر کرو تو سائنس اور محبت سے کرو تو آرٹ۔"

"یہ بات میں سوچتی تھی۔ مگر مجھے کہنی نہیں آتی تھی۔"

"تم نے اس روز الوداعی کافی بہت مزے کی بنائی تھی۔" حمید احمد نے کافی پھینٹتے ہوئے کہا۔

"وہ آرٹ پیس تھا حمید صاحب۔ محبت سے بنائی تھی نا۔" وہ بولی۔ "دیکھئے.... پانی ابل رہا ہے۔"

حمید احمد نے چمچہ ایک طرف رکھا' دیگچی اتاری اور پیالی میں کھولتا ہوا پانی ڈالا اور چمچے سے ہلایا۔ پھر انہوں نے اس میں دودھ اور شکر ملائی۔ مگر پیالی پر نظر پڑی تو وہ مایوس نظر آنے لگے۔ پیالی میں اوپر کافی کی پھٹکیاں سی تیر رہی تھیں۔ "یہ کیا؟ شاید میں ٹھیک سے کافی پھینٹ نہیں سکا۔" وہ بڑبڑائے۔

"آپ نے ثابت کر دیا کہ کافی بنانا سائنس بھی ہے۔" مدیحہ نے کہا۔

وہ کافی کی پیالی لے کر باہر نکلے اور برآمدے کی طرف چل دیئے۔ اب جیسی بھی ہو' یہ کافی وہ پئیں گے ضرور۔ اس لئے کہ اس وقت کافی پینا ان کی ضرورت ہے۔

وہ تخت پر بیٹھ گئے۔ کمبل انہوں نے پیروں پر ڈال لیا۔ سردی کا احساس دوبارہ ہونے لگا تھا۔ مدیحہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ حمید احمد نے کافی کا گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنایا۔

"نہایت بدمزہ کافی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ یہ آرٹ پیس کیوں نہیں ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ "جب کہ آپ نے محبت سے بنایا ہو گا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کم از کم خود سے تو بہت محبت کرتے ہیں۔"

"کرتا تھا۔ اب نہیں کرتا۔ اب تو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" وہ بولے۔ "تمہارے کافی بناتا تو یہ آرٹ ہوتا۔"

"ایسی بات نہیں۔ خود سے محبت تو آپ اب بھی کرتے ہیں۔"

حمید احمد سوچ میں پڑ گئے۔ "ہاں.... شاید ایسا ہے۔ لیکن بہت عرصے سے میں الجھا ہوا ہ، کوئی کام دھیان سے 'دل لگا کر نہیں کر پاتا۔"

"آپ مجھ سے اس پر بات کریں نا۔"

"ہاں۔ کرنی تو چاہئے۔ مگر میں جھجکتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تم مجھ سے چھوٹی ہو۔ تمہارا تجربہ، تمہارا مشاہدہ کم ہے مجھ سے۔"

"درست.... لیکن جو آپ کا مسئلہ ہے 'میں اس میں سینئر ہوں آپ سے۔"

"مطلب؟"

"بات محبت کی ہے نا۔ تو مجھے تو ان تھک محبت کرتے تیرہ برس ہو گئے۔ آپ سے سینئر کہ نہیں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم آج پہلی بار آئی ہو۔ اور اگلی بار کب آؤ گی.... یا آؤ گی بھی 'اس کی ضمانت نہیں۔"

مدیحہ نے گہری سانس لی۔ "کوئی دل سے 'شدت بھری سچی طلب سے پکارے تو آدمی نہ ہوئے بھی کھنچا چلا آتا ہے۔ آج آ گئی نا میں۔"

"تم عجیب باتیں کرتی ہو۔ آدمی بس آواز دے سکتا ہے اور جسے پکارا جا رہا ہو، وہ دور.... دور ہو تو اس تک آواز پہنچتی ہی نہیں۔"

"یہ تو سائنس کی بات کر رہے ہیں آپ.... عام تعلق کی۔ میں آرٹ کے بارے میں ہی تھی.... یعنی محبت۔" مدیحہ نے کہا۔ "محبت میں تو وہ سرگوشی بھی ہزاروں میل

دور بیٹھے محبوب تک پہنچ جاتی ہے' جو آواز دینے والے کو خود بھی سنائی نہ دے۔"

حمید احمد نے اس پر چند لمحے سوچا۔ پھر بولے۔ "تو کیا محبت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟" پھ
انہوں نے وضاحت کی۔ "میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ سامنے موجود آدمی تک بھی با
نہیں پہنچائی جاسکتی۔"

مدیحہ ہنسی۔ "ہر چیز کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "محبت اس سے مستثنیٰ نہیں
اب اس سے اس محبت کو تو نکال ہی دیجئے جسے محبت کرنے والا محبت کہتا ہے۔ لیکن
رذالت ہوتی ہے' محبت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے' جیسے کوئی مورتی بنائے اور کہہ دے کہ یہ خ
ہے۔ تو وہ خدا نہیں ہو جاتی۔ بے جان مورتی ہی رہتی ہے۔ اب جو باقی بچا' اس میں محبت
دو بنیادی قسمیں ہیں۔ ایک سطحی محبت اور دوسری گہری محبت۔ پھر شدتوں کا فرق ان م
اور تنوع لاتا ہے۔ مگر جیسا کہ آپ نے کبھی تخصیص کی تھی، بنیادی قسمیں دو ہی ہیں۔
سائنس اور آرٹ۔ آدمی کسی غرض، کسی خوف یا مجبوری کی وجہ سے محبت کرے تو
سائنس ہے اور آرٹ والی محبت نہ چاہتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں آدمی کو ک
غرض نہیں ہوتی۔ مال کی.... انجام کی پرواہ نہیں ہوتی۔ بس آدمی محبت کئے جاتا ہے۔ ا
لئے یہ محبت طاقتور ہوتی ہے۔ اس کی پکار تو آسمان پر بھی پہنچ جاتی ہے۔"

"مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں۔ میں نے یہ سب دیکھا ہی نہیں...."

"میری محبت تو دیکھی ہے آپ نے۔"

"مگر تمہاری پکار تو مجھ تک کبھی نہیں پہنچی۔"

"یہ میرے ضبط کا کمال ہے۔ لیکن اس وقت کی مثال لے لیجئے۔ میں نے آپ کو گہری ن
سے جگا دیا نا۔" مدیحہ مسکرائی۔

حمید احمد حیران رہ گئے۔ "اس وقت تو میں بارش کی وجہ سے جاگا ہوں۔"

"یہ تو آپ کی توجیہہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بارش نے مجھے جگایا اور میں نے آ
کو۔"

"چلو، مان لیتا ہوں۔" حمید احمد کے انداز میں بے یقینی تھی۔ "مگر میں یہ سمجھنا چاہتا ہو
کہ میری محبت کیسی ہے۔"

"اب یہ تو آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔"

حمید احمد نے بے بسی سے سر ہلا کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے پتہ ہی نہیں
تا۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔" وہ بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ آپ بہت عرصے
الجھے ہوئے ہیں۔ کوئی کام دھیان سے، دل لگا کر نہیں کر پاتے۔ کیا الجھن ہے آپ کو؟"

"الجھن یہ ہے کہ جب پہلی بار تم سے بات ہوئی تو مجھے تم پر رشک آیا۔ اس لمحے میں نے
وقت دو خواہشیں کیں۔ ایک یہ کہ کوئی تمہاری طرح کی محبت مجھ سے کرتا۔ دوسری یہ
تمہاری جیسی محبت میں کسی سے کروں۔ اس دوسری خواہش کا سبب وہ خوب صورت
ات تھیں' جن سے تم گزر رہی تھیں۔" حمید احمد نے گہری سانس لی۔ "خوش قسمتی سے
ی دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔ لیکن مجھے الجھنوں اور بے سکونی کے سوا کچھ نہیں ملا۔"

"دیکھیں حمید صاحب! اپنے لئے میری محبت تو آپ نے قبول نہیں کی۔"

"مجھے اعتراف ہے اس کا۔ میں نے تمہاری محبت کی ناقدری کی۔ پانچ سال تک کرتا رہا۔
پھر میں نے اسے قبول کر لیا...."

"عنایت ہے آپ کی۔"

حمید احمد شرمندہ ہو گئے۔ "نہیں میں نے سچ مچ اسے قبول کر لیا۔ مگر مجھے وہ خوشی نہیں ملی
ملنی چاہئے تھی۔ اس تبدیلی کو آٹھ سال ہو گئے۔ لیکن مجھے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں
"

"شاید اس لئے کہ میری محبت اب آپ کے پاس نہیں۔" مدیحہ نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" حمید احمد پریشان ہو گئے۔ "کیا اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟"

"خوب سوچ کر بتائیے' اس بات کی کوئی اہمیت ہے آپ کے نزدیک؟" مدیحہ نے جواب
بھی سوال کر ڈالا۔

"بہت اہمیت ہے۔ میں تمہاری محبت سے محرومی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" حمید احمد نے
کر کہا۔ "اس محرومی کے امکان نے ہی تو مجھے تمہاری محبت کی آگہی دی تھی۔ ورنہ تو
ساری عمر پتہ نہ چلتا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اور اگر آپ میری محبت سے محروم ہو گئے تو؟"

"تو میں ساری زندگی بہت زیادہ ناخوش رہوں گا۔"

"اور آپ مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے؟"

اب خاموشی کا طویل وقفہ تھا۔ حمید احمد سوچ رہے تھے.... خود کو ٹٹول رہے تھے۔ جواب بہت آسان تھا۔ سامنے تھا۔ لیکن وہ بہت سچائی کے ساتھ اس سوال کا جواب دینا چاہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "نہ تو یہ میرے اختیار میں ہے۔ نہ ہی یہ ممکن ہے۔ میں ترکِ محبت نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود کہ اس کے صلے میں آپ کو الجھنوں اور بے سکونی کے سوا کچھ نہیں ملا ہے۔" مدیحہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس کے باوجود بھی میں تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ اس نے مجھے یہ قیمتی احساس دیا ہے کہ میں نے زندگی میں کچھ کیا ہے۔ اسے ایک طرف ہٹا کر دیکھوں تو احساس ہوتا ہے کہ میری عمر رائیگاں ہی گئی۔ یہی ایک ACHIEVEMENT تو ہے میرے پاس۔"

مدیحہ کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔ اور اس سے سچی خوشی جھلک رہی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "آپ میری محبت سے محروم کبھی نہیں ہو سکتے۔ وہ جو میں نے کہا کہ اب میری محبت آپ کے پاس نہیں، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے میں آپ کے سامنے ہوتی تھی تو آپ کو میری محبت کا احساس رہتا تھا۔ اب پچھلے بارہ برس سے ہمارے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں۔ تو آپ کو اس پر یقین نہیں رہا ہو گا۔ ایسے میں خوشی کہاں سے ملے گی۔"

"یہ بات نہیں۔ مجھے یقین رہا...."

"آپ نے خود کہا کہ محرومی کے امکان نے ہی آپ کو محبت کی آگہی دی تھی۔ تو محبت سے محرومی کا.... میری محبت ختم ہو جانے کا خوف تو آپ کے اندر موجود تھا اور جہاں خوف ہو، وہاں یقین کامل تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ تم مجھے سمجھاؤ۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ میری محبت کیا ہے۔ کیسی ہے؟" حمید احمد گھگیائے۔ اس لمحے ایک احساس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بارش کا وہ یادگار دن الٹ گیا ہے، جب مدیحہ نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا تھا۔ اس وقت وہ رہنما تھے اور اب مدیحہ رہنمائی کر رہی تھی۔ اب وہ جونیئر تھے.... شاگرد تھے.... اور وہ سینئر تھی.... استاد تھی۔

دیحہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "آپ کو چاہئے کہ اپنی محبت کو جانچیں اور میری ے بارے میں خود کو ٹٹولیں۔"

کیسے؟"

یہ تو طے ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ورنہ آپ یہ نہ کہتے کہ میں آپ سے کرنا چھوڑ بھی دوں، تب بھی آپ مجھ سے محبت کرنا نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے کہ یہ آپ کی عمر بھر کی واحد کمائی ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ "مگر اس محبت کو سمجھنا بہت ضروری ہے یہ سطحی ہے یا گہری ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھی خود سے محبت کی ایک شکل ہو۔"

"تمہیں نہیں معلوم.... کچھ بھی نہیں معلوم۔" حمید احمد نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "اس بت کی سچائی اور گہرائی کے لئے کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ اس کی خاطر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا میرا پروفیشن میرے لئے بہت بڑی چیز تھا۔ میں نے اس محبت کی خاطر اسے چھوڑ دیا۔"

"یہ طاقت ور دلیل نہیں حمید صاحب۔ وہ مسئلہ آپ کی ذات کا! آپ کی HONESTY کا تھا۔" مدیحہ نے اعتراض کیا۔

"اور مجھے کچھ اور نہیں آتا تھا پڑھانے کے سوا۔ میں نے محنت مشقت کی، جو میں کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کتابوں کی بھاری گٹھری اٹھا کر گلی گلی آوازیں لگا کر کتابیں بیچتا پھرا۔ میرے کندھوں پر گٹے پڑ گئے تھے۔ پاؤں میں چھالے تھے۔ کیا یہ میری سچائی کا ثبوت نہیں؟"

مدیحہ اس جواب سے متاثر نظر آئی۔ "کیا پتہ، آپ خود کو اس حماقت پر سزا دے رہے تھے، جسے محبت کہتے ہیں۔"

"نہیں، میں ہنسی خوشی وہ کام کر رہا تھا۔ مجھے زندگی کی سب سے بڑی، سب سے سچی خوشی اس کام میں ملی۔"

"اور آپ پھر بھی ناخوش ہیں؟" مدیحہ نے اعتراض کیا۔

"وہ اور بات ہے۔ میں اس لئے ناخوش ہوں کہ مجھے محبت کی وہ کیفیتیں نہیں ملیں، جو محبت نے تمہیں دی تھیں۔"

"اور ہم اسی کی وجہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی کمی تو ہو گی نا۔" مدیحہ نے کہا۔ "بھلا یہ بتائیں، آپ محبت میں چاہتے کیا ہیں؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟" حمید احمد نے دہرایا۔ "یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔ میں وہ سرشاریاں،

وہ خوب صورت کیفیتیں چاہتا ہوں جو تمہیں ملی تھیں۔"

"وہ تو باطن کی بات ہوئی نا۔ مادی بات کریں۔ آپ مجھ سے شادی کے بارے میں سوچے ہیں؟"

"سوچتا تھا۔ ابتدا میں سوچتا تھا۔ اب نہیں سوچتا۔"

"کیوں؟"

"دیکھو' اس وقت بھی میری عمر کم نہیں تھی۔ میں چوالیس سال کا تھا اس وقت۔ مگر اب بات اور ہے اب میں پچاس سے اوپر ہوں۔ میرا بیٹا جوان ہو چکا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میرا بیٹا کیا کہے گا۔"

"اوہ.... وہی معاشرے کی بات۔" مدیحہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اب میں مل جاؤں تو؟"

"میں نے اس پر سوچا نہیں۔ اس کا امکان بھی نہیں۔"

"تو آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں.... میں تم سے اعتراف محبت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ آج تک قرض ہے مجھ پر۔"

"یہ تو انا والی بات ہے۔ اس سے جو خوشی ملے گی' وہ عارضی ہو گی۔ اگر ملنے کے بعد آپ مجھ سے محبت نہ کر سکیں تو خوشی کہاں سے آئے گی۔ اچھا.... ایک بات بتائیں۔ کسی محفل میں آپ کو میں نظر آ جاؤں تو آپ کیا کریں گے؟ میری طرف لپکیں گے؟ سچ سچ بتایئے گا۔"

حمید احمد سوچ میں پڑ گئے۔ وہ اس صورتِ حال کو تصور میں دیکھ رہے تھے۔ "نہیں۔ میں تم سے نظریں چراؤں گا۔ ہاں' اکیلے میں تم سے ملنے کی کوشش شاید کروں۔"

"شاید؟" مدیحہ نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ "شاید کیوں؟ آپ کو اعتراف محبت کا قرض اتارنے کی فکر نہیں ہو گی۔"

"اس کے لئے تو میں نے خط لکھا ہے۔" حمید احمد نے وضاحت کی۔

"تو آپ لوگوں کے بیچ میں مجھ سے ملنے' مجھ سے بات کرنے کے لئے نہیں تڑپیں گے؟"

"ہو سکتا ہے کہ تڑپ ہو۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔ میں خود کو تماشا بنانے سے ڈرتا ہوں۔"

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی محبت گہرائی سے محروم ہے۔ ورنہ آدمی یہ سب کچھ سوچ نہیں سکتا۔ دیکھیں' آپ بے خودی اور سرشاری چاہتے ہیں۔ وہ دماغ سے سوچنے والے کو نہیں مل سکتی۔ بے خودی اور سرشاری ہو تو آپ سب کچھ بھول کر میری طرف لپکیں آپ کو احساس ہی نہیں ہو گا کہ وہاں کتنے لوگ ہیں.... کون کون ہے۔" وہ کہتے کہتے "اب خود سوچئے کہ آپ میری محبت والی کیفیتوں کی سطحی طلب میں مبتلا ہیں۔ آپ کی میں سچائی نہیں تو پھر وہ پوری کیسے ہو گی۔ آپ تو بس اپنے اعتراف کا بوجھ اتارنا چاہتے آپ اب بھی اس محبت کو اچھا نہیں سمجھتے.... نہ میری محبت کو نہ اپنی محبت کو۔ کیونکہ کے خیال میں وہ آپ کو تماشا بنا دے گی۔ یہ ہے آپ کا مسئلہ۔"

"یہ سب کچھ گہرائی میں' بہت سچائی کے ساتھ سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ آپ درحقیقت کیا ہتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔"

"کیوں؟ رکو نا۔"

"نہیں' اب جاؤں گی۔ بارش بھی رک گئی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "آپ نے اپنے اور میرے ای ایک موسم کا رشتہ تو رکھا ہے۔ موسم ختم، تعلق ختم۔ ہاں ایک اور بات تو پوچھ لوں۔ تائیں آپ اس وقت میں آپ کو خوشی ملی؟"

یدا احمد بھی مسکرائے..... "بہت زیادہ۔"

"تو یہ تو بہت آسان ہے۔ مجھے بلا کر باتیں کر لیا کیجئے۔ اس میں تماشا بننے کا ڈر بھی نہیں ہو ر آپ خوش بھی رہیں گے۔"

"مگر کیسے بلاؤں؟"

"پکارتے رہا کیجئے۔ پکار میں جب بھی سچائی ہوئی' میں آ جاؤں گی۔"

وہ غائب ہو گئی۔ حمید احمد پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ مدیحہ کی کو یاد کر رہے تھے اور اس کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆

کلاسیں شروع ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ وحید پر بات پوری طرح کھل چکی تھی۔ عجیب بات یہ لگتی تھی کہ اسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس وہ پڑھائی کی طرف سے فکر مند تھا بری طرح سے متاثر ہوئی تھی۔ یہ اس کے لئے بڑی بات تھی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے پڑھائی

پر توجہ دینے والا رہا تھا، مگر اب وہ بے بس ہو گیا تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ اس کے لئے ڈاکٹر جبیں کے چہرے کے سوا کوئی چیز نہیں تھی جس پر ارتکاز اس کے بس میں ہوتا۔ کلاس میں تمام وقت وہ انہیں تکتا رہتا تھا۔ لیکن ایک بات تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں نہیں دیکھتا تھا اور دیکھتا بھی تو گہرائی میں جانے سے پہلے ہی نظر ہٹا لیتا۔ اس ممنوعہ گہرائی تک جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کبھی وہ اس بات پر سوچتا تو یہی سمجھ میں آتی کہ وہ ڈاکٹر جبیں کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ اور یہ مثبت بات تھی۔ اس کے نزدیک یہ محبت کی سچائی تھی۔ محبت ہی تو سب سے زیادہ احترام سکھاتی ہے۔

فقہ کو چھوڑ کر دوسرے مضامین میں اس کی پڑھائی ٹھیک چل رہی تھی۔ دوسری کلاسوں میں وہ بڑی توجہ سے سنتا' سوال اٹھاتا اور بہتر طور پر سمجھتا۔ ابتدا میں اس نے سوچا کہ فقہ کی کلاس میں جو توجہ کی کمی ہے' وہ اسے گھر پر پڑھائی کے ذریعے دور کر لے گا۔ لیکن یہ نہیں ہو سکا۔ وہ ارتکاز سے محروم ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ ارتکاز قائم کرنے کی کوشش کرتا' ڈاکٹر جبیں کا چہرہ اس کے سامنے آجاتا اور یوں آتا کہ دھکیلنے کے باوجود نگاہ سے نہ ہٹتا۔ ایک اسی معاملے میں تو ارتکاز رہ گیا تھا۔

مگر یہ عجیب بات تھی۔ وہ بہت زیادہ پریشان نہیں تھا۔ بلکہ معاملہ برعکس تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش رہنے لگا تھا۔ اور وہ اندر کی خوشی تھی.... ایسی خوشی، جس پر اس کا قابو نہیں تھا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ کب وہ گنگنا رہا ہے۔

ایک دن دادی نے اسے گنگناتے ہوئے پکڑ لیا۔ "یہ کیا گنگنا رہا ہے بچے؟"

وہ گڑبڑا گیا۔ "پتہ نہیں دادی۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں۔" دادی نے اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آدمی گنگنائے اور اسے پتہ بھی نہ ہو کہ وہ گنگنا رہا ہے اور کیا گنگنا رہا ہے۔"

"آپ تو بس یونہی...." وہ بلا ارادہ نظریں چرانے لگا۔

"آج کل بہت خوش نظر آرہا ہے تو۔" دادی کی ایکس رے کرنے والی نگاہیں بدستور کام کر رہی تھیں۔

اسے موقع مل گیا۔ اس نے سوکھا سا منہ بنایا اور بولا۔ "آپ کو برا لگا ہے تو اب خوش نہ رہنے کی کوشش کروں گا۔"

دادی نے پیار سے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔ "بدمعاش کہیں کا۔ جانتا ہے کہ تجھے خوش دیکھنے کے لئے تو میں جیتی ہوں۔ میں تو بس خوشی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"خوشی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی دادی۔"

"ہاں' ایسا بھی ہوتا ہے۔" دادی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے بڑی سادگی سے ایک بڑی بات کہہ دی۔ "اور جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی بہت بڑی اور مبارک وجہ ہوتی ہے خوشی کی۔ آدمی کو خود معلوم ہو یا نہ ہو۔"

"یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات بتائی دادی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "اب میں وہ بہت بڑی اور مبارک وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر ایک دن وہ کتاب سامنے رکھے بیٹھا تصور میں ڈاکٹر جبیں کے چہرے کو تک رہا تھا۔ دادی چائے لے آئیں۔ مگر اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ دادی نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور لہجے میں کہا۔ "یہ تو بہت کھویا کھویا رہنے لگا ہے آج کل۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور دادی کو دیکھا۔ "آپ کو مجھ سے بہت شکایتیں رہنے لگی ہیں آج کل۔" اس نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔ "اس روز وہ خوش رہنے کی شکایت کی اور آج
"

دادی اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ "ٹال مت۔ سچ سچ بتا۔ کہاں کھویا رہتا ہے ہر وقت؟"

"پڑھائی میں دادی۔ آپ جانتی تو ہیں۔"

"پڑھائی میں کھویا ہوا دیکھتے تو عمر گزر گئی میری۔" دادی نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ وہ نک نہیں ہے۔ کیا میں بچہ ہوں۔ جانتی نہیں ہوں۔"

"بھئی یہ کتاب سامنے میز پر رکھی ہے' جو میں پڑھ رہا ہوں۔"

"کتاب کھلی ہوئی ضرور ہے۔ لیکن تیری نظر کتاب پر نہیں تھی۔"

"آپ کو وہم ہوا ہے دادی۔ میں سچ مچ پڑھ رہا تھا۔"

"جھوٹ۔ سچ بتا' بات کیا ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں دادی۔" وہ جھنجلا گیا۔

"پریشان ہوں میرے دشمن۔" دادی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو خوش ہوئی ہوں یہ کر۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "خوش ہوئی ہیں۔ لیکن کیوں؟"

"یہ اچھی علامت ہے بڑھی دادی کے لئے۔ پوتے کھوئے کھوئے رہنے لگیں تو بہو کے.... ننھے منے بچوں کے خوابوں کی تعبیر قریب نظر آنے لگتی ہے۔ اسی دن کے لئے تو جی رہی ہے تیری دادی۔" اچانک دادی کے لہجے میں خوشامد آ گئی۔ "دیکھ، کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے تو مجھے بتادے۔ میں تیری شادی کراؤں گی۔"

"دادی۔ ابھی تو دو سال ہیں میری پڑھائی مکمل ہونے میں۔" اس نے بڑی ہشیاری سے گفتگو کا رخ بدلا۔ "پھر اس کے بعد کچھ کرنا بھی ہے۔ تب کہیں شادی کی باری آئے گی۔"

"چاہے اتنے عرصے میں دادی محروم ہی چلی جائے۔" دادی کی آواز بھرا گئی۔

"بری باتیں مت کیا کریں دادی۔" اس نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دیکھو بیٹے' تیرے کرنے کی کچھ اہمیت نہیں۔ یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔" دادی نے بڑی محبت سے کہا۔ "اور پڑھائی شادی کے بعد بھی مکمل ہو سکتی ہے۔ مجھے بہو کا بڑا ارمان ہے بچے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "تو آپ ابو سے بات کریں۔"

اب ٹریک بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ "وہ کہاں سنتا تھا میری۔ اور جب اس نے مانا تو مقدر ہی پھر چکا تھا۔" دادی نے افسردگی سے کہا۔

دادی چلی گئیں۔ وہ پھر اپنی پڑھائی میں.... یعنی ڈاکٹر جبیں کے چہرے میں کھو گیا۔

☆

ڈاکٹر جبیں اس لڑکے وحید کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ وہ خواہ مخواہ ان کے لئے آزمائش بن گیا تھا۔ یونیورسٹی جوائن کرتے وقت انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کا اس طرح کے مسئلے سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ وہ ان کی کلاس کے دوران میں تمام وقت ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتا رہتا تھا۔ بس اچھی بات یہ تھی کہ اس کی نگاہوں میں آلودگی نہیں تھی' معصومیت ہوتی تھی اور کئی بار انہوں نے لیکچر کے دوران میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس نے ہر بار نظریں جھکا لیں۔ اس سے ڈاکٹر جبیں کو یہ خیال ہوا کہ انہیں بدگمانی ہوئی ہے۔ اسٹوڈنٹ اپنے کسی ٹیچر کو آئیڈیل بھی تو بنا لیتے ہیں۔ نوجوانی میں پرستش کا جذبہ تو بہت شدید ہوتا ہے۔ لیکن نسوانی وجدان انہیں تنبیہ

رتا تھا کہ یہ معاملہ بے ضرر نہیں، اتنا معصوم نہیں۔ چنانچہ وہ پریشان تھیں۔

مگر وہ لڑکا تھا بہت اچھا۔ وہ انہیں پہلی نظر میں بھا گیا تھا۔ ایسے برائٹ اور سنجیدہ طبیعت ے سٹوڈنٹ کم ہی نظر آتے ہیں۔ انہیں اس بات نے اور زیادہ متاثر کیا تھا کہ اسے اپنی پڑھائی میں بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اس نے بڑی سنجیدگی سے اس کے لئے پلاننگ کی تھی۔ سلامک اسٹڈیز میں ایم اے کتنے لوگوں نے کیا ہو گا۔ لیکن ان میں کتنے ایسے ہوں گے' ہنوں نے اس مضمون کو اچھی طرح سمجھنے' اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے پہلے عربی ں ایم اے کیا ہو گا۔ یہ ہوتی ہے علم سے محبت۔ اس لڑکے کے پیش نظر یہ نہیں تھا کہ تعلیم ے بعد اسے اس سے کتنے مادی فائدے ہوں گے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی طرح اس ڑکے کا بھی ایک مشن ہے وہ کچھ کرنا چاہتا ہے.... شاید وہی جو وہ کرنا چاہتی ہیں۔ اس اعتبار ے وہ ان کے چراغ کے ساتھ روشن ہونے والا دوسرا چراغ تھا۔ انہیں تو وہ اچھا لگنا ہی تھا۔

اور وہ بہت خوب صورت اور وجیہہ بھی تھا۔ یہ بات وہ بالکل عام اور حقیقت پسندانہ انداز ں کہہ سکتی تھیں۔ یہ کوئی ذاتی رائے نہیں تھی۔ کیونکہ برسوں سے ڈاکٹر جبیں نے کسی مرد و عورت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا' تو وہ وحید ان کے لئے محض ایک اسٹوڈنٹ تھا لیکن امنے کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک بے حد پرکشش مرد ہے۔ کلاس کی لڑکیوں کی نظریں اور رزِ عمل ان کے اندازے کی تائید کرتا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ لیکن وحید کا طرزِ عمل نہیں بدلا۔ ڈاکٹر جبیں نے سوچا کہ اس سلسلے میں اس سے بات کریں۔ وہ معقولیت پسند لڑکا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اس سے بات کرنے کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا لیکن وہ جھجکتی تھیں۔ سوچتی تھیں کہ کیسے بات کریں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ اس کا موقع انہیں مل جائے گا۔ انہیں یقین تھا کہ کلاس میں وحید نے کبھی ان کا لیکچر دھیان ے نہیں سنا ہے۔ اور اب ماہانہ ٹیسٹ ہونے والا تھا۔ اس میں اس طرزِ عمل کا نتیجہ سامنے آتا اور اس بہانے وہ اس سے بات کرتیں۔ اسے جتاتیں کہ اسے کلاس میں اول آنا چاہئے۔ یونکہ وہ سب سے بہتر ہے۔

لیکن پہلے ماہانہ ٹیسٹ کے پرچے نے انہیں حیران کر دیا۔ وہ سب سے بہتر ثابت ہو گیا تھا اور یہ جب تھا کہ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف نہیں تھی۔ اب وہ اس سے کیسے بات کر کتی ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اس بار اس کی پہلے سے تیاری ہو گی۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے۔ اگلے

ٹیسٹ کا رزلٹ انہیں یہ موقع ضرور دے گا۔

اگلے ٹیسٹ میں وحید کی کمی سامنے آئی۔ لیکن وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس کی بنیاد پر بات کی جا سکتی۔ اس بار وہ کلاس میں سیکنڈ تھا۔ اس کے مارکس میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی۔ بس ہوا یہ تھا کہ کلاس کی ایک لڑکی اس سے آگے نکل گئی تھی۔

اور وحید کے تکے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ اچھا تھا کہ کلاس میں پڑھائی پر توجہ دینے والوں کی اکثریت تھی۔ اور وحید سب سے آگے بیٹھتا تھا۔ اس لئے ابھی تک کسی کو اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا پھر ڈاکٹر جبیں کے پاس ایک ہتھیار بھی تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ وحید ان سے نگاہیں ملانے سے گریز کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لیکچر کے دوران میں اس پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ وقتی علاج تو تھا لیکن انہیں ڈر تھا کہ لڑکا اسے اپنی حوصلہ افزائی نہ سمجھ لے۔

ڈاکٹر جبیں کو صرف وحید سے بات شروع کرنے کے معاملے میں جھجک تھی۔ اس کے بعد تو انہیں اعتماد تھا کہ وہ اسے بہت اچھی طرح ہینڈل کر لیں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ انہیں کیا کہنا' کیا کرنا اور کس طرح سمجھانا ہے۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ بات کیسے شروع کریں۔

اس روز کلاس ختم ہوئی تو انہوں نے وحید کو پکار لیا۔ وحید کے ہاتھ میں موجود کتاب اس کا سبب بنی تھی۔ وحید ان کے پاس چلا آیا۔ ''جی میڈم؟''

''یہ کتاب لائبریری کی ہے؟'' ڈاکٹر جبیں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''ابھی ایشو کرائی ہے؟''

''جی نہیں۔ پڑھ لی ہے۔ آج واپس کرنی ہے۔ ابھی ایک کلاس ہے۔ اس کے بعد واپس کر دوں گا۔'' وحید نے جواب دیا۔ ڈاکٹر جبیں ہچکچانے لگیں۔

''آپ کو ضرورت ہے تو لے لیجئے۔'' وحید نے کہا۔

''تم واپس کرو گے تو لے لوں گی۔ ابھی تو تمہیں کلاس اٹینڈ کرنی ہے۔'' اچانک ڈاکٹر جبیں کو کچھ خیال آ گیا۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ہاں.... یہ ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم یہ کتاب مجھے دو۔ میں لائبریری جا کر اسے اپنے نام پر ٹرانسفر کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میرا کارڈ لے کر اپنے پاس رکھ لیجئے گا۔ میں آپ سے لے لوں گا۔''

''شکریہ وحید۔''

''شکریئے کی کوئی بات نہیں میڈم۔''

وحید کلاس اٹینڈ کرنے چلا گیا۔ ڈاکٹر جبیں لائبریری چلی گئیں۔ انہوں نے کتاب اپنے نام لکھوائی اور وحید کا کارڈ لے لیا۔ ایک گھنٹے بعد وحید اپنا کارڈ لینے کے لئے آیا تو وہ کسی کتاب میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اوہ.... تم آ گئے۔ اتنا وقت گزر گیا؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''جی۔ کتاب پڑھتے ہوئے وقت کا کہاں پتہ چلتا ہے۔'' وحید مسکرایا۔

ڈاکٹر جبیں نے اپنے بیگ میں سے کارڈ نکالا۔ اس وقت پہلی بار ان کی نظر کارڈ میں درج کوائف پر پڑی۔ کارڈ ہاتھ میں لئے لئے انہوں نے بہت غور سے وحید کو دیکھا۔ ''تمہارے والد کا نام حمید احمد ہے؟'' انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں میڈم۔''

''کیا کرتے ہیں۔''

''ناظم آباد والے اُردو بازار میں کتابوں کی دکان ہے ہماری۔''

ڈاکٹر جبیں کی نگاہوں میں کوئی عجیب سی کیفیت جھلکی.... مایوسی جیسی۔ ''اوہ....'' انہوں نے کارڈ وحید کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو اپنا کارڈ۔ ایک بار پھر شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں میڈم۔''

اس وقت ڈاکٹر جبیں کو خیال آیا کہ یہ اس سے بات کرنے کا اچھا موقع ہے۔ لیکن پھر وہی مسئلہ آڑے آ گیا۔ بات وہ کیسے شروع کریں گی۔ ماہانہ ٹیسٹ میں مارکس کم ہوتے تو وہ اس بارے بات کر سکتیں تھی۔ مگر اب کیسے کریں۔

انہوں نے ہاتھ میں آئے ہوئے اس لمحے کو ہاتھ سے پھسل جانے دیا۔

☆

حمید احمد سونے کے لئے لیٹے لیکن معمول کے مطابق نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ عام طور پر ان کا یہ وقت کروٹیں بدلتے گزرتا تھا۔ مگر اس روز وہ مدیحہ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ پچھلی بار بارش والی رات میں انہوں نے تصور میں اس سے جو گفتگو کی تھی' وہ ان کے لئے ایک نیا اور یقینی طور پر خوب صورت تجربہ تھا۔

تصور کی دنیا کے تو وہ آدمی ہی نہیں تھے اور جو کچھ وہ تصور کے بارے میں جانتے تھے، یہ تجربہ اس سے بہت مختلف تھا۔ تصور میں تو یہ ہوتا ہے ناکہ آدمی خیالوں میں کسی کو دیکھتا' کسی سے باتیں کرتا ہے۔ مگر اس رات مدیحہ تو سچ مچ ان کے قریب.... بہت قریب موجود تھی اور وہ جیتی جاگتی مدیحہ تھی۔ بس وہ اسے چھو نہیں سکتے تھے اور کون جانے' چھو بھی سکتے ہوں۔ انہوں نے کوشش ہی کب کی تھی چھونے کی۔ لیکن نہیں.... انہوں نے کافی کی پیالی اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا.... اور پھر مدیحہ بھی غائب ہو گئی تھی اور ٹرے بھی۔ بہر حال جو بھی ہو، وہ جیتا جاگتا منظر تھا۔

اور پھر اس سے ہونے والی گفتگو! انہوں نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا تھا۔ وہ اس پر بات کرتی رہی تھی اور اس نے کیا کیا کہا تھا.... اس نے کہا تھا.... جہاں خوف ہو، وہاں یقین کامل تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے کہا تھا.... آپ کی محبت گہرائی سے محروم ہے۔ آپ بے خودی اور سرشاری چاہتے ہیں۔ وہ دماغ سے سوچنے والے کو مل ہی نہیں سکتی اور اس نے مشورہ دیا تھا.... یہ سب کچھ گہرائی میں' بہت سچائی کے ساتھ سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ آپ درحقیقت کیا چاہتے ہیں۔

اور اب وہ اس پر سوچ رہے تھے۔ وہ پوری سچائی کے ساتھ سوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بات تو سچی ہے۔ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ بے خودی اور سرشاری کی خواہش کرتے ہیں اور دماغ سے سوچتے ہیں۔ بے خودی تو وہ کیفیت ہوتی ہے' جب آدمی کو ہوش ہی نہیں ہوتا اور

ہوش نہیں ہوگا تو آدمی کو معاشرے کا.... دوسرے لوگوں کے غلط سوچنے کا ڈر کیسے ہوگا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ بے خودی میں تو آدمی کو کان کے پاس ہونے والا شور سنائی نہیں دیتا۔ کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ سوچنا تو یہ ہے کہ انہیں بے خودی کی ضرورت بھی ہے.... اس کی سچی طلب بھی ہے۔ وہ تو ہر وقت یہ فکر کرتے ہیں کہ ایسا کریں گے تو لوگ کیا سوچیں گے۔ انہیں تو یہ پریشانی رہتی ہے کہ یہ بات معیوب ہے اور یہ مستحسن۔ معاشرے کا اچھا فرد بننے کے لئے یہ کرنا چاہئے اور یہ نہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ بے خودی کیا ہے۔ انہوں نے تو بس سنا اور اس کی خواہش کر بیٹھے۔ انہوں نے نہیں سوچا کہ اگر انہیں بے خودی اور سرشاری مل جائے تو وہ کیا کریں گے۔ وہ جو بھی کریں گے' سوچ سمجھ کر نہیں کریں گے اور جو کچھ وہ کریں گے' وہ معیوب بھی ہو سکتا ہے۔ تو کیا اس صورت میں اس سے انہیں خوشی ملے گی؟

وہ اس پر سوچتے اور الجھتے رہے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اتنے خطرناک سوال اٹھانے کے بعد بھی بے خودی اور سرشاری کی طلب ان کے اندر اسی شدت سے موجود تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ طلب سچی ہے اور وہ سچی ہے تو ان کی محبت کی طلب سچی ہے۔ لیکن اس کے تحت وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے' جو ان کے وقار کے منافی ہو۔ جبکہ وہ بے خود اور سرشار ہوں تو ایسا کچھ بھی کر گزریں گے اور انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اب کر گزرنے کے بعد ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اس کا وہ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ تو ایسا کچھ ہونے کے بعد ہی چل سکتا ہے اور ایسا کچھ ہونے کا انہوں نے تصور بھی کیا تو بس جھرجھری لے کر رہ گئے۔

بڑی الجھی ہوئی صورتِ حال تھی۔ کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ مدیحہ کی بات سنگین شکل اختیار کر گئی تھی۔ کیا ان کی محبت واقعی گہرائی سے محروم ہے؟ کیا وہ سطحی ہے؟ بے خودی اور سرشاری کا تعلق گہرائی سے ہے؟ وہ دماغ کو معطل کر دیتی ہے؟ تمام حسیات پر چھا جاتی ہے؟ تو کیا اس صورت میں بھی انہیں بے خودی اور سرشاری چاہئے؟ لطف کی بات یہ تھی کہ اس سوال کا جواب بھی ہاں میں تھا۔

انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت الجھے ہوئے آدمی ہیں اور الجھے ہوئے آدمی کو الجھنیں نہیں ملیں گی تو اور کیا ملے گا۔ پھر الجھنوں کی شکایت کیسی۔ مدیحہ نے کہا تھا کہ وہ محبت کو اچھا نہیں

سمجھتے۔ نہ اس کی محبت، نہ اپنی محبت کو۔ وہ تو ان کے نزدیک دنیا کے سامنے شرمندہ کرانے والی چیز ہے اور یہ سچ ہی ہے۔ ورنہ وہ تماشا بننے سے کیوں ڈرتے اور جب وہ محبت کو اچھا ہی نہیں سمجھیں گے تو انہیں محبت کا پھل کیسے ملے گا۔

ان کی سمجھ میں آگیا کہ محبت آدمی کے گمان کے مطابق ہوتی ہے۔ محبت ان کے نزدیک ببول کے درخت کی طرح تھی اور وہ توقع کر رہے تھے کہ اس درخت سے انہیں شیریں اور خوش ذائقہ پھل ملیں گے تو یہ ان کی نادانی تھی۔ یہ بات خلافِ فطرت ہے اور مدیحہ کو محبت نے بہت کچھ دیا تھا' جس کی وجہ سے انہوں نے حرص کی تھی۔ تو مدیحہ اپنی محبت کو جنت کا درخت بھی تو سمجھتی تھی۔ اسے تو پھل ملنے ہی تھے۔ مگر وہ محض حریص تھے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ جب وہ کسی جذبے کو عزت نہیں دیں گے' لائق عزت واحترام نہیں سمجھیں گے تو وہ انہیں کیا دے گا۔ کچھ بھی نہیں۔ صرف حرص کرنے سے کچھ بھی نہیں ملتا۔

مگر شاید وہ ہر اعتبار سے ایک منقسم آدمی تھے۔ انہیں یاد تھا کہ جب مدیحہ نے انہیں اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے اسے قابل فخر جذبہ قرار دیا تھا۔ لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے تو وہ ان کے لئے قابل قبول نہیں رہی۔ لیکن نہیں.... اس کی وجہ اور تھی.... ان کا پروفیشن اور عمر کا فرق۔ ورنہ انہوں نے نہ تو کبھی مدیحہ کو برا سمجھا اور نہ اس کی محبت کو۔ بس اس میں خرابی یہ تھی کہ ان کے لئے نہیں تھی۔

تم نے مجھے اور الجھا دیا مدیحہ۔ وہ بلند آواز میں بڑبڑائے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ جو میں چاہتا ہوں' اسے پوری شدت سے رد بھی کرتا ہوں۔ میں کیا کروں مدیحہ؟

پھر نجانے کیا ہوا۔ ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ بغیر کسی آواز کے دل ہی دل میں مدیحہ کو پکارتے رہے۔ یوں کہ باہر کوئی آواز نہیں تھی لیکن ان کے اندر بس وہ پکار ہی گونجے جا رہی تھی اور پھر اچانک انہوں نے مدیحہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ آئی اور ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم.... تم کیسے....؟" وہ گڑبڑا گئے۔

وہ مسکرائی۔ "آخر آپ نے بلا ہی لیا۔"

"میں نے....؟ میں نے....! نہیں تو۔" وہ اب بھی حیران تھے۔

مدیحہ شوخی سے مسکرائی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ کو بے خودی بھی مل گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ نے مجھے اتنی شدت سے پکارا کہ مجھے آنا پڑا اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ بے خودی ...کیا ہوتی ہے۔"

"میں نے تمہیں پکارا تو نہیں۔" حمید احمد نے جلدی سے کہا۔ "میں نے تمہیں آواز نہیں ...ہاں دل ہی دل میں تمہارا نام لے رہا تھا۔"

"آواز کا والیوم تو محدود ہوتا ہے۔ آواز بہت دور تو نہیں جا سکتی۔ لیکن دل کی گہرائی سے ...ائی اور شدت سے دی جانے والی صدا کے والیوم کی اور اس کی پہنچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ آسمان پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ دیکھ لیں' آپ نے پکارا اور میں آگئی۔

حمید احمد اب گنگ بیٹھے تھے۔ بس وہ اسے تکے جا رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟ ایسے چپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟"

"میں حیران ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ...."

"ایسا ہوتا ہے۔ یہی تو ہوتا ہے۔ محبت چپکے سے ہو جاتی ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا۔ پھر ...ت کو شدت بھی چپکے سے مل جاتی ہے اور اس کے بعد بے خودی بھی.... اور پتا ہی نہیں ...ا۔ ہاں' اس کے بعد سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے۔"

"واقعی.... مجھے بھی سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔" حمید احمد کے لہجے میں مسرت تھی۔

"اچھا' یہ بتائیں' آپ کیا کر رہے تھے؟" مدیحہ نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے تھے؟"

"وہی.... محبت کے بارے میں۔ میں کیوں محروم رہ گیا۔ میرے اندر دودلی کیوں ہے۔ ...ری محبت گہرائی سے محروم کیوں ہے۔"

"چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ صرف محبت کے بارے میں سوچا کریں۔ خامی خود دور ہو ...ئے گی۔ پھر آپ کو سب کچھ مل جائے گا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"مجھ سے اچھی اچھی باتیں کریں۔ یہ بتائیں، آپ کو کن باتوں سے، کن چیزوں سے خوشی ...ہے۔ خوشیوں کی باتیں کیا کریں، خوشیوں کے متعلق سوچا کریں۔ اس سے بھی آدمی کو

خوشی ملتی ہے۔ مگر یہ بتائیں' آپ اب تک جاگ کیوں رہے ہیں۔ سوئے کیوں نہیں؟"

"یہ تو روز کا معمول ہے۔" حمید احمد نے آہ بھر کے کہا۔ "کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ نیند آتی ہی نہیں اور نیند آئے بھی تو پرسکون' اچھی نیند نہیں ہوتی۔"

"آج آپ کو بہت اچھی نیند آئے گی۔" مدیحہ نے بے حد یقین سے کہا۔ "آپ سو کر اٹھیں گے تو بہت فریش ہوں گے۔"

"کیسے؟ تم سلاؤ گی مجھے؟"

"نہیں۔ لیکن مجھ سے باتیں کرتے کرتے آپ کو نیند آجائے گی۔ بہت اچھی نیند۔" مدیحہ نے کہا۔ "چلیں۔ اب کچھ بات کریں۔"

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں شروع ہی سے ایسا ہوں۔ دماغ سے سوچنے والا۔ شاید ایسے لوگ کبھی محبت نہیں کر سکتے۔ کم از کم گہرائی کے ساتھ نہیں۔" حمید احمد نے کہا۔

"یہ بات نہیں۔ آپ ایسے نہ سوچا کریں۔"

"اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اب میں کبھی بدل بھی نہ سکوں گا۔ وہ مومن نے کہا تھا نا.... آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔"

"یہ بات بھی درست تھی۔ محبت میں اتنی طاقت ہے کہ کسی بھی وقت کسی کو بھی بدل سکتی ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر بولی۔ "لیکن میں نے کہا نا' آپ ان باتوں پر سوچنا چھوڑ دیں۔ کچھ اور بات کریں نا۔ دنیا میں الجھنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ خوب صورتی بھی ہے۔"

"مثلاً؟ اور کیا سوچوں میں؟"

"یہ بتائیں' آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ کبھی غور ہی نہیں کیا۔ اتنا موقع ہی نہیں ملا پھولوں کو دیکھنے کا۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کسی کو پھول اچھے نہ لگتے ہوں۔" مدیحہ نے کہا۔ "اور پھول دیکھنے کے لئے موقعے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ نے بارہا پھول دیکھے ہوں گے۔ یاد کر کے بتائیں۔"

حمید احمد چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ "بہت غور سے تو میں نے پھولوں کو واقعی کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن ہاں' مجھے چنبیلی کا پھول اچھا لگتا ہے۔ سادہ.... اور خوب صورت۔"

"واہ.... یہ ہوئی نا بات۔" مدیحہ نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا.... رنگ کون سا اچھا لگتا ہے؟

آپ کو؟"

"کبھی غور ہی نہیں کیا اس پر۔ خوب صورتی کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"پھر وہی بات۔ غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رنگ تو ہر جگہ بکھرے نظر آجاتے ہیں۔ آپ سوچیں تو۔"

حمید احمد پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ "واقعی.... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں سامنے کی خوب صورتی کو بھی غور سے نہیں دیکھتا تھا۔"

"بہرحال اب بتائیں۔"

حمید احمد نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمام رنگ اچھے لگتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" مدیحہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمام رنگ اچھے لگتے ہیں۔" حمید احمد بولے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی۔ "آسمان کا نیلا' دھلا ہوا' نتھرا ہوا رنگ مجھے اچھا لگتا ہے۔ شفق کی سرخی میں نہائے ہوئے گلابی بادل مجھے اچھے لگتے ہیں۔ گلاب کا سرخ رنگ مجھے پسند ہے۔ سردی کی اتری اتری رنگ والی زرد دھوپ مجھے اچھی لگتی ہے۔ بارش میں دھل کر نکھرنے والے پتوں کا سبز رنگ مجھے اچھا لگتا ہے۔ دھنک کے تمام رنگ مجھے پسند ہیں۔ رنگ سارے ہی اچھے ہیں۔ بس مناسب جگہ پر ہوں۔"

مدیحہ سحر زدہ سی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ "مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ اتنے خوب صورت انداز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔"

"مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ آج سوچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا۔" حمید احمد کے لہجے میں خوشی تھی۔

"بات یہ ہے کہ حقیقت پسند ہونا کوئی بری بات نہیں۔" مدیحہ کا لہجہ ناصحانہ تھا۔ "لیکن زندگی اتنی سخت ہے اور دنیا اتنی بد صورت ہے کہ صرف حقیقت پسندی سے آپ کو ناخوشی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ خوشی کے لئے ضروری ہے کہ آپ خوب صورتی کی جستجو کریں' اسے دیکھیں۔ تاکہ آپ کو تازگی ملے۔ خوب صورتی رنگوں میں، پھولوں میں، قدرت کے نظاروں میں ہے۔ خوب صورتی خوابوں میں ہے، شعروں میں ہے، موسیقی میں ہے، فن کاروں کے فن پاروں میں ہے اور سب سے بڑھ کر خوب صورتی کی جستجو کرنے میں ہے۔

خوب صورتی سے محروم رہیں گے تو ناخوشی' افسردگی' مایوسی اور پژمردگی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ کوئی اچھی' خوب صورت کیفیت نہیں مل سکے گی آپ کو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس وقت میں نے صرف سوچا ہے اور مجھے خوشی اور تازگی کا احساس ہو رہا ہے۔"

"آپ کی محبت گہرائی سے محروم نہیں ہے۔ صرف اس چیز کی کمی ہے.... خوشی اور خوب صورتی کی جستجو کی، جس سے زندگی کو امنگ ملتی ہے۔" مدیحہ نے کہا۔

"میں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"زندگی کی جدوجہد اور روزگار کی دوڑ دھوپ کے باوجود اپنے لئے بھی وقت نکالیں۔ کبھی کسی باغ میں' پھولوں کی یا تصویروں کی کسی نمائش میں جائیں' خوب صورتی کو دیکھیں' اسے سراہیں۔ اچھی موسیقی سنیں، وہ جو آپ کو اچھی لگے۔"

"اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس؟"

"نکالیں گے تو ہو گا۔ اب خود کو ٹٹولئے۔ سکون اور طمانیت کا احساس ہو رہا ہے یا نہیں؟"

"ہاں.... ہو رہا ہے اور یہ شاید پہلی بار ہوا ہے۔ ورنہ صرف خالی پن کا احساس ہوتا تھا۔"

"اب دیکھئے گا' آپ کو کتنی اچھی نیند آتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے سو جائیں گے آپ۔"

اور اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ حمید احمد کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کب وہ سو گئے۔ اور وہ بہت اچھی' بہت بھرپور نیند تھی۔ صبح سو کر اٹھے تو دنیا بدلی بدلی لگ رہی تھی اور وہ معمول سے پہلے بیدار ہوئے تھے۔ دانت صاف کر کے وہ باہر ٹہلنے نکل گئے۔ باہر درختوں پر دن کا آغاز کرنے والے پرندوں کے چہچہے اور تلاشِ رزق کے لئے ان کی اڑانیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ پھر سورج کے طلوع ہونے کا منظر بھی بہت خوب صورت تھا۔

تو یہ بات ہے۔ سمجھا جائے تو زندگی اتنی خوب صورت ہے۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ اب تک عمر رائیگاں ہوئی۔ لیکن انہوں نے فوراً ہی اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو یہ بھی زیاں نہیں ہے۔

اور انہوں نے کتنا کچھ پالیا تھا۔ انہیں شدت سے' سچائی کے ساتھ پکارنا آگیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی محبت گہرائی سے محروم نہیں ہے۔ وہ زندگی سے لطف اٹھانا' سیکھ رہے تھے اور اب مدیحہ بھی انہیں مل سکتی تھی۔ بس پکارنے ہی کی تو بات تھی۔

گھر واپس جاتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر اس مشورے پر عمل کریں' جو مدیحہ
ز نہیں دیا تھا۔

☆

وحید ایک ایسے جذبے میں مگن تھا' جو اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آرہا تھا۔ یہ تو طے
فاکہ وہ ڈاکٹر جبیں سے محبت کرنے لگا ہے۔ ان کے پیریڈ میں وہ ان کے چہرے کو تکنے کے سوا
کچھ نہیں کرتا تھا لیکن وہ ان سے آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔

اور یہ عجیب محبت تھی۔ اس میں کوئی خواہش نہیں تھی۔ معصیت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ یہ
ی نہیں تھا کہ اس کا ان کے پاس بیٹھنے اور ان سے بات کرنے کو دل چاہتا ہو۔ بس تھوڑی دیر
ں لینے ہی میں اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اور اس کے بعد دن بھر وہ ان کے تصور
ں مگن رہتا اور اس تصور میں بھی کوئی خواہش نہیں ہوتی تھی۔

کیا یہ محبت ہے؟ وہ تنہائی میں سوچتا اور اگر یہ محبت ہے تو کیسی محبت ہے۔ اسے اخبار کا کالم
راآنا۔ وہ اخبار اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ جب وہ الجھتا تو اس کالم کو بار بار پڑھتا۔ کیا یہ
رت ہے کہ یہ وہ محبت نہیں ہے' جس کی مجھے تلاش ہے۔ کیا واقعی یہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ
ے محبت سے محبت ہو گئی ہے۔ پیش گوئی کے اس جملے کو بھی وہ کرید تا رہتا تھا۔ محبت سے
بت ہو جانے کا کیا مطلب ہے۔ یہی نا کہ آدمی کو بہت شدت سے آرزو ہے کہ وہ کسی سے
بت کرے۔ ایسے میں وہ جسے بھی پہلے دیکھ لے' اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ وہ
لاسے محبت کرنے لگا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اہمیت محبت کی ہے۔ اس کی نہیں، اس وقت،
بالے وہ ہستی ملے گی، جس سے اسے سچ مچ محبت ہو گی۔ ارے بھئی.... یہ تو افسانہ لگتا
ہے۔

مگر وہ اس سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر جبیں میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف تھے' جو
ے اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنی ظاہری شخصیت میں بھی اور باطنی شخصیت میں بھی اس کے
ائے ہوئے آئیڈیل کے مطابق تھیں۔ لیکن وہ ان سے مرعوب بہت زیادہ تھا۔

ضرورت اب اس بات کی تھی کہ وہ اس موضوع پر کسی سے بات کرے۔ بات کرنے سے
الجھنیں سلجھتی ہیں۔ لیکن یہ ایسا معاملہ تھا کہ جس پر وہ کسی دوست سے بات نہیں کر سکتا
ار کرتا تو اس کا نتیجہ بہت خراب بھی نکل سکتا تھا۔

لیکن یہ اس کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ ابو نے شروع ہی سے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ ان سے بڑھ کر' ان سے بہتر کوئی ان کا دوست نہیں ہو سکتا اور یہ سچ تھا کہ وہ ہر موضوع پر ان سے بات کر سکتا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے اس کی بات سنتے۔ پھر اس پر غور کرتے' اس پر تبادلہ خیال کرتے۔ بعض اوقات وہ ایسے ایسے نکتے اور اس بات کے ایسے ایسے پہلو نکالتے کہ وہ حیران ہو جاتا۔ صورتِ حال بالکل واضح ہو جاتی۔ پھر وہ بس اس کی رہنمائی کرتے اور اپنے سوال کا جواب اسے خود ہی مل جاتا اور وہ دوستوں ہی کی سی بے تکلفی کے ساتھ اس سے بات کرتے تھے۔ انہوں نے ایسے کسی موقع پر اسے ڈانٹا بھی نہیں تھا۔ اس سے سختی سے بات نہیں کی تھی۔ مگر اس معاملے میں وہ ابو سے بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا' شاید اس لئے کہ اس موضوع پر ان کے درمیان کبھی بات نہیں ہوئی تھی اور بات کرنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ اب یہ مسئلہ اس کی پڑھائی پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اب تک اس کی پڑھائی پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑا تھا۔ ماہانہ ٹیسٹ کے نتائج اس کا ثبوت تھے۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی بھی وقت ایسا ہو سکتا ہے۔

اسے یاد تھا' ابو کہتے تھے.... دنیا میں باپ سے اچھا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ اس سے ہر مسئلہ پر بات کی جا سکتی ہے۔

اس پر اس نے کہا تھا۔ "اور اگر بات کرنے کی ہمت نہ ہو تو؟"

ابو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ "تو خود کو ٹٹولو۔ کہیں وہ کوئی بری بات تو نہیں۔ آدمی کوئی بری بات' بہت خراب بات ہی کہتے ہوئے جھجک سکتا ہے۔"

"اور اگر کوئی بری بات ہو تو؟" اس نے دوسرا سوال اٹھایا۔

"تب بھی تم مجھ سے بات کر سکتے ہو۔" ابو نے بلا جھجک کہا تھا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا دوست ہوں۔ بری بات ہو گی تو میں تمہیں سمجھاؤں گا۔ تمہاری مذمت کروں گا۔ اسے دوسروں تک پہنچا کر تمہارا مذاق نہیں بناؤں گا۔"

وحید کو اس کا خوب تجربہ تھا۔ نام نہاد دوست معمولی سی بات پر بھی یہی کرتے تھے۔ دوسروں کو بتاتے اور اچھا خاصا ریکارڈ لگ جاتا۔ ایسے چند ایک تجربے ہی ہوئے تھے۔ لیکن ان کے نتیجے میں وہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ ابو کی بات درست ہے۔ ان سے اچھا کوئی دوست ہے ہی نہیں۔

اس معاملے میں اس نے ابو کے پرانے مشورے کے مطابق خود کو ٹٹولا اور بہت اچھی طرح اس معاملے میں اس کے اندر کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ ہر اعتبار سے بہت صاف ستھرا تھا۔ بات بس اتنی تھی کہ وہ خود کو.... اپنے اس جذبے' اس تعلق کو سمجھنا چاہتا تھا۔ یہ کہ وہ ڈاکٹر جبیں سے محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ محبت کیسی ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ پڑھائی میں جو ڈسٹربنس ہو رہا ہے' مسئلے کو سمجھ کر اسے دور کیا جائے۔

لیکن معاملہ صاف ستھرا ہونے کے باوجود اس کی ابو سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے پاس متبادل بھی تھا۔ دادی سے وہ بڑی آسانی سے' بغیر کسی جھجک کے بات کر سکتا تھا۔ ابو ہمیشہ سے اس کے دوست تھے۔ لیکن محرم راز ہمیشہ دادی رہی تھیں۔ ایک تو ان کا رفاقت کا ساتھ تھا۔ دوسرے وہ اس سے ایسی محبت کرتی تھیں کہ اس کی کوئی بات کبھی ٹالتی نہیں تھیں۔ اور ان سے وہ کسی بھی معاملے میں بات کر سکتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں تو انہوں نے ہی اس مسئلے پر بات شروع کر دی تھی۔ تو دادی سے بات کی جائے۔

مگر اس میں بھی ایک مسئلہ تھا۔ دادی کی ہر تان شادی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ پانچ سال پہلے سے انہوں نے اس کی شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کے بس میں ہوتا تو اب تک اس کی چار شادیاں کرا کے چار شان دار بہوؤں کی اکلوتی ساس بن چکی ہوتیں۔

لیکن ایسے ہر موقعے پر وہ اس سے شادی کی بات کرنے کے بعد سرد آہ بھر کر کہتیں۔ "افسوس... حمید احمد سے خوشی نہیں ملی مجھے۔ اس کی بیوی کی بات ہی اور تھی۔ وہ خالص ہوتی میری۔"

"تو آپ ابو ہی کو گھیر یئے۔" وہ ہنس کر کہتا۔ "پوتے کی بیوی میں وہ بات کہاں۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔" دادی کہتیں۔ "وہ تو زیادہ ہی بہو ہوتی ہو گی۔ پوتا بھی تو بیٹے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔"

"بڑی ہو کر خوشامد کر رہی ہیں میری۔" وہ انہیں چھیڑتا۔

"میں تیری خوشامد کروں گی۔ میں تو مرمت بھی کر سکتی ہوں تیری۔" دادی کو طرارہ آ جاتا۔

پچھلی بار بھی انہوں نے یہی بات چھیڑ دی تھی۔ ان کے نزدیک تعلیم شادی کے بعد بھی

پوری ہو سکتی تھی اور معاشی مسئلہ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ مگر سچی بات یہ تھی کہ پوری طرح سمجھ میں نہ آنے والی اس محبت کے باوجود خود اس نے شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ ابھی تو وہ شان دار طریقے سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے کچھ کرنا.... کچھ بننا چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ دادی سے بات نہ کر سکا۔ سو ابو سے بات کرنا ناگزیر ہو گیا۔ وہ اس الجھن سے جلد از جلد نجات چاہتا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ابو نے دیر سے ناشتہ کیا۔ پھر وہ ان کے پاس جا بیٹھا۔ ”آپ سے تو ہفتے میں ایک بار ملنا ہوتا ہے۔“ اس نے شکایتاً کہا۔

”ظاہر ہے، تم اپنے کمرے میں گھسے پڑھائی کرتے رہتے ہو۔“ حمید احمد نے کہا۔ ”میں یہ سوچ کر خوش رہتا ہوں کہ پڑھائی اچھی جا رہی ہے۔ ویسے پڑھائی تو اچھی جا رہی ہے نا۔“

”جی.... بس ٹھیک ہے۔“

وہ جواب خلافِ معمول تھا۔ ورنہ وحید ہمیشہ جواب میں کہتا تھا۔ فرسٹ کلاس! حمید احمد نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ چند لمحے وہ اسے دیکھتے رہے۔ پھر مطمئن ہو گئے۔ بیٹے کے چہرے پر کوئی الجھن، کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ”صرف ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اعتراض کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اتنی محنت کے بعد صرف ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ محنت کر رہے ہو۔ ہر وقت پڑھائی ٹھیک نہیں۔ باہر نکلو، گھومو پھرو، خوب صورتی کی جستجو کرو، اسے دیکھو۔ تازہ دم رہو گے اور پڑھائی بھی بہتر ہو گی۔“

وہ پورا لیکچر وحید کے لئے خلاف توقع تھا۔ ابو نے ایسا مشورہ پہلے کبھی نہیں دیا تھا۔ وحید نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ وہ بہت بدلے بدلے نظر آ رہے تھے اور تبدیلی بھی مثبت تھی۔ ان کے چہرے پر تھکن نہیں تھی۔ بلکہ زندگی اور تازگی کا رنگ دوڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی چمک تھی۔

حمید احمد کو دیکھے جانے کا احساس ہو گیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو اتنے غور سے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ بہت بدلے بدلے.... بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“

”واقعی؟“ حمید احمد مسکرائے۔ ”مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔“

”اس کی وجہ تو بتائیں۔“ وحید نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس آدمی چاند کی طرح بدلتا رہتا ہے۔“

”اوہ.... شاعرانہ باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ تو بڑی تبدیلی ہے۔ کوئی وجہ تو ضرور ہے۔ بتائیں نا۔“

حمید احمد سوچنے لگے کہ کیا کہیں۔ شاعرانہ باتوں کے حوالے سے وجہ ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر اب وحید کو کیا بتاتے کہ انہیں محرومی دور کرنے کا ہنر آ گیا ہے۔ وہ شدت اور سچائی کے ساتھ پکارنا سیکھ گئے ہیں۔ رات اب انہیں بڑی طمانیت کے ساتھ سلا دیتی ہے اور وہ اپنی محبوب ہستی کے دور ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ وقت گزار لیتے ہیں۔ اب یہ سب کچھ وہ وحید کو تو نہیں بتا سکتے تھے۔

مگر انہوں نے تصور میں آنے والی مدیحہ کے مشوروں پر بھی تو عمل کیا تھا۔ اس سے ان کے اندر انقلاب آیا تھا۔ ان کا وجود چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ اس کا اثر ان کی ظاہری شخصیت پر بھی پڑا ہے۔ آئینہ وہ کبھی دھیان سے دیکھتے ہی نہیں تھے۔ اس وقت ان کا جی چاہنے لگا کہ جا کر آئینہ دیکھیں۔ خیر تھوڑی دیر بعد سہی۔

”ہاں۔ شاید وجہ ہے.... اور مجھے معلوم بھی ہے۔“ انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ”میں آج کل زندگی کی خوب صورتی کو محسوس کر کے جینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں خود کو توجہ اور اہمیت دے رہا ہوں۔ میں نے کاروبار کو ہی زندگی بنا لیا تھا۔ اب اس غلطی کی اصلاح کر رہا ہوں۔“

”کیسے ابو؟“

”پچھلے ہفتے باغ جناح میں پھولوں کی نمائش ہوئی۔ میں اس میں گیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ملی۔ پھر میں آرٹس کونسل میں ہونے والی تصویروں کی نمائش میں گیا اور دکان پر فارغ وقت میں شعر و ادب کی کوئی کتاب لے بیٹھتا ہوں۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ برسوں کا کاروبار کرتے ہوئے میں مطالعے سے بہت دور ہو گیا ہوں۔“

”واہ ابو.... یقین کریں، اس تبدیلی کا نتیجہ بہت شان دار رہا ہے۔“

”بیٹھو.... میں ذرا باتھ روم ہو آؤں۔“ حمید احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دروازہ بند کر کے آئینے میں خود کو دیکھنا چاہتے ہیں؟“

حمید احمد کھسیا گئے۔ پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے بیٹے کے رخسار کو تھپتھپایا۔ ”پگلے ہو تم

تو۔ آئینہ تو میں روز دیکھتا ہوں۔"

حمید احمد چلے گئے۔ وحید بیٹھا پلاننگ کرتا رہا کہ بات کس طرح کرنی ہے۔ سچی بات یہ تھی کہ اسے اب بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

☆

باتھ روم کا دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ پھر بھی آئینے میں خود کو دیکھنے سے پہلے حمید احمد نے یوں اِدھر اُدھر دیکھا' جیسے ڈر ہو کہ کوئی چوری چھپے انہیں دیکھ رہا ہے۔ بالآخر انہوں نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا.....

کئی منٹ ہو گئے۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے رہے۔ نظریں ہٹانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار انہوں نے غور سے آئینہ کب دیکھا تھا۔ انہیں یہ یاد تو نہیں آیا لیکن آخری عکس جو ان کی یادداشت میں تھا، وہ ضرور آ گیا۔ وہ اسے دیکھنے لگے۔

وہ تھکا ہوا چہرہ تھا.... سلوٹوں سے بھرا۔ متورم آنکھیں شکایت کر رہی تھیں کہ انہیں پوری نیند میسر نہیں آتی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے چہرے کی تھکن اور اضمحلال میں اور زیادہ اضافہ کر رہے تھے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ ان کے بال اب بھی سفید نہیں ہوئے تھے۔ کنپٹیوں پر سفیدی تھی' جو اچھی ہی لگتی تھی مگر ان کے بال بکھرے ہوئے اور پریشان تھے.... اور ان کے باطن کی طرح۔ ان کے ذہن کی طرح۔ مجموعی طور پر وہ ایسا چہرہ تھا کہ اپنا ہونے کے باوجود اسے دیکھنے کو دل نہ چاہے۔ رنگت بھی اڑی اڑی تھی۔

پھر اس عکس کو اٹھا کر تازہ عکس نے جھانک کر انہیں دیکھا۔ وہ اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس چہرے پر تھکن نہیں' تازگی تھی۔ آنکھیں دھلی دھلی تھیں اور ان میں چمک تھی' جیسے ذہن میں ابھرنے والے کسی خوب صورت خیال کا عکس۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بھی نہیں تھے اور ان کے بال بکھرے ہوئے اور پریشان نہیں تھے۔ وہ سلیقے سے بنائے گئے تھے۔

انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ صبح انہوں نے بالوں میں کنگھا کیا تھا۔ لیکن انہیں یاد نہیں آیا۔ وہ کنگھا کب کرتے تھے۔ ہاں کنگھا باتھ روم کیبنٹ میں رکھا ضرور رہتا تھا۔ لیکن وہ اسے کبھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

یہ سوچتے ہوئے انہیں احساس ہونے لگا کہ آئینے میں نظر آنے والا یہ عکس اصلی نہیں۔ یہ

ان کا وہم ہے۔ اصل عکس وہ ہے جو پہلے نظر آیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس عکس میں ان کے بال ے ہوئے نظر نہ آتے۔ جبکہ انہیں کنگھا کرنا یاد ہی نہیں ہے۔

اس خیال کے تحت انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ بالوں کو چھوا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ںس غائب ہو جائے گا اور اس کی جگہ تھکے ہوئے مضمحل چہرے کا عکس ابھر آئے گا۔ لیکن ایسا ہیں ہوا۔ چہرہ نہیں بدلا۔ ہاں اس پر ہاتھ رکھے تھے۔ پھر وہ ہاتھ بالوں پر جا رکے۔ بال بھی یسے ہی رہے۔

چند لمحوں میں انہیں یقین ہو ہی گیا کہ وہ ان کا اصل عکس ہے..... اور وہ ایسے ہی ہیں۔ اس مطلب ہے کہ وہ بلا ارادہ بال بھی بنانے لگے ہیں۔ اس کی تائید میں انہیں یاد آیا کہ ابھی چند روز پہلے انہوں نے خود کو گنگناتے بھی پکڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تبدیلیاں غیر محسوس طور پر بھی آتی ہیں۔

وہ باتھ روم سے نکلے اور وحید کے پاس جا بیٹھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" انہوں نے اسے ٹوکا۔

وحید چونکا' چند لمحے گڑبڑایا۔ "سوچ رہا تھا کہ آپ نے تجربہ کرنے کے بعد ہی مجھے چھوڑے دیئے تھے۔"

"ظاہر ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اور تم جوان ہو۔ تمہارے لئے تو یہ زیادہ ہی ضروری ہے۔"

"مجھے تو آپ بھی جوان ہی لگتے ہیں۔ کم از کم بوڑھے تو ہرگز نہیں ہیں۔"

اب حمید احمد بدلے ہوئے' اعتماد سے بھرے ہوئے آدمی تھے۔ انہوں نے بیٹے کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ "ہاں۔ بوڑھا تو میں ابھی نہیں ہوا ہوں۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

وحید پھر کچھ سوچ رہا تھا۔ بالآخر اس نے سر اٹھایا۔ "آپ کہتے ہیں ابو کہ میں اور آپ کسی بھی موضوع پر بات کر سکتے ہیں؟"

حمید احمد نے بیٹے کو غور سے دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "ہاں بالکل۔ بہترین دوستوں کی طرح۔" پھر انہوں نے پوچھا۔ "کیا میں تمہارا بہترین دوست نہیں ہوں؟"

ان کے سنبھل کر بیٹھنے سے وحید اور گڑبڑا گیا۔ اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ "یقیناً ہیں ابو۔"

"تو کہو۔ کیا بات ہے؟"

"کک.... کچھ نہیں ابو۔"

"نہیں۔ کوئی بات تو ہے۔ ورنہ تم اس طرح بات نہ چھیڑتے۔" حمید احمد کے لہجے میں تشویش در آئی۔ "جھجکو نہیں۔ تم مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں ابو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔"

"دیکھو بیٹے، میں تمہیں جانتا ہوں، سمجھتا ہوں۔ تم جھجک رہے ہو۔"

وحید پریشان ہو گیا۔ اب وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ کیا کرے۔ بات کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ کوئی اور بات نکالے۔ مگر ایسی ہو کہ اس کا جھجکنا JUSTIFY ہو جائے یا پھر یہی بات.... اچانک اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "ابو.... آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" اور وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ یہ کیسا رخ بدلا تھا اس نے.... اور وہ بھی بے ارادہ!

حمید احمد اس سے بھی زیادہ حیران تھے۔ بات وحید نے کہی تھی۔ آواز اسی کی تھی لیکن الفاظ.... اسی لمحے ان کے کانوں میں بھولی بھالی نسوانی آواز ابھری۔ آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ پھر سوال کرتی ہوئی مدیحہ ان کے تصور میں آگئی۔

انہوں نے سر جھٹکا اور بیٹے کی طرف دیکھا۔ "یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

اب وحید سنبھل چکا تھا۔ "یونہی ابو، تجسس ہوتا ہے کبھی۔" پھر اس نے جلدی سے پوچھا۔ "آپ کو برا تو نہیں لگا؟"

حمید احمد زبردستی مسکرائے۔ بیٹے کا عمر بھر کا اعتماد خطرے میں تھا۔ "بالکل نہیں۔ تم مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتے ہو۔ ہم دوست ہیں نا۔"

"تو اس سوال کا جواب بھی دے دیجئے۔"

حمید احمد سوچنے لگے۔ کیا جواب دیں پھر بات یہیں رکے گی نہیں۔ آگے بھی بڑھے گی۔ تب کیا کریں گے۔ بہرحال وقت ضائع کئے بغیر پہلا جواب تو دینا ہی تھا۔ انہوں نے دل پکا کر کے کہا۔ "ہاں بیٹے، میں نے محبت کی ہے۔"

"کیا وہ امی تھیں؟"

وہ حمید احمد کے لئے دوراہا تھا۔ جھوٹ بولیں یا سچ۔ جھوٹ بولتے تو بات آسانی سے ختم ہو جاتی لیکن جھوٹ بولنا تو انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ "نہیں بیٹے۔" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔

"اس وقت تو شاید مجھے محبت کرنی آتی ہی نہیں تھی۔"

"تو وہ کون تھیں؟" وحید نے بے حد احترام سے پوچھا۔

"تھیں کوئی۔ ظاہر ہے، تم تو جانتے نہیں ہو۔"

"یہ تو بتائیں کہ کیسی تھیں؟"

اچانک حمید احمد معلم بن گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ بیٹا محبت سے متعارف ہو چکا ہے.... ہو رہا ہے۔ اسے بتانا ہو گا۔ EDUCATE کرنا ہو گا۔ "بیٹے، جس سے محبت ہو جائے وہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ اچھا ہی لگتا ہے۔ تب ہی تو محبت ہوتی ہے۔ ویسے سچ یہ ہے کہ وہ بہت اچھی تھی۔"

وحید بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ "اور آپ کیا چاہتے تھے ان سے؟"

حمید احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "میں....؟ میں کیا چاہتا؟"

"میرا مطلب ہے، آپ نے شادی کے متعلق سوچا ہو گا۔"

"ہاں.... ایک بار سوچا تو تھا۔"

"اور وہ....؟ وہ بھی آپ سے محبت کرتی تھیں؟"

"اصل میں تو وہی محبت کرتی تھی۔ میں تو محبت سے ناواقف ہی تھا۔ مجھے تو محبت کا پتہ ہی نہیں تھا۔"

"ان کی محبت کا؟"

"نہیں۔ دوسرے کی محبت کا تو پتہ چل جاتا ہے۔ اپنی محبت کا پتہ نہیں چلتا۔"

وحید کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھری۔ "تو ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی اپنے آپ سے بالکل بے خبر بھی رہتا ہے؟"

"ہاں۔ اپنے آپ سے بے خبر رہنا بہت آسان ہے۔"

"تو آپ کو کب تک پتہ نہیں چلا اپنی محبت کا؟" وحید نے پوچھا۔

"کئی برسوں تک۔ مگر اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ میرے خیال میں نہ تو مجھے محبت کی ضرورت تھی، نہ اس کا حق تھا۔" حمید احمد نے کہا۔

"یہ بتائیں کہ آپ نے مجھ سے ایک بار شادی کا پوچھا تھا...."

حمید احمد کے چہرے پر حیرت ابھری۔ "میں نے....؟ تم سے شادی کا پوچھا تھا؟"

"جی ہاں۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میرے لئے امی لے آئیں تو مجھے برا تو نہیں لگے گا۔"

حمید احمد کو یاد آیا.... اور انہوں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وحید کو وہ بات یاد ہو گی۔ اگر ابھی وہ جھوٹ بولتے تو نباہنا مشکل ہو جاتا۔ "ہاں، مجھے یاد ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تو آپ ان کی بات کر رہے تھے، جن سے آپ کو محبت ہے۔"

حمید احمد کو کرنٹ سا لگا۔ وحید نے "محبت ہے" کہا تھا، محبت تھی نہیں۔ "ہاں۔"

تو پھر کیا گڑبڑ ہو گئی تھی ابو۔ میں تو آس لگا بیٹھا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا کہ میری امی جیسی دوسری امی مجھے مل جائیں۔"

"بس وہ کھو گئی۔ بالکل اچانک ان کا پورا گھر بکھر گیا۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ اب وہ کہاں ہے۔ شاید وہ ملک سے باہر چلی گئی۔"

"اوہ.... آپ کو اب بھی ان سے محبت ہے؟"

"ہاں۔" حمید احمد نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

"اب وہ مل جائیں تو....؟"

"کون جانے!" حمید احمد اداس ہو گئے۔

"اب وہ مل جائیں اور آزاد بھی ہوں اور آپ کی منتظر بھی، تو آپ کیا کریں گے؟"

وہ بہت مشکل سوال تھا۔ حمید احمد خواب نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلو بچانے کے لئے اپنی اداسی کو جھٹکا اور شگفتگی سے جوابی حملہ کیا۔ "اب یہ بات چھوڑو اور اپنی کہو۔ تم نے بلا وجہ تو یہ موضوع نہیں چھیڑا ہو گا۔"

ان کی توقع کے مطابق وحید گڑبڑا گیا۔ "میرا کیا....؟ میں تو بس یونہی۔ میں تو بس محبت کو سمجھنا چاہتا تھا۔"

"تم کچھ چھپا رہے ہو؟"

"نہیں ابو۔ آپ سے میں کبھی کچھ نہیں چھپاؤں گا۔" وحید اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی تو میں پڑھائی کے علاوہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔"

"حمید احمد بیٹھے اسے جاتے دیکھتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور وحید کچھ چھپا رہا ہے۔ لیکن انہوں نے دانستہ اصرار سے گریز کیا۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ ان سے جھجک رہا

ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کا اعتماد جیتنے کی خاطر اور کھل کر بات کی تھی۔ کچھ دن بعد شاید وہ ان سے بات کر سکے گا۔

بہر کیف وہ اس کی طرف سے فکر مند ہو گئے تھے!



اس روز وہ مخصوص دعا مانگتے ہوئے مدیحہ کے دل میں شکایت سی ابھری۔ وہ ایک خیال تھا، جو بجلی کی طرح سے اس کے ذہن میں کوندا اور معدوم ہو گیا۔ اس نے سوچا، آٹھ سال پہلے اسے خواب میں خوش خبری سنائی گئی تھی کہ اس کی آرزو پوری ہو گی۔ اس کی محبت اسے ملے گی اور اس خواب کو محض خواب کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ وہ یقینی طور پر سچا خواب تھا۔ کیونکہ اس کے بعد حمید احمد کے تصور نے اس کی نماز میں کبھی خلل نہیں ڈالا تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ وہ جو دعا کرے گی قبول ہو جائے گی۔ اس دن سے آج تک وہ یہی ایک دعا کرتی رہی تھی لیکن آٹھ سال گزرنے کے باوجود بھی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

وہ فوراً ہی اپنی سوچ پر شرمندہ بھی ہو گئی۔ اسے اس خواب کی سچائی پر پختہ یقین تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کب کس کو کیا ملنا ہے' اس کا تعین اللہ ہی فرماتا ہے۔ دیر کا یہ مطلب نہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ دعا تو قبول ہو گئی ہے۔ پھل کب ملے گا' یہ اللہ جانتا ہے۔ اس یقین کے سہارے اس نے آٹھ سال گزار دیئے۔ اور آج ایک کمزور لمحے میں اس شکایت نے اس کی ریاضت برباد کر دی۔

وہ لرز کر رہ گئی۔ دعا کو بھول کر وہ اللہ سے توبہ کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو ٹٹولا۔ اس کا یقین اپنی جگہ موجود تھا۔

ان آٹھ برسوں میں اس نے سچ مچ بڑی ریاضت کی تھی۔ یہ طویل عرصہ اس نے بڑے صبر و شکر کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ خود کو سوچنے سے تو نہیں روک سکتی تھی اور وہ بھی حمید احمد کے بارے میں سوچنے سے۔ وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ انہیں اس کا خیال آتا ہے یا نہیں؟ یہ تو طے تھا کہ حمید احمد کو ابھی تک اس سے محبت کا احساس نہیں ہوا ہے۔ ہوا ہوتا تو وہ اپنے وعدے کے مطابق اس کے سامنے اس کا اعتراف کرتے۔ یہ بات وہ ہمیشہ سوچتی تھی ظاہر ہے کہ اس بات کی اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت تھی۔

مگر ایک دن ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حمید احمد کو اس کی محبت کا دراک ہو گیا ہو اور انہوں نے وعدہ پورا کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن یہ اس وقت ہوا ہو' ب اس کا بنگلہ بک چکا تھا۔ حمید احمد بس رابطے کی اسی جگہ سے تو واقف تھے۔ اس کے بعد ان رکیا گزری ہو گی۔

یہ خیال اتنا طاقت ور اور حقیقت سے اتنا قریب تھا کہ وہ ہل کر رہ گئی۔ یہ بھی اب سات سال پرانی بات تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے تیزی سے اس کے تدارک کے لئے عمل کیا۔ وہ اپنے بنگلے پر گئی اور بیگم یزدانی سے ملی۔ "ارے... تم کیسے رستہ بھول پڑیں؟" بیگم یزدانی نے بڑے تپاک سے اسے بٹھایا۔

"میں تو پہلے آپ سے ملنے کے لئے آنا چاہتی تھی۔ لیکن زندگی کا رخ ایسا بدلا تھا اور مصروفیت اتنی تھی کہ موقع ہی نہیں ملا۔" مدیحہ نے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" بیگم یزدانی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ دوسروں سے بالکل مختلف۔ میں خود تم سے ملنے آتی مگر تمہارا پتہ ہی نہیں تھا میرے پاس۔"

"شکریہ۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ خیال مجھے بہت پہلے آ جانا چاہئے تھا۔ لیکن آج آیا ہے۔ مجھے آپ کو اپنا پتا دینا چاہئے تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں' جو مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آ سکتے تھے۔ مجھ سے یہ بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔"

"لیکن ایسا نہیں ہوا۔" بیگم یزدانی نے کہا۔

"دیکھئے' یہ بات بہت اہم ہے۔ آپ خوب یاد کر کے بتائیں۔ یہاں کوئی میرے لئے نہیں آیا؟" مدیحہ کے لہجے میں التجا تھی۔

بیگم یزدانی سوچنے لگیں۔ پھر انہوں نے سر ہلا دیا۔ "یاد آیا ایک رجسٹرڈ خط آیا تھا تمہارے ام۔"

مدیحہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ "وہ خط مجھے دے دیجئے۔" اس نے کہا۔

"اس وقت میرے ہزبینڈ موجود تھے۔ انہوں نے خط وصول کرنے سے انکار کر دیا۔" بیگم یزدانی نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "اب دیکھو نا' ہمارے پاس فارورڈنگ ایڈریس تو تھا نہیں اور تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ ہم کیا کر سکتے تھے؟"

مدیحہ کو لگا کہ کوئی بہت اہم چیز ہاتھ میں آتے آتے چھن گئی ہے۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

بیگم یزدانی چند لمحے سوچتی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ "آٹھ نو سال تو ہو گئے ہوں گے اس بات کو۔"

"اور کوئی مجھ سے ملنے کے لئے بھی نہیں آیا؟"

"یہ تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہارا کوئی ملنے والا یہاں کبھی نہیں آیا۔" بیگم یزدانی کہتے کہتے رکیں۔ "وہ ذہن پر زور دے رہی تھیں۔ "ہاں.... ایک بار ایک کتابیں بیچنے والا آیا تھا۔ میرے بیٹے نے اس سے بچوں کی کہانیاں خریدی تھیں۔ اس نے تمہارا پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تم اس سے کتابیں منگواتی تھیں...."

"کتابوں والا؟"

"ہاں، کتابوں کی گٹھری کندھے پر رکھ کر پھر رہا تھا...." اب کے بیگم یزدانی نے پوری تفصیل سنا ڈالی۔

مدیحہ بھی پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ کسی پھیری والے سے کتابیں منگوانا تو درکنار، اس نے زندگی میں کسی کو اس طرح کتابیں بیچتے ہوئے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ بیگم یزدانی نجانے کیا سمجھتیں۔ اس نے انہیں اپنا کارڈ دیا۔ "اس پر میرا پتا بھی ہے اور فون نمبر بھی۔ میرا کوئی ملنے والا آئے تو آپ اسے یہ دونوں چیزیں دے سکتی ہیں اور کوئی خط آئے تو ریسیو کر کے مجھے فون کر دیجئے گا۔ ویسے میں خود بھی آپ سے رابطہ رکھوں گی۔"

واپس آکر دونوں باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ خط اسے کون لکھ سکتا تھا....؟ نسرین.... لیکن نہیں۔ وہ تو شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تھی اور اس کے پاس فون نمبر بھی تھا اس کا۔ اور وہ گھر خود آ جاتی۔ اس کے علاوہ بس حمید صاحب تھے۔ ان کے پاس اس کا فون نمبر نہیں تھا اور وہ ایسے آدمی تھے کہ گھر آتے ہوئے گھبرائے ہوں گے۔ انہوں نے اعتراف نامہ پوسٹ کر دیا ہو گا۔

یہ سوچتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ یہ امکان بہت.... بہت زیادہ قوی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ خط یقیناً حمید احمد کا ہو گا اور جب وہ انہیں واپس ملا ہو گا تو انہوں نے کیا سوچا.... کیا

کیا ہو گا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے قسمت کی۔

پھر اسے خیال آیا کہ بیگم یزدانی کے کہنے کے مطابق وہ رجسٹرڈ خط تھا۔ تو وہ کوئی آفیشل خط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات دل کو لگتی نہیں تھی۔ وہ پہلے والی بات درست معلوم ہوتی تھی۔

اور وہ کتابوں والا.... وہ تو ایسے کسی کتاب والے کو جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کتاب والے نے جھوٹ بولا کہ وہ اس سے کتابیں منگواتی تھی اور وہ اسے لا کر دیتا تھا۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ تو اس کتاب والے نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔ کیا وہ حمید احمد تھے' جو کتاب والے کے بھیس میں اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔

لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ بیگم یزدانی نے اس کا جو حلیہ بتایا تھا' وہ حمید احمد سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ حمید احمد بچوں کے لئے کتابیں گٹھری میں باندھ کر اسے کندھے پر رکھ کر پھیری والوں کی طرح گھومتے' بیچتے ہوں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔

اس دن کے بعد سینکڑوں بار اس کے دل میں یہ ترغیب پیدا ہوئی کہ وہ ان کے گھر جا کر دیکھے۔ مگر اسے اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے آخری ملاقات میں ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بس ان کے بلانے پر ہی ان کے گھر آئے گی اور انہوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تو وہ اپنا وعدہ کیسے توڑ سکتی ہے.... کیوں توڑے؟ جو ان کی ذمہ داری ہے' وہ انہیں پوری کرنی ہے۔

لیکن بدلی ہوئی صورت حال میں کیا وہ اپنے وعدے سے آزاد نہیں ہو گئی ہے؟ دل نے دلیل دی۔

کیسی صورت حال؟ کون سی تبدیلی؟ ذہن نے فوراً چیلنج کیا۔

اگر حمید احمد نے خط لکھا ہے تو وہ اعتراف نامہ ہی تو ہو گا اور انہوں نے اسے بلایا ہو گا۔ دل نے کہا۔

خوامخواہ کی بات۔ ذہن نے حقارت سے کہا۔ خود فریبی۔ یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ خط حمید احمد کا تھا اور اگر ان کا تھا تو اس میں انہوں نے اعتراف محبت کیا تھا۔ اسے بلایا تھا۔ یہ امکان زیادہ قوی ہے کہ انہوں نے اسے جتایا ہو گا کہ وہ اب بھی ویسے ہی ہیں یا ہو سکتا ہے' انہوں نے اس کے احسان پر اس کا شکریہ ادا کیا ہو۔ یا کوئی اور بات ہو۔

تو ایسا سینکڑوں بار ہوا اور دل ' دماغ سے ہار گیا۔ وہ اپنے وعدے سے آزاد نہیں تھی اور اسے اپنا وعدہ ہر قیمت پر پورا کرنا تھا۔ سینکڑوں بار اس نے ان کے گھر جانے کے بارے میں سوچا۔ لیکن اس پر عمل کبھی نہ کر سکی۔

محبت میں اس طرح کی صورت حال ہو اور سمجھ میں نہ آتی ہو تو آدمی اپنے اندر سے رجوع کرتا ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے نتیجے میں اسے ایک یقین مل گیا۔ دماغ تسلیم کرے نہ کرے ' دل مطمئن تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمید احمد کی محبت اسے مل چکی ہے۔ اب یہ نصیب کی بات ہے کہ رابطہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے وہ اس تک پہنچ نہیں سکی۔ یہ نصیب کی بات ہے کہ حمید احمد کی محبت مل جانے کے باوجود حمید احمد اسے نہیں ملے۔

یہ بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی دعا منظور ہو چکی ہے۔ مگر اس کی مقبولیت میں ابھی وقت ہے۔ تو پھر شکایت کیسی؟ اس نے خود کو ڈپٹا۔ انتظار کرو.... اور انتظار کرو۔ جو ملنا ہے وہ تو مل کر رہے گا۔



دادی نے پھر ایک دن شادی کا موضوع چھیڑ دیا۔ آج کل انہیں بہو کی کچھ زیادہ ہی لگی ہوئی تھی۔ وحید کا مشاہدہ تھا کہ دادی کی جب طبیعت خراب ہو ' صحت ٹھیک نہ ہو تو انہیں اس کی شادی کی جلدی پڑ جاتی ہے۔

وہ خاموشی سے دادی کی باتیں سنتا رہا۔ وقفہ آیا تو اس نے جلدی سے کہا۔ "دادی.... آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔"

"یہ ڈاکٹر کہاں سے آ ٹپکا۔ میں تیری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ اور میں کیوں جاؤں ڈاکٹر کے پاس؟" بلقیس بیگم نے بھنا کر کہا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تو آپ شادی کے لئے میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔" وحید نے معصومیت سے کہا۔

"ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ان دونوں باتوں کا آپس میں کیا تعلق؟"

"تعلق ہے.... اور بہت گہرا ہے۔ طبیعت خراب ہو تو آپ کو ڈر لگتا ہے کہ بہو کا ارمان پورا ہوئے بغیر جانا نہ پڑ جائے۔" وحید نے ہنس کر کہا۔ "لیکن دادی، ایسا ہونا نہیں ہے۔ آپ کو میں کہیں جانے نہیں دوں گا۔ چاہے اپنی عمر دینی پڑ جائے آپ کو۔"

بلقیس بیگم نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پاگل کہیں کا۔ ایسی بات کرتے ہیں۔ اس سے آسان یہ نہیں ہے کہ تو میری خاطر شادی کر لے۔"

"کر تو لوں دادی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں محبت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔"

"تو محبت کون سی مشکل ہے۔ یوں چٹکی بجاتے ہو جاتی ہے۔" دادی نے چٹکی بجائی۔

"آپ تو تجربے کار معلوم ہوتی ہیں۔ سچ بتائیں دادی ' آپ نے کبھی محبت کی؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں کی؟ کی ہے۔"

"کون تھا وہ خوش نصیب؟"

بلقیس بیگم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "تیرے دادا تھے اور کون ہوتا۔"

"تو آپ شادی سے پہلے دادا سے محبت کرتی تھیں!" وحید نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"یہ میں نے کب کہا۔" بلقیس بیگم نے آنکھیں نکالیں۔ "یہ تو آج کل ہوتا ہے۔ ہمارے نے میں محبت بعد میں ہوتی تھی۔ پہلے شادی ہوتی تھی۔"

"اب میں تو اس دور کا ہوں نا دادی۔ میں تو پہلے محبت کروں گا۔"

"تو کر لے۔ وقت کیوں ضائع کرتا ہے۔ کوئی لڑکی ہے نظر میں؟"

"اگر میں کہوں کہ نہیں ہے تو آپ کیا کریں گی؟"

"لڑکی تلاش کر کے تیرے سامنے کر دوں گی۔ پھر تو اس سے محبت کر لینا اور اس کے بعد دی۔"

"لو۔ یوں کیسے محبت ہو جائے گی!" وحید نے حیرت سے کہا۔

"تو اسے غور سے دیکھنا ' ٹکٹکی باندھ کر۔ وہ شرمانے لگے گی۔ بس پھر...."

"اور اگر نہ شرمائی تو؟"

"تو دوسری دیکھ لوں گی۔" بلقیس بیگم بولیں۔ "لیکن سچ سچ بتا۔ کوئی لڑکی ہے تیری نظر ما؟ ہے تو مجھ سے ملا دے۔"

وحید کی نگاہوں میں ڈاکٹر جبیں کا چہرہ لہرا گیا۔ لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ ورنہ دادی ورسٹی چلنے پر تل جاتیں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے شادی کے ساتھ ڈاکٹر جبیں کا تصور رہا تھا اور وہ اسے بہت اچھا لگا۔

وحید کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کایا پلٹ کر دینے والا لمحہ ہے۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ

یہ خیال اس کے ذہن سے چمٹ گیا ہے۔ اب وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اگر اس کی ڈاکٹر جبیں سے شادی ہو جائے گی تو زندگی کیسی ہو جائے گی؟ اور اس کے جواب میں اسے رنگ ہی رنگ نظر آئے.... خوب صورت رنگ۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر جبیں شادی شدہ ہوں۔ اس کے اندر کوئی اندیشہ پھنکارا۔

لگتا تو نہیں ہے۔ اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جھٹک نہیں سکا۔ آدمی کتنا کمزور ہوتا ہے۔ ایک پل میں بدل کر رہ جاتا ہے' ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اس نے سوچا لیکن یہ مصیبت دادی کی لائی ہوئی ہے۔ ہر وقت شادی.... شادی.... اور شادی۔ مگر یہ مجھے کیا ہو گیا۔ ابھی تک تو میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر جبیں سے محبت ہے اور وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ' مجھے کیا۔

لیکن جلدی ہی اسے احساس ہو گیا کہ پر سکون سمندر میں تیرتے تیرتے وہ اچانک کسی بھنور کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بھنور اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ چکراتے ہوئے بھنور کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

اب پہلی بار اسے پتہ چلا کہ صحیح معنوں میں پڑھائی میں فرق پڑنا کیا ہوتا ہے۔ پڑھائی ایک طرف رکھی رہ گئی اور ڈاکٹر جبیں اور شادی اس کے ذہن پر سوار ہو گئیں۔ اسے احساس ہو گیا کہ پڑھائی کی طرف اب اس کا دھیان بالکل نہیں رہا ہے۔ وہ پریشان.... بلکہ متوحش ہو گیا۔

اس مسئلے پر تین چار دن غور و خوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بار نظریں چرانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ابھی تک وہ اپنے جذبے کو سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا تھا۔ وہ تو سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ لیکن بالکل اچانک بات کچھ کی کچھ ہو گئی۔ اب تو اسے اس مسئلے کا سامنا کرنا تھا۔ غور کرنے کے اس عرصے میں اس نے اس خیال سے لڑنے کی بھی بھرپور کوشش کی لیکن ہار گیا۔ ڈاکٹر جبیں سے شادی کا خیال اس کے ذہن سے چپک گیا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ ابو سے بات کرنے کا بعد کا مرحلہ ہے۔ پہلے اسے ڈاکٹر جبیں سے بات کرنی تھی۔ یہ ایک دشوار مرحلہ تھا۔ لیکن اسے اعتماد تھا کہ وہ اس سے گزر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے تیاری کرنی ضروری ہے۔ اسے یہ سوچنا ہے کہ ڈاکٹر جبیں کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے۔ یہ بہر حال طے تھا کہ وہ ایک پڑھی لکھی' صاحب علم اور معقول خاتون کا ردعمل ہو گا۔ اس

بنیاد پر اس کے لئے تیاری کی جا سکتی ہے۔

پہلی بات تو ڈاکٹر جبیں کے غیر شادی شدہ ہونے کی تھی۔ یہ بنیادی سوال تھا۔ اگر وہ شادی شدہ ہیں تو یہ بات یہیں پر ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد کسی قسم کی گنجائش نہیں رہے گی۔ وہ محبت کے نام پر بدترین گناہ تو کرنے سے رہا۔

اور اگر وہ غیر شادی شدہ ہیں تو پھر کیس لڑنا ہو گا۔ وہ سوچتا رہا کہ ڈاکٹر جبیں اس کی محبت کو رد کرنے کے لئے کیا کیا دلیلیں دے سکتی ہیں۔ پھر اس نے ان پر غور کیا۔ اس کے پاس ان کی ہر دلیل کو رد کرنے کے لئے جوابی دلیل موجود تھی۔ دو تین دن اس نے اپنا کیس پکا کرنے میں لگا دیئے۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ پر اعتماد ہو گیا۔ اب وہ بہتر طور پر ڈاکٹر جبیں کا سامنا کر سکتا تھا۔

اس روز وہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر جبیں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے ید؟ کوئی پرابلم ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں میڈم۔ میں آپ سے کچھ ذاتی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

جواب میں ڈاکٹر جبیں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ اسے اپنے اندر ارتعاش سا محسوس ہوا۔ پھر انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔ اس سے اس کے اعتماد میں کچھ.... تھوڑا سا فرق پڑا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے بے حد نرم اور شیریں لہجے میں کہا۔

"ضرورت ہے میڈم۔ میرے مسئلے کا تعلق آپ سے ہے۔"

"مگر تم سے متعلق میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر جبیں کا لہجہ اب بھی نرم تھا.... لفظوں کے برعکس۔

"دیکھئے.... میری پڑھائی کا تعلق آپ سے ہے۔ اس میں فرق پڑ رہا ہے تو یہ آپ کا مسئلہ ہوا نا۔"

ڈاکٹر جبیں چند لمحے سوچتی رہیں۔ پھر انہوں نے بے حد معقولیت سے کہا۔ "ہاں.... یہ درست ہے۔ تم بہت برائٹ لڑکے ہو۔ میں بھی محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری تعلیمی

کارکردگی تمہارے معیار کے مطابق نہیں ہے اور میں اس کی طرف سے فکر مند ہوں۔"

"تو بیٹھ جاؤں؟"

"نہیں۔ ذاتی گفتگو یہاں کرنا میں مناسب نہیں سمجھتی۔" ڈاکٹر جبیں نے دراز کھولی اور ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "تم ایسا کرو، میرے گھر آجاؤ۔"

وحید کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ "کب آجاؤں؟"

"فرصت ہو تو آج ہی آجاؤ۔ چھ بجے ٹھیک رہے گا۔"

"تھینک یو میڈم۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر جبیں اتنی معقول ثابت ہوں گی۔

☆

وہ ٹھیک وقت پر ڈاکٹر جبیں کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہ دوسری منزل کا فلیٹ تھا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ خود ڈاکٹر جبیں نے کھولا۔ انہوں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے اندر لے گئیں۔ دروازہ انہوں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں انہوں نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ "کافی پیو گے؟" انہوں نے پوچھا۔

وحید نروس ہونے لگا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے...."

"ضرورت تو ہے۔ تم پہلی بار میرے گھر آئے ہو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں ابھی آئی۔"

وحید کی آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔ ڈاکٹر جبیں نے.... پہلی بار میرے گھر آئے ہو.... اس انداز میں کہا تھا، جیسے اسے بار بار آنے کی دعوت دے رہی ہوں۔ اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ اس کی آرائش بے حد سادہ تھی۔

ذرا دیر بعد ڈاکٹر جبیں کافی لے کر آگئیں۔ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئیں۔ وحید نے کافی کا گھونٹ لیا۔ کافی بہت عمدہ تھی۔ خرابی یہ تھی کہ وہ نروس ہو رہا تھا۔

"ہاں.... اب کہو، کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے کچھ ذاتی سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"کرو۔"

وحید کو اپنے گلے میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ اعتماد اپنی جگہ.... لیکن عملاً بات کرنا

سان نہیں تھا۔ "آپ.... آپ کی عمر کیا ہے؟"

ڈاکٹر جبیں مسکرائیں۔ "اصولاً مجھے برا ماننا چاہئے اس سوال پر۔ خواتین سے ان کی عمر چھنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ تاہم میں اپنی عمر ضرور بتاؤں گی۔ میری عمر 31 سال ہے۔"

وحید کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے چھپا بھی نہیں سکا۔

"بھئی میں نے بالکل درست عمر بتائی ہے۔ تم یہ شک نہ کرو کہ میں نے گھٹا کر بتائی ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ آپ زیادہ سے زیادہ 28 کی ہوں گی۔" وحید نے کہا۔

"اب ایسا بھی نہیں۔" ڈاکٹر جبیں نے محجوب ہو کر کہا۔ "دیکھنے میں، میں 31 سے زیادہ ہی لگتی ہوں۔"

"ایک بات اور پوچھوں؟" وحید نے کہا۔ پھر انتظار کئے بغیر ہی پوچھ لیا۔ "آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر جبیں کا لہجہ خشک ہو گیا۔ "اب میں ایک بات کہوں گی۔ میں سمجھ گئی ں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ لیکن زبان پر آنے کے بعد بڑی بات بھی چھوٹی ہو جاتی ہے۔ دی کو شرمندگی ہو بعد میں، تو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ الفاظ منہ سے نکل جائیں تو لوٹائے ہیں جا سکتے.... کمان سے نکلے تیر کی طرح۔"

وحید بھونچکا رہ گیا۔ اس کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ اس اسٹریٹجی کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر جبیں نے بات جاری رکھی۔ "تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ ذاتی مسئلے کو ایک عام معاشرتی مسئلہ سمجھ کر اس پر بات کرتے ہیں۔ اس طرح ذاتی مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔"

وحید نے اطمینان کی سانس لی۔ ورنہ وہ سمجھا تھا کہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔ "جی ٹھیک ہے۔ ت مناسب ہے۔"

"تو اب بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟"

"ایک 23 سالہ شخص اپنے سے آٹھ سال بڑی خاتون سے، جو اس کی ٹیچر ہے، محبت رنے لگا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" وحید نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ئے کہا۔

"اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے کہا۔

"اب آپ اس کی وجہ بتائیں گی کہ شاگرد اور استاد کے درمیان ایسا تعلق معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔" وحید نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اللہ نے جن رشتوں کے درمیان شادی کو ممنوع فرمایا ہے، یہ ان میں شامل نہیں ہے۔ اگر استاد اور شاگرد مرد اور عورت ہیں اور ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں تو ان کی شادی ہو سکتی ہے۔ اس میں نہ کوئی قباحت ہے نہ رکاوٹ۔ اسلامی معاشرت کی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔"

"تو پھر اس کی وجہ عمر کا فرق ہو گا؟"

"یہ بھی غلط ہے۔ عمر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی تو اعلیٰ ترین مثالیں موجود ہیں۔ نامحرم مرد اور عورت کے درمیان شادی کی شرط یہ ہے کہ زبردستی نہ ہو۔ ان کے درمیان پسندیدگی ہو اور انہیں یقین ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے۔"

وحید بری طرح الجھ گیا۔ اس کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ جو اعتراض اس کے خیال میں ڈاکٹر جبیں کو کرنے تھے، وہ انہوں نے کئے ہی نہیں۔ اور جو دلیلیں اسے دینی تھیں، وہ ڈاکٹر جبیں دے رہی تھیں۔

"تو پھر رکاوٹ کیا ہے۔" اس نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو وحید۔ کوئی بھی تہذیب اور پاکیزگی کے ساتھ کسی سے بھی محبت کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور اس سے شادی کے متعلق بھی سوچ سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جس سے وہ محبت کرتا ہے، اگر اسے کسی اور سے محبت ہو اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہو تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ محبت ایک بے اختیار جذبہ ہے۔ لیکن اس میں جس سے محبت کی جائے، اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس پر جبر نہیں کیا جاتا۔ اپنی مرضی تھوپی نہیں جاتی۔ یہ جاننے کے بعد اس شخص کو ایک اچھے انسان کی طرح اس حقیقت کو قبول کر لینا چاہئے۔ اسے اپنا دھیان ہٹانا چاہئے۔ اگر وہ یہ نہ کر سکے تو بھی اسے اپنی محبت کو چھپا کر بہت اچھی طرح، ہنسی خوشی جینا چاہئے۔"

وحید کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "میں.... میں سمجھا نہیں میڈم۔"

"تم نے جو مثال دی تھی، فرض کرو اس مثال کی خاتون برسوں سے کسی شخص سے محبت کر رہی ہے۔ وہ کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ورنہ بہت پہلے کہیں بھی اس کی شادی ہو چکی ہوتی۔

اب تم بتاؤ کہ وہ تمہاری مثال والے لڑکے سے شادی کر سکتی ہے؟ کیا اس خاتون کی محبت قابلِ احترام نہیں ہے؟ کیا اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے محبوب کا انتظار کرے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ جانتی ہو کہ وہ دنیا کے کسی اور مرد سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔"

وحید کچھ دیر سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں سمجھ گیا میڈم۔ آپ کی بات درست ہے۔ اور میں آپ کا بہت.... بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر جبیں بڑی طمانیت سے مسکرائیں۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم بہت اچھے ہو۔"

"لیکن یہ بہت مشکل ہے۔"

"آدمی اچھا ہو، اس کی نیت اچھی ہو تو اللہ اس کا ظرف بڑھا دیتا ہے۔"

"آپ میرے لئے دعا کریں گی نا؟"

"ضرور.... بہت دعا کروں گی۔" ڈاکٹر جبیں مسکرائیں۔ وہ بڑی وسیع مسکراہٹ تھی۔ اس میں معذرت بھی تھی، وحید کے لئے فخر بھی تھا اور طمانیت بھی۔ نجانے کیا کیا کچھ تھا اس مسکراہٹ میں، پھر وہ بولیں۔ "ایک اور بات بتاؤں۔ تم مجھے ابتدا ہی سے اچھے لگے ہو۔ مجھے بڑی انسیت ہے تم سے۔ تمہاری ذہانت، تمہای نیک فطرت اور حصول علم کی لگن کی وجہ سے۔ اور اس وجہ سے کہ تمہیں دیکھ کر یقین آتا ہے کہ تمہاری تربیت بہت اچھی کی گئی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں تمہیں اتنے اعتماد سے اپنے گھر کبھی نہیں بلاتی۔ یہاں آج سے پہلے کوئی نہیں آیا تھا۔"

"شکریہ میڈم۔" وحید کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"اور میں چاہتی ہوں کہ تم ٹاپ کرو۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بڑی محبت اور لگن سے وہ کام کرو، جو تمہیں کرنا چاہئے۔"

"آپ نے مجھے بہت وقت دیا، بہت عزت دی۔ شکریہ میڈم۔ میں اب چلتا ہوں۔" وحید اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن دو قدم ہی چلا تھا کہ اسے چکر آ گئے۔ دماغ جیسے معطل ہو گیا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑانے لگا۔

ڈاکٹر جبیں تیزی سے لپکیں اور انہوں نے اسے سنبھال لیا۔ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے وحید؟" ان کے لہجے میں محبت بھری تشویش تھی۔

"یونہی چکر سا آ گیا تھا میڈم۔" وحید نے بمشکل کہا۔

ڈاکٹر جبیں اسے سہارا دے کر لائیں، صوفے پر بٹھایا اور گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا۔

"لو.... پانی پیو۔"

وحید نے اندازے سے ہاتھ بڑھایا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹٹول ٹٹول کر اس نے گلاس تھاما اور منہ سے لگایا۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر جبیں کی تشویش بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے؟ تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے کیا؟"

"جی.... ایسے میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" وحید نے کمزور آواز میں کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی چند لمحوں میں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر جبیں پریشان بیٹھی اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں لیکن ابھی یہ مناسب نہیں تھا۔ پھر اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہوا تھا تمہیں؟"

"بس اچانک چکر آیا تھا، دماغ میں اندھیرا سا چھایا اور آنکھوں میں بھی اندھیرا چھا گیا۔" وحید نے کہا۔ "مگر اب میں ٹھیک ہوں۔"

"ایسا پہلی بار ہوا ہے؟"

"نہیں۔ ہوتا رہتا ہے۔ دن میں ایک بار تو ہوتا ہی ہے۔ مگر چند سیکنڈ کے لئے۔ لیکن آج زیادہ دیر تک رہا۔"

ڈاکٹر جبیں کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ "یہ اچھی بات تو نہیں۔ تم نے کبھی ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"اب یہ ایسی بڑی بات بھی نہیں۔" وحید نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ نظر انداز کرنے والی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارے گھر والوں کو علم ہے اس بارے میں؟"

"جی نہیں۔ بلاوجہ کیوں پریشان کروں۔ کوئی بڑی تکلیف تو نہیں ہے۔"

"چھوٹی تکلیفیں بڑی بن جاتی ہیں۔ آدمی کو بے پروائی نہیں کرنی چاہئے۔ وعدہ کرو کہ تم پہلی فرصت میں ڈاکٹر کو دکھاؤ گے۔"

"آپ کہتی ہیں تو دکھادوں گا۔" وحید نے کہا۔ "اب میں جاؤں؟"

"ذرا دیر رکو۔ تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔"

وحید اور تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گیا....

☆

زندگی میں پہلی بار حمید احمد بہت خوش تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔ کیفیتوں کی خاطر انہوں نے محبت کی آرزو کی تھی، وہ بالآخر انہیں مل گئی تھی۔ اب انہیں ردپیش، بلکہ ساری دنیا اچھی.... خوب صورت لگتی تھی اور وہ ہر چیز کو بہت غور سے ھتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں اپنا آپ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

پہلے انہیں رات سے خوف آتا تھا۔ رات بہت لمبی ہوتی تھی.... اور مشکل سے گزرتی ، بہت آہستہ گزرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ انہیں نیند مشکل سے آتی تھی۔ اور آتی تھی تو ی نہیں آتی تھی۔ بار بار آنکھ کھلتی تھی۔ بے چینی اذیت کی حد کو پہنچی رہتی تھی۔

مگر یہ رات یہ بیرن سلگتی جلتی رات
کٹی ہے ایسے کہ جیسے رگِ حیات کٹے
یقین نہیں ہے کہ اب اس کے بعد رات کٹے

ہر رات یہی کچھ ہوتا تھا۔ ہر رات ایسی ہی ہوتی تھی۔ ایسے میں آدمی رات سے خوف نہ ئے تو کیا کرے!

مگر اب رات وقت کا سب سے خوب صورت ٹکڑا بن گئی تھی۔ دن بھر وہ دن کے ہر لمحے ، لطف اٹھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی رات کا انتظار کرتے رہتے اور رات، سورج غروب نے سے نہیں شروع ہوتی تھی۔ ان کی رات تو کھانے اور چہل قدمی سے، تمام کاموں ، نمٹ کر بستر پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ وہ لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹتے اور مدیحہ آواز دیتے۔ وہ پہلی ہی آواز پر آ جاتی۔ وہ اس سے باتیں کرتے۔ وہ ان کے بالوں میں لیاں لہراتی۔ اس سے انہیں بڑا سکون ملتا۔ انہیں پتا بھی نہ چلتا اور وہ سو جاتے۔ سو کر اٹھتے ہ تازہ دم ہوتے۔ پورا دن عجیب سی سرشاری اور بے خودی میں گزرتا۔ وہ جو کچھ بھی تے، انہیں اچھا لگتا۔ اس میں خوشی ملتی۔ یہی تو وہ کیفیت تھی۔ وہ محبت میں ڈوب چکے ۔ ہجر ہجر نہیں رہا تھا۔

دکان پر جب رش نہ ہوتا تو ادب کی یا شاعری کی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ اسے ھتے ہوئے وہ بار بار سر اٹھاتے اور دکان سے باہر دیکھتے۔ یہ باہر دیکھنا اور پھر کتاب کی طرف

متوجہ ہو جانا' اس میں ان کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ کتاب کی تنہائی اور باہر کی چہل پہل آپس میں گھل مل جاتی تھیں۔ دونوں ہی ان کے لئے خوب صورت ہو جاتی تھیں۔

اس روز وہ ناصر کاظمی کا دیوان لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے صفحہ پلٹا۔ غزل شروع ہوئی۔ کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں۔ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں۔ انہیں پہلی پہلی بار چاند پر جا کر اترنے والوں کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو وہاں سے پتھر ہی لائے تھے۔

وہ پڑھتے رہے۔ پھر ایک شعر آیا' جس نے انہیں اداس کر دیا۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

ایسا ہوتا تھا۔ کبھی کوئی شعر' کوئی نثری جملہ انہیں اداس کر دیتا تھا۔ مگر وہ بڑی مختلف اداسی ہوتی تھی۔ وہ اذیت میں ڈبو دینے والی اداسی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اداسی کا بڑا مختلف' بڑا انوکھا اور خوب صورت شیڈ تھا۔ ایسا تھا' جیسے اداسی میں ہلکی سی دبی دبی خوشی کو گھول دیا گیا ہو۔

اس وقت یہ شعر پڑھ کر بھی یہی ہوا۔ کیا خوب صورت خیال ہے۔ انہوں نے اس انوکھی اداسی سے سوچا۔ اور مجھ پر کیسا منطبق ہوتا ہے۔ زندگی کا سفر.... کڑی دھوپ کا طویل سفر۔ گھبراہٹ تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن غم کی' گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ جس کے پاس خیالِ یار موجود ہے' اسے کیا فکر۔ خیالِ یار کی چادر چھاؤں کر دے گی نا۔ یہ ہوتی ہے مثبت' رجائی شاعری۔ قنوطیت سے پاک۔ پریشانی میں' مایوسی میں حوصلہ دینے والی۔

پھر انہوں نے سوچا' میرا بھی تو یہی حال ہے۔ لیکن نہیں' میرے پاس تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ میرے پاس صرف خیال نہیں' رات کی حسین، دل نشیں، سیراب کر دینے والی قربت بھی ہے۔ میرے پاس تصور ہے.... اور وہ بھی جیتا جاگتا۔

انہوں نے کئی بار اسی شعر کو پڑھا.... اور پھر جھومتے ہوئے سر اٹھا کر باہر دیکھا.... وہ حیران رہ گئے۔ خیالِ یار کی چادر....! وہاں تو خیالِ یار مجسم وجودِ جاناں کا روپ دھار گیا تھا۔

پھر وہ چونکے.... اور بری طرح چونکے۔ خیالِ یار متحرک بھی ہوتا ہے! دکان کے باہر کا حصہ ان کی نگاہوں کے لئے ایک فریم کی طرح تھا اور مدیحہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر کر اس فریم سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ خیال تھا.... تصور تھا....

شعر کی فضا اتنی جان دار اور سانس لیتی ہوئی تھی کہ کچھ دیر وہ اس سے نکل ہی نہیں سکے۔

طلسم ٹوٹا تو ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ خیال تو نہیں تھا۔ وہ تو مدیحہ تھی۔ وہ سچ مچ دکان کے منے سے گزری تھی۔ مگر ذہن کا ایک حصہ اب بھی اسے حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اس کے خیال میں وہ تصور کی فسوں گری تھی۔

اس الجھن میں چند لمحے اور گزر گئے کہ وہ سچ مچ مدیحہ تھی یا ان کا تصور۔ پھر ان کے ذہن ایک خیال ابھرا۔ جواب بہت آسان ہے۔ باہر نکل کر دیکھا جا سکتا ہے۔ فیصلہ خود ہو ئے گا۔

ان کے اندر اتنی شدت سے بے تابی ابھری کہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ انہوں نے اب ایک طرف رکھی اور تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ شعیب نے حیرت سے انہیں کھا۔ "کیا بات ہے انکل.... خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

لیکن حمید احمد کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ دکان سے نکلنے میں بھی چند لمحے لگے۔ باہر نکلتے ہی ہوں نے اس سمت دیکھا' جہاں مدیحہ کو جاتے دیکھا تھا۔ لباس ان کے ذہن میں رہ گیا تھا۔ کی وجہ سے آسانی ہو گئی۔ ان کی نظر نے اسے تلاش کر لیا۔

اتنی دیر میں وہ کافی دور ہو چکی تھی۔ اور اب سڑک پار کرنے والی تھی۔ پیچھے سے دیکھتے ئے وہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ مدیحہ ہے یا نہیں۔ یہ تو قریب جا کر ہی پتا چلتا۔ چنانچہ وہ اس رف دوڑ پڑے۔

اس وقت وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ انہیں اپنی عمر کا' اپنی عزت کا خیال بھی نہیں تھا۔ یں بس ایک فکر تھی۔ انہیں اس لڑکی تک پہنچنا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہ مدیحہ ہے یا نہیں۔ وہ جوانوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ لیکن وہ جوان نہیں تھے۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے وہ پ گئے۔

وہ سڑک پر پہنچے تو لڑکی دونوں سڑکیں پار کر چکی تھی اور سامنے والے پٹرول پمپ کی رف جا رہی تھی۔ ادھر مشکل یہ ہوئی کہ سگنل کھل گیا۔ انہوں نے آتی ہوئی گاڑیوں کی راہ نہ کرتے ہوئے تیزی سے سڑک پار کی۔ وہ اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔ دو گاڑیوں کی ٹ میں آنے سے وہ بال بال بچے۔ لیکن دونوں سڑکوں کے بیچ والے فٹ پاتھ پر کھڑے لڑکوں سے ان کی ٹکر ہو گئی۔ وہ بھی گرے اور لڑکوں میں سے بھی ایک گر پڑا۔

حمید احمد اٹھے تو دوسری ون وے سڑک پار کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا

اور سگنل کھلا ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایسے میں سڑک پار کرنے کے لئے جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ اٹھے اور بے بسی سے لڑکی کی طرف دیکھتے رہے ' جو دوسری طرف کھڑی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔

انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ جن لڑکوں سے وہ ٹکرائے تھے ' وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "کس کے پیچھے دوڑ رہے تھے انکل؟" ایک لڑکے نے کہا۔

حمید احمد نے سنا بھی نہیں۔ ان کی نظریں لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔

"کمال ہے یار۔ مجھے گرادیا اور سوری بھی نہیں کہا۔" گرنے والے لڑکے نے کہا۔

"ہوش میں ہوں تو سوری کہیں۔" پہلا لڑکا بولا۔ "دیکھا نہیں ' لڑکی کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔"

گرنے والے لڑکے نے حمید احمد کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ "اس عمر میں....."

حمید احمد اب بھی ان کے تبصروں سے بے نیاز تھے۔ ان کے سامنے گاڑیوں کا ریلا اب بھی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ سڑک کے پار لڑکی نے اپنی کار کا دروازہ کھولا ' ہاتھ میں موجود کتاب کو ڈیش بورڈ کے اوپر رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اب تک ایک لمحے کے لئے بھی اس کا چہرہ سامنے نہیں آیا تھا۔ حمید احمد بے بسی سے اسے دیکھے جارہے تھے۔

پھر لڑکی نے سر گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی طرف نہیں ' اس طرف جہاں وہ کھڑے تھے۔ تب اس کا چہرہ پوری طرح ان کے سامنے آگیا۔

حمید احمد کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ مدیحہ تھی۔

اسی لمحے مدیحہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔ حمید احمد نے پوری قوت سے چیخ کر اسے آواز دی.... مدیحہ.... مدیحہ....! وہ اضطراری فعل تھا۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ ان کی آواز مدیحہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ بالکل آخری لمحے میں تو پتا چلا تھا کہ وہ مدیحہ ہے۔

وہ ہاتھ ملنے لگے۔ مدیحہ کی گاڑی بائیں جانب ٹرن لے کر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

"ویسے چیز زبردست تھی۔"

اس بار آواز ان تک پہنچ گئی۔ انہوں نے سر گھما کر دونوں لڑکوں کو دیکھا۔ انہیں یاد آیا کہ شاید وہ ان سے ٹکرا کر گرے تھے۔ "معاف کیجئے گا، شاید میں آپ لوگوں سے ٹکرایا تھا۔"

انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں لڑکوں سے کہا۔

"شکر ہے ' آپ کو یاد تو آیا۔" ایک لڑکے نے کہا۔ "ویسے میں بتادوں کہ ٹکرائے آپ مجھ سے تھے لیکن اس بے چارے کو گرادیا تھا آپ نے۔"

"سوری بیٹے۔" حمید احمد نے دوسرے لڑکے سے کہا۔ "چوٹ تو نہیں لگی؟"

"مجھے تو نہیں لگی۔ لیکن آپ چوٹ کھائے ہوئے لگتے ہیں۔" لڑکے نے جواب میں بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

"ویسے انکل ' آپ اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔ اس عمر میں ایسا تو نہیں کرنا چاہئے۔ خیریت تو تھی؟" پہلا لڑکا بولا۔

"لگتا تھا ' کوئی برسوں کا بچھڑا نظر آگیا تھا۔ مگر مل پھر بھی نہیں سکا۔"

"نام تو اچھا تھا.... مدیحہ!"

"خود بھی زبردست تھی۔" دوسرے نے چٹخارہ لے کر کہا۔

"بیٹی تھی آپ کی؟ یا پھر بھتیجی، بھانجی ہوگی۔"

اب تک حمید احمد ضبط کررہے تھے۔ اب ان سے برداشت نہیں ہوسکا۔ "جو بھی تھی ' تمہیں اس سے مطلب؟"

"مطلب تو ہے۔ آپ نے مجھے گرادیا تھا اس کے لئے۔"

"تو سوری کہہ دیا نا۔"

"سوری سے کیا ہوتا ہے۔ یہ بتائیں کہ وہ لڑکی....."

"اب ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

ایک لڑکے کے تیور بگڑے۔ لیکن دوسرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چھوڑ یار ' جانے دے۔ چھو بھی دیا تو 302 کا کیس بن جائے گا۔ نکل لے یہاں سے۔"

لڑکے دوسری طرف چلے گئے۔ سگنل بند ہوگیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا ' وہ اس پر غور کرنے لگے۔ وہ سب بے حد حیرت انگیز تھا ان کے لئے۔ وہ ان کے مزاج کے خلاف ہی نہیں تھا۔ مزاج کے برعکس تھا۔ ایسے کسی لڑکی کے پیچھے بھاگنا ' خواہ وہ مدیحہ ہو ' اس کا وہ پہلے تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یہ کون سی کیفیت تھی کہ وہ ایسا کر گزرے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں کہ انہیں اس طرح دوڑتے دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔ کیا وہ ہوش و حواس میں نہیں تھے؟

لیکن نہیں.... وہ جانتے تھے کہ یہ بات نہیں۔ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھے۔ یہ سب کچھ لاشعوری طور پر نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے شعوری طور پر کیا تھا۔ دوڑنا تو ایک طرف 'وہ ان لڑکوں سے الجھ رہے تھے۔ ذہنی طور پر ان سے ہاتھاپائی کے لئے تیار تھے۔ لڑکوں کی چھینٹے بازی پر انہیں شرمندگی نہیں ہوئی تھی۔ شدید ترین غصہ آیا تھا۔ ورنہ ان کا فطری رد عمل تو شرمندگی ہی کا ہونا چاہئے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی بے خبری میں بہت بدل چکے تھے۔ شرمندہ ہونے والے ہوتے تو دوڑتے ہی کیوں؟ اور انہیں تو اب بھی اس پر شرمندگی نہیں تھی کہ وہ بیچ سڑک پر دو کم عمر لڑکوں کے ساتھ لڑائی بھڑائی پر آمادہ تھے۔ قصور تو لڑکوں کا تھا۔ وہ کتنی رکیک گفتگو کر رہے تھے۔ یہ تو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کتنے بدل گئے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ اور وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں' جو انہیں معلوم نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک پیچیدہ سوال تیار کیا' جس کا جواب ناممکن نہیں تو بہت مشکل بہر حال تھا۔ انہوں نے خود سے سوال کیا کہ اگر وہ مدیحہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو کیا کرتے۔ اب دیکھیں، کتنی دیر میں جواب ملتا ہے۔ کیا جواب ملتا ہے؟ اور ملتا بھی ہے یا نہیں۔

ان کی حیرت بڑھ گئی۔ جواب تو ان کے پاس تیار موجود تھا اور وہ جواب بھی حیرت انگیز تھا۔ وہ مدیحہ کے پاس پہنچتے 'اس سے بات کرتے۔ پوچھتے کہ وہ کہاں کھو گئی تھی۔ وہ بتاتے کہ انہوں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا' وہ وقت آنے پر پورا کیا۔ اور اب وہ اس کے روبرو اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ملے نہ ملے' اس بات کی انہیں زیادہ پروا نہیں۔

اور اگر وہاں لوگ جمع ہوتے، تب بھی....؟ ذہن نے نکتہ اٹھایا۔

لوگوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور محبت کوئی شرمندگی کی چیز نہیں۔ ہاں.... لوگ جمع ہو جاتے تو وہ یہ بات وہاں کرنے کے بجائے مدیحہ کو اپنے گھر لے جاتے اور وہاں اسے یہ سب کچھ بتاتے۔ یہ تو ان پر قرض ہے محبت کا۔

اور مدیحہ بتاتی کہ اس کی شادی ہو چکی ہے، تو تم کیا کرتے؟ ذہن نے ایک اور سوال اٹھایا۔

میں اپنی تقدیر پر شاکر ہو جاتا۔ انہوں نے بے ساختہ جواب دیا۔ اور میں اس سے ایک اور

وعدہ کرتا اور اسے عمر بھر نبھاتا۔ یہ کہ میں اس سے خاموش محبت کرتا رہوں گا۔ کبھی اس کے سامنے نہیں آؤں گا کبھی اس سے کچھ مانگوں گا نہیں۔ اور اسے کبھی کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گا۔

دکان میں وہ وقت انہوں نے جیسے تیسے گزارا۔ اس کے بعد ان سے کچھ پڑھا نہیں گیا۔ وہ بیٹھے دکان کے سامنے سے گزرنے والوں کو دیکھتے رہے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اب مدیحہ کے یہاں سے گزرنے کا کوئی امکان نہیں۔

رات انہوں نے مدیحہ کو پکارا اور وہ آئی تو انہوں نے پورا واقعہ اسے پوری تفصیل سے سنا دیا۔ خود سے ہونے والے سوال و جواب بھی اسے سنا دئے۔ وہ نگاہوں میں بے یقینی لئے انہیں دیکھتی رہی۔ "آج کل آپ ادب بہت زیادہ پڑھ رہے ہیں۔" ان کی بات سننے کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ نے بہت خوب صورت افسانہ سنا دیا ہے مجھے۔"

"یہ افسانہ نہیں، سچ مچ گزری ہے مجھ پر۔"

"میں مان ہی نہیں سکتی۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر آہ بھر کر بولی۔ "آپ ایسے کہاں ہیں۔ آپ تو دنیا سے ڈرنے والے آدمی ہیں۔ کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ آپ ہی آپ بے وجہ مسکرانے سے بھی ڈرتے ہیں کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ آپ تو بس یہ سوچتے رہتے ہیں کہ معاشرے میں کیا مستحسن ہے اور کیا معیوب۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایسا ہی ہوا تھا۔" حمید احمد نے زور دے کر کہا۔ "بلکہ میں خود بھی حیران ہوا کہ میں اتنا بدل گیا ہوں۔ اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔"

مدیحہ چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر وہ مسکرائی۔ "واقعی.... یہ تو کمال ہو گیا۔"

"مگر کیسے ہوا؟"

"یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ بس خود بخود ہو گیا۔"

"ایسے ہی ہوتا ہے۔ آدمی اپنی طبیعت 'اپنے مزاج کے تحت ملے ہوئے تمام اختیارات

سے خود ہی دستبردار ہو جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ دل کے آئینے میں جو انا کا بال تھا' وہ دور ہو گیا۔ آئینہ صاف ہو گیا۔ آپ کی محبت کامل ہو گئی۔"

"مگر اس سے مجھے کیا حاصل ہو گا؟"

مدیحہ ہنسنے لگی۔ "ارے.... آپ تو پروفیسر سے کاروباری ہو گئے۔ محبت میں بھی کاروبار کرنے لگے۔"

"نہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ یہ تو معلوم ہے کہ مجھے بہت کچھ حاصل ہو گا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اب بہت کچھ ملے گا آپ کو۔ خود دیکھ لیجئے گا۔ ایک بات میں بتا سکتی ہوں۔ اب آپ کو کبھی مجھے پکارنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں بغیر بلائے ہی آ جایا کروں گی۔" مدیحہ نے گہری سانس لی۔ "اچھا.... اب آپ سو جائیں۔"

اور وہ لمحوں میں سو گئے۔

مدیحہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس رات کے بعد انہیں کبھی مدیحہ کو پکارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اور اس کا آنا رات کی تنہائی تک محدود نہیں رہا۔ وہ تو دکان میں بھی ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ ہاں' ایسے میں وہ اس سے باتیں نہیں کرتے تھے۔

اور حمید احمد کو اور بھی بہت کچھ ملا۔ خوب صورت سی ایک مسلسل بے خودی تھی' ایک ٹرانس تھا' جس میں وہ جی رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ سب کچھ اچھا... صرف اچھا لگتا تھا۔ ہر شخص پر انہیں محبت آتی تھی۔ ہر ایک کی ہر غلطی وہ معاف کرنے پر تیار رہتے تھے۔ کسی کی زیادتی انہیں زیادتی نہیں لگتی تھی۔ کوئی بدصورتی انہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔ ہر طرف خوب صورتی ہی خوب صورتی تھی' وہ بہت خوش تھے.... مگن تھے۔

ایک رات مدیحہ نے کہا۔ "اتنی خوب صورت کیفیتیں مل گئیں آپ کو۔ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟"

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "واقعی.... کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا۔"

"حالانکہ آنا چاہئے۔ محبت ہی تو بندے کو معبود کے قریب کر دیتی ہے۔ بس غرض سے

ں، سچی محبت ہونی چاہئے۔"

"وہ کیسی ہوتی ہے؟"

"دنیا کی ہر چیز سے آدمی محبت محسوس کرے۔ یہ سوچ کر کہ اسے اللہ نے بنایا ہے' اور ں محبت سے بنایا ہے۔"

"یہ محبت تو مجھے ہر چیز' ہر شخص پر آتی ہے۔"

"بس تو آپ کے لئے عبادت ضرورت ہو گئی۔" مدیحہ نے کہا۔ "اب یہ سوچیں کہ ادت کو سائنس بنائیں گے یا آرٹ۔"

مید احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا کا ہر کام سائنس بھی ہے اور آرٹ بھی۔ یہی عبادت کا ہے۔ ں سمجھ کر کرو تو سائنس۔ محبت سے کرو تو آرٹ۔"

"میں گناہ گار تو سجدے کے نام پر ٹکریں ہی مار سکتا ہوں۔ میری عبادت کو آرٹ کا درجہ ں مل سکتا ہے۔" حمید احمد نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں' آدمی کی یہ بساط کہاں۔ لیکن دل میں لگن ہو تو اللہ خود ہی نواز دیتا ہے۔ آپ نماز رع تو کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ صبح سے شروع کروں گا۔"

"صبح سے کیوں۔ ابھی سے کیوں نہیں۔ کہتے ہیں کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔"

یوں انہوں نے نماز شروع کر دی۔ اور ابتدا ہی سے یہ حال ہوا کہ نماز کا وقت ہوتا تو وہ ں بھی ہوتے' تڑپ جاتے۔ اور جب تک نماز نہ پڑھ لیتے' انہیں چین نہ آتا۔

یکھتے ہی دیکھتے زندگی پرسکون جھیل بن گئی۔ ان کے اندر ٹھہراؤ تھا' طمانیت تھی۔ کہیں ا خوف نہیں تھا لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس جھیل میں کنکر نہیں' کوئی بہت بڑا پتھر گرنے اہے۔ پھر جھیل کا پانی متلاطم ہو جائے گا۔

☆

وحید کا عجیب حال تھا۔ دو کیفیتوں کے بین بین اس کی زندگی گزر رہی تھی۔ اس کا محور اب بھی ڈاکٹر جبیں ہی تھیں۔ بس سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ اور اس سے بہت بڑا فرق پڑا تھا۔ کم از کم پڑھائی کی طرف سے اسے پریشانی نہیں رہی تھی۔

یونیورسٹی میں دو سمسٹر مکمل ہو چکے تھے۔ تیسرا چل رہا تھا۔ پہلے سمسٹر میں اس کی پڑھائی ڈسٹرب رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ کلاس میں دوسرے نمبر پر رہا تھا۔ پہلا سمسٹر مکمل ہونے سے پہلے اس کی ڈاکٹر جبیں سے بات ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہی اس میں انقلابی تبدیلی آئی تھی۔ اور اللہ کا شکر کہ وہ بہت اچھی تبدیلی تھی۔

اس دن کو وہ بھولا نہیں تھا۔ وہ تو اس کی یادداشت پر مرتسم ہو کر رہ گیا تھا۔ پچھلے چار مہینوں میں متعدد بار وہ اسے دہرا چکا تھا۔

وہ دن اس کے لئے حیرت کا بھی تھا۔ اصولاً ڈاکٹر جبیں سے ملاقات کے بعد اسے مایوسی ہونی چاہئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر جبیں کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے وہ ایسا ہلکا پھلکا تھا' جیسے کوئی بہت بھاری بوجھ اتار کر وہاں سے نکلا ہو۔

گھر پہنچ کر بڑے سکون سے اس نے ڈاکٹر جبیں سے گفتگو کو یاد کیا اور اس کی روشنی میں خود کو ٹٹولا۔ اس کے نتیجے میں اسے ڈاکٹر جبیں پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ اس نے جان لیا کہ وہ بہت عظیم خاتون ہیں.... اپنے ظاہری قد سے بہت بڑی! یہ انہی کا کمال تھا کہ وہ پرسکون تھا اور خود کو بہت ہلکا پھلکا اور ہر بوجھ سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اتنی نازک صورت حال کو اتنی خوب صورتی سے بھی ہینڈل کر سکتا ہے کہ نہ خود کو شرمندگی ہو' نہ دوسرے کو۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر جبیں نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

اب وہ سوچ سکتا تھا' سمجھ سکتا تھا کہ وہ ان سے کتنی ٹیڑھی اور مشکل بات کرنے کے لئے

تھا۔ اور وہ بات کرتا تو کیا ہوتا۔ خوب صورت، نازک اور لطیف باتوں کو اظہار راس نہیں ں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ کمیاب ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں' وہ بھی ہلکے ہی ہوتے ۔ وہ بس جذبے کو حقیر کر سکتے ہیں' مجروح کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جبیں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ نا پر آنے کے بعد بڑی بات بھی چھوٹی ہو جاتی ہے۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ اسے کہنا تھا' وہ کہنے کے بعد کتنا گھٹیا اور عامیانہ لگتا۔ حقیقت کہ اس صورت میں اسے عمر بھر شرمندگی رہتی۔ مگر ڈاکٹر جبیں نے اپنے غیر معمولی ت اقدام سے اسے بچا لیا تھا۔ انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی خاتون ۔ عام عورتیں تو ایسے معاملات میں سب کچھ سننے کے بعد بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ۔ انڈرسٹنڈ ہوں تب بھی' اور نہ ہو تب بھی۔ کوئی عورت کبھی یہ نہیں کہتی کہ میں سمجھ گئی ں' تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی کہ وہ غیر شادی شدہ تھیں۔ وہ تو ایسی تھیں کہ وہ سمجھ سکتا کہ ان پر رشتے برسے ہوں گے۔ وہ غیر شادی شدہ تھیں تو اس کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ ں کسی سے محبت تھی اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایسے لوگ.... خاص طور پر ایسی تین تو بہت ہی محترم ہوتی ہیں۔

وہ راست گو تھیں۔ بہت بولڈ تھیں۔ انہوں نے اسے بہلانے کی۔ پہلو تہی کرنے کی شش نہیں کی۔ انہوں نے عمر کے فرق کو مسئلہ نہیں بنایا۔ انہوں نے ٹیچر اور اسٹوڈنٹ تعلق کو مسئلہ نہیں بنایا اور انہوں نے اس کی محبت کی تحقیر نہیں کی۔ مذمت بھی نہیں ۔ انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ اس نے ان سے شادی کے بارے میں سوچا تو یہ کوئی بری ہے۔ انہوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ، کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کہا۔ انہوں نے کہا کہ ت ایک بے اختیار جذبہ ہے اور کسی کو بھی کسی سے محبت کرنے کا حق ہے لیکن اسے یہ ار کھنا چاہئے کہ وہ دوسرے کے استحقاق کو مجروح تو نہیں کر رہا ہے۔ انہوں نے اس پر حکم نہیں لگایا۔ انہوں نے ترکِ محبت کو نہیں کہا اس سے۔ انہوں نے اسے بہت ے.... اور قابل عمل مشورے دیئے۔

اور انہوں نے اسے کتنی عزت، کتنی خود اعتمادی دی۔ انہوں نے اسے اچھا کہا۔ اس سے بت کا اعتراف کیا۔ اور یہ کوئی زبانی بات نہیں تھی۔ انہوں نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور

اس سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔ انہوں نے جتا دیا تھا کہ وہاں اس سے پہلے ان سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ یہ کم اعزاز نہیں تھا۔

اور انہوں نے اسے ترغیب دی کہ وہ ان سے اپنی محبت کو مثبت انداز میں عملی طور پر ثابت کرے۔ انہوں نے کہا.... میں چاہتی ہوں کہ تم ٹاپ کرو۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بڑی محنت اور لگن سے وہ کام کرو' جو تمہیں کرنا چاہیے۔

اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ ترغیب اس کے وجود کی گہرائی میں اتر گئی ہے۔

اگلے روز اس نے ڈاکٹر جبیں کی کلاس اٹینڈ کی تو اس کے دل میں ان کی عظمت کا نقش اور گہرا ہو گیا۔ جس طرح کی گفتگو وہ ان سے کرنے گیا تھا' اس کے دو ہی رد عمل ہو سکتے تھے۔ وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتیں تو سب ٹھیک ہو جاتا اور وہ انکار کرتیں، اسے اس جسارت پر ڈانٹتیں تو وہ زندگی بھر ان کا سامنا نہ کر پاتا۔ ان کی کلاس اٹینڈ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ رہتا۔ اور یہ بڑا نقصان ہوتا اور اس سے بڑا نقصان یہ ہوتا کہ اس کی پڑھائی بالکل ہی چوپٹ ہو جاتی۔

لیکن انکار کے باوجود معاملہ الٹ تھا اور یہ ڈاکٹر جبیں کا اعجاز تھا' ان کی دانش کا کمال تھا۔ وہ ان کی کلاس میں نہ صرف پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھا تھا بلکہ پہلی بار وہ ان کا لیکچر بہت غور سے سن رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح انہیں ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کی نظر اٹھ جاتی تو وہ خود کو یاد دلاتا کہ اسے اس کا حق نہیں۔ ہاں' وہ اسے احترام اور تقدس کے ساتھ دیکھ سکتا ہے اور کبھی اس کی نظر ڈاکٹر جبیں کی نظر سے ملتی تو ڈاکٹر جبیں کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت اور شفیق مسکراہٹ ابھرتی۔ وہ ایک محرمِ راز کی فخریہ مسکراہٹ تھی' جو کہتی تھی کہ ہمارے راز سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مسکراہٹ یہ بھی تلقین کرتی تھی کہ میری باتیں بھولنا مت۔ انہیں ہمیشہ یاد رکھنا۔

اور وحید ان باتوں کو کبھی نہیں بھولا۔ اس دن سے اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ پڑھائی کی طرف اس کی رغبت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ بلکہ پڑھائی اس کی زندگی کا محور بن گئی۔ در حقیقت تو ڈاکٹر جبیں ہی اس کی زندگی کا محور تھیں۔ ان کی خاطر اس نے انہیں پس منظر بنا دیا اور پڑھائی کو آگے لے آیا۔ اس کے دل میں بس ایک خیال تھا۔ اسے ٹاپ کرنا ہے۔ اسے ڈاکٹر جبیں کی توقع پر پورا اترنا ہے۔ تعلیم کے دوران میں بھی اور تعلیم مکمل

ہونے کے بعد بھی۔

گھر پر اسٹڈی کے دوران میں اب ڈاکٹر جبیں کا تصور اسے کبھی پریشان نہیں کرتا تھا۔ اسے ان کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ وہ سکون سے.... مکمل ارتکاز کے ساتھ پڑھتا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ ان کے تصور سے اس کا واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ فرصت ہوتی تو ان کے تصور کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور رات کو سوتے وقت تو یہ لازم تھا۔

اسے حیرت ہوئی تھی کہ ڈاکٹر جبیں کی محبت نہ ملنے پر اسے مایوسی نہیں ہوئی' نہ وہ جھنجلایا' نہ اسے کوئی دکھ ہوا' نہ اس کی مردانہ انا کو ٹھیس لگی۔ پہلے اس نے سوچا کہ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اسے رد نہیں کیا۔ الٹا انہوں نے اسے قبول کیا' خواہ مختلف حیثیت میں کیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے باوجود فطری رد عمل تو یہی تھا کہ اسے مایوسی ہوتی۔ تو پھر مایوسی کیوں نہیں ہوئی؟

ایک دن اسے اخبار کا وہ ASTROLOGY کالم نظر آ گیا، جو اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اس نے اسے پڑھا تو اس کی سوچیں دوسرے ہی راستے پر چل پڑیں۔ پیش گوئی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آنے لگا۔ یہ خلش بھی دور ہو گئی کہ اسے مایوسی کیوں نہیں ہوئی۔

یہ درست ہے کہ اسے ڈاکٹر جبیں سے محبت ہے۔ مگر کیسی محبت، اس کی نوعیت کیا ہے، اس کا وہ تعین نہیں کر سکا۔ وہ اس سوال پر سوچ سوچ کر الجھتا رہا۔ وہ کسی سے اس پر بات کر لیتا تو مشکل آسان ہو جاتی۔ اصل میں اسے ابو سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ اس نے ارادہ بھی کیا۔ لیکن عین موقع پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اب وہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ابو اس پر اسے ڈانٹیں گے۔ اسے کسی عام لڑکی سے محبت ہوئی ہوتی تو ابو ہر طرح سے اس کی مدد کرتے۔ لیکن یہاں معاملہ ٹیچر کے ساتھ تھا۔ اور ابو خود معلم رہے تھے۔ وہ اس پیشے کا.... اس رشتے کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہیں اس کی یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ بس اسی ڈر کی وجہ سے وہ ان سے بات نہ کر سکا۔

وہ خود ہی اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دادی بیچ میں آ کودیں۔ انہوں نے شادی کا شوشہ چھوڑ کر اسے گمراہ کر دیا۔ وہ سب کچھ بھول بیٹھا۔ اس کے دماغ میں شادی کا خناس سما گیا۔ اس کے بعد کہاں کچھ سجھائی دیتا تھا۔

پیش گوئی میں اشارہ تھا۔ واضح اشارہ تھا کہ وہ کسی سے ملے گا اور اس سے محبت میں مبتلا ہو

جائے گا لیکن وہ بہت مختلف قسم کی ہو گی۔ وہ نہیں ہو گی، جو وہ سمجھ رہا ہو گا۔ اور ایسا اس لئے ہو گا کہ وہ محبت کو ترسا ہوا ہے اور محبت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ پیش گوئی میں لکھا تھا کہ وہ اصل میں محبت سے محبت ہو گی۔ اس کا یہی مطلب نکلتا تھا۔

چلو.... اب تو وہ غور کر سکتا ہے۔ اس نے سوچا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ عام سی جو محبت ہوتی ہے، جس میں آدمی شادی کے خواب دیکھتا ہے، اس میں محبوب کی ظاہری شخصیت کو بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کے جسمانی تقاضے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس پہلو پر سوچتے ہوئے اسے شاک لگا۔ اس نے ڈاکٹر جبیں کے بارے میں اس انداز میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے خوب صورت لگی تھیں لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے لئے ان کی پر وقار شخصیت میں اپیل تھی۔ وہ کلاس کے دوران میں ان کے چہرے کو تکتا رہتا تھا۔ مگر خوب ٹٹولنے.... تلاش کرنے پر بھی وہ اس میں آلودگی کا شائبہ بھی تلاش نہیں کر سکا اور چہرے سے ہٹ کر اس نے ڈاکٹر جبیں کو کبھی نہیں دیکھا تھا.... بلکہ دیکھنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ اس کے لئے جسم نہیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ شادی کا تصور اس پر دادی نے تھوپ دیا تھا۔ اور وہ اس میں بہہ گیا۔

یہی وجہ تھی.... یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ ڈاکٹر جبیں نے بالواسطہ بات کرتے ہوئے شادی کے امکان کو رد کیا تو اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ گھر واپس آنے کے بعد اس نے سکون کی سانس لی تھی۔ یعنی اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات چھپی تھی کہ وہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔

یہاں تک تو بات ٹھیک چلی۔ مگر آگے سے بات نہیں بنی۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر جبیں سے کس طرح کی محبت ہے اور اسے محبت کی ایسی طلب کیوں ہے کہ محبت کی خاطر اسے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔ شاید اس کا تعلق اس کے ماضی سے تھا.... اس کی محرومی سے تھا۔

ماں کا لمس اس کے ان ننھے ہاتھوں کو بھی نہیں ملا تھا، جو بچوں کو عرصہ شیر خواری میں ملتا ہے۔ جو یادداشت میں نہیں ہوتا لیکن بچے کی گہرائی میں کہیں طمانیت بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ تو اس سے بھی محروم رہا تھا۔ امی تو اسے جنم دیتے ہی ختم ہو گئی تھیں۔ مگر محرومی کیسی؟ دادی نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ ماں کی طرح ہی چاہا تھا اسے لیکن شاید ماں کا کوئی نعم البدل نہیں

ہوتا۔ اس محرومی کی تلافی ساری عمر نہیں ہوتی۔ آدمی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس نے کسی نفسیاتی مضمون میں پڑھا تھا کہ جو لڑکیاں کم عمری میں باپ سے محروم ہو جائیں، وہ بڑی عمر کے مردوں میں کشش محسوس کرتی ہیں اور اگر ان کے اختیار میں ہو تو ایسے ہی مردوں سے شادی کرتی ہیں۔ اور کم عمری میں ماں سے محروم ہو جانے والے لڑکے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

تو کہیں میرے ساتھ بھی یہی بات تو نہیں۔ اس نے سوچا۔ کہیں اسی وجہ کے تحت تو میں خود سے آٹھ سال بڑی ڈاکٹر جبیں کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا۔ لیکن اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ یہ بات ہوتی تو اسے ان میں جسمانی کشش تو محسوس ہوتی۔ وہ ان کے جسمانی قرب کے خواب دیکھتا۔ اس کے دماغ پر تو جب ان سے شادی کا بھوت سوار ہوا، تب بھی یہ خیال سے کبھی نہیں آیا۔ وہ بس ہر وقت ان کے ساتھ، ان کے قریب رہنا چاہتا تھا اور وہ پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس کی یہ آرزو بہت معصوم تھی۔

تو پھر یہ محبت کیسی ہے۔ وہ جھنجلا گیا۔ لیکن اس سوال کا جواب ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ پھر اس نے اس پر سوچنا بھی چھوڑ دیا۔

مگر ایک بات طے تھی۔ وہ اب بھی ڈاکٹر جبیں سے اسی طرح محبت کرتا تھا۔ اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ان کی محبت کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ وہ انہیں خوش کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے تو اس نے خود کو پڑھائی میں مصروف کر لیا تھا۔ اور تصور میں ان کا چہرہ اب بھی اسی طرح آتا تھا۔ اور اس کے جذبات بھی پہلے جیسے ہی تھے۔ ہاں، ایک فرق پڑا تھا۔ اب وہ انہیں کلاس میں دیکھے یا تصور میں، اسے یہ خیال آتا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہیں.... یہ بے حد قابل احترام محبت.... اور وہ کسی کی امانت ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کی محبت کی پاکیزگی بڑھ گئی تھی۔

دوسرے سمسٹر میں وہ کلاس میں اول آیا اور بڑے مارجن سے اول آیا۔ ڈاکٹر جبیں نے اسے خاص طور پر مبارک باد دی۔

"مجھے تم پر فخر ہے وحید۔ تم میری توقعات پر پورے اترے ہو۔"

"شکریہ میڈم۔" اس نے کہا۔

"لیکن رکنا نہیں ہے۔ آگے ہی آگے بڑھتے جانا ہے۔" ڈاکٹر جبیں نے کہا۔ "منزل ابھی

دور ہے۔"

"مجھے یاد رہے گا میڈم۔ بس آپ مجھے دعاؤں میں یاد رکھئے۔"

"یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن خود بھی دعا کیا کرو۔"

اور وہ اسے یاد رہا۔ وہ رکا نہیں۔ نئے سمسٹر میں وہ پہلے سے زیادہ محنت کر رہا تھا۔

☆

پھر دادی نے ایک اور دھماکہ کر دیا!

پہلے بھی انہوں نے اس وقت دھماکہ کیا تھا' جب وہ اس کے لئے شام کی چا تھیں۔ اس بار بھی اس وقت انہوں نے کام دکھایا۔ البتہ دھماکے کی نوعیت مختلف تھی۔

وہ اتنا مصروف تھا کہ اسے دادی کے آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ انہوں نے چائے رکھی اور سامنے بیٹھ کر اسے دیکھتی رہیں۔ وہ منتظر تھیں کہ وہ انہیں دیکھے گا، ان سے کرے گا لیکن اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا۔

بالآخر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "یہ تو ہر وقت پڑھتا رہتا ہے۔ نہ اپنا ہو دوسروں کا ہوش۔" انہوں نے بھنا کر کہا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور انہیں دیکھا۔ "کیا بات ہے دادی؟"

"ٹھیک سے سنتا بھی نہیں بات۔" دادی نے کہا اور اپنی بات دہرا دی۔

"کمال ہے دادی۔" اس نے احتجاج کیا۔ "پہلے آپ کو شکایت ہوئی کہ میں بہت رہنے لگا ہوں۔ پھر ایک دن آپ نے کھوئے کھوئے رہنے کی شکایت کی۔ اور آج پڑھا شکایت کر رہی ہیں۔"

"شکایت نہیں ہے یہ۔ سمجھا رہی ہوں۔ اتنا زیادہ پڑھے گا تو صحت تباہ ہو جائے گی۔"

"تو اور کیا کروں۔ کھویا کھویا رہنے لگوں؟" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

دادی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تو' تو نے مان لیا کہ پہلے کھویا کھویا رہتا تھا؟"

"آپ تو بات پکڑ لیتی ہیں خواہ مخواہ۔"

"تو کیا وہ دل سے اتر گئی؟"

"نن.... نہیں۔ نہیں تو۔" وہ بوکھلا گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو وہ اعتراف کر ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"تو خوب جانتا ہے۔ خیر مجھے خوشی ہے کہ تو اداس نہیں ہوا۔ ورنہ ہوتا یہی ہے۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے بے حد عاجزی سے کہا۔

"میں تو سیدھی سی بات کرتی ہوں۔ کوئی لڑکی پسند کر لے۔ شادی کر کے دادی کا ارمان پورا کر دے۔"

"دادی' سچی بات یہ ہے کہ مجھے کوئی لڑکی پسند آ ہی نہیں سکتی۔" اس نے بے حد سچائی سے کہا۔ "یہ شرط ہے تو میری شادی کبھی ہو گی ہی نہیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" دادی نے گھبرا کر کہا۔ پھر مسکرائیں۔ "تو کہے تو میں تلاش کروں کوئی لڑکی۔"

وحید چند لمحے سوچتا رہا۔ اب ڈاکٹر جبیں کا تو سوال ہی نہیں تھا اور اسے کوئی اور پسند آ ہی نہیں سکتا۔ مگر شادی تو کرنی ہے۔ اپنے لئے نہیں تو دادی کے لئے سہی۔ اس نے دادی کو بڑی محبت سے دیکھا۔ کیسا ارمان ہے انہیں اس کی شادی کا.... گھر میں بہو لانے کا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے دادی۔"

دادی خوش ہو گئیں۔ "یہ ہوئی نا بات۔ تو بھی خوش ہو جائے گا دادی کا ذوق دیکھ کر۔"

"لیکن دادی' پہلے میری پڑھائی ختم ہونے دیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ارے ہوتی رہے گی پڑھائی بھی۔" دادی نے بے پروائی سے کہا۔ "شادی کوئی روکتی ہے پڑھائی سے۔"

"آپ جانیں اور ابو جانیں۔" اس نے کہا۔

دو تین دن بعد اس نے دادی کو اس سلسلے میں ابو سے بات کرتے سنا۔ "اماں.... اسے پڑھائی تو مکمل کرنے دیں۔" ابو نے اس کی توقع کے عین مطابق کہا۔

"تمہیں میری تو بالکل فکر نہیں ہے نا۔" دادی نے آنکھیں نکالیں۔

ابو گھبرا گئے۔ "کیا ہوا اماں؟ خیریت تو ہے؟ طبیعت خراب ہے کیا۔"

"طبیعت بالکل ٹھیک ہے میری۔" دادی نے غصے سے کہا۔ "میرا بہو کا ارمان تم نے تو پورا نہیں کیا۔ اب پوتے کو بھی پورا نہیں کرنے دو گے۔"

"یہ بات نہیں ہے اماں۔ میں اس کی پڑھائی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

"اتنا تو پڑھاکو ہے وہ۔ کچھ بھی کر لو، فیل ہو ہی نہیں سکتا۔"

"آپ سمجھتی تو ہیں نہیں۔" ابو نے بے بسی سے کہا۔ "بات فیل ہونے کی نہیں وہ فرسٹ آنا چاہتا ہے.... اور اسے آنا چاہئے۔ پاس تو وہ ہر حال میں ہو جائے گا۔ کیا آپ یہ پسند کریں گی کہ وہ جس مقام کا حق دار ہے، اس سے محروم ہو جائے۔"

"یہ سب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر ہو گا یہ کہ میں ارمان دل میں لئے دُنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔"

ابو ہنسنے لگے۔ "آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔ تندرست ہیں۔ پورا گھر چلاتی ہیں اور بات کرتی ہیں دنیا سے رخصت ہونے کی۔"

"تو تم اس کی پڑھائی مکمل ہونے تک میرے زندہ رہنے کی ضمانت دے رہے ہو؟" دادی نے چڑ کر کہا۔

"توبہ توبہ اماں۔" ابو نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "موت کا عمر سے کیا تعلق۔ زندگی کی ضمانت تو جوانوں کی بھی نہیں دی جاسکتی۔"

بالکل.... زندگی کی ضمانت تو میری بھی نہیں۔ یہ تو اللہ کا بھید ہے کس کو کتنی زندگی ملی ہے۔ وحید نے دل میں کہا۔

"بیٹا' دیکھ میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔"

"بیٹھی رہئے۔ کون جانے 'وہ کسی اور کی قبر ہو۔" ابو نے شوخی سے کہا۔ "اور سنیں، بس سال سوا سال کی بات ہے۔ پھر وحید کی تعلیم مکمل ہو جائے گی۔"

"سال سوا سال۔" دادی نے مایوسی سے دہرایا۔ پھر اچانک چہک کر بولیں۔ "چلو ٹھیک ہے۔ یہی سہی۔ میں لڑکی تو تلاش کر سکتی ہوں وحید کے لئے۔"

"کیا پتہ' وحید کو کوئی پسند ہو۔"

"اسے کوئی پسند نہیں آسکتی۔ اس نے اختیار دے دیا ہے مجھے۔ مگر پھر بھی میں اسے دکھا کر پوچھوں گی ضرور۔"

"چلیں.... ٹھیک ہے۔"

"اور منگنی کر دیں گے۔ اس سے تو پڑھائی میں حرج نہیں ہو گا۔" دادی نے معصومیت سے کہا۔

اب ابو میں ان کی دل آزاری کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے اماں۔ وحید

کو اعتراض نہیں تو آپ اپنی خوشی کر لیں۔"

چنانچہ اماں نے بڑے زور و شور سے بہو کی تلاش شروع کر دی۔ گھر میں رشتہ کرانے والی عورتوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ وحید کو تصویریں دکھائی جانے لگیں۔ لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دادی خود ہی لڑکی کو مسترد کر دیتی تھیں۔ وحید کو اندازہ ہو گیا کہ دادی کا معیار اتنا بلند ہے کہ لڑکی آسانی سے نہیں ملے گی۔

لیکن اس بار بھی دادی نے اس کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ کسی لڑکی کی تصویر دیکھتا تو ایک لمحے کو وہ چہرہ نظر آتا اور اس کے بعد جیسے جادو کے زور سے اس چہرے کے اوپر ڈاکٹر جبیں کا چہرہ آجاتا۔ پھر اس چہرے کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا۔

ویسے سب کچھ ٹھیک تھا۔ دادی کی سرگرمیوں سے وہ ناخوش ہرگز نہیں تھا۔ کوئی بھی تصویر دیکھ کر اس کے اندر ناپسندیدگی نہیں ابھرتی تھی۔ بلکہ یہ خیال اس کے لئے خوش کن تھا کہ اس کی شادی ہو گی۔ وہ متجسس ہو جاتا کہ شادی کے بعد کیا ہو گا۔ زندگی کیسی گزرے گی۔ یہ تو طے ہے کہ زندگی یکسر بدل جائے گی۔ کوئی اس کی زندگی میں' معمولات میں' اس کے معاملات میں شریک ہو جائے گا۔ کیسا ہو گا یہ تجربہ.... وہ خوش رہے گا یا....؟

اس کے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پاتا تھا۔ دراصل اسے معلوم نہیں تھا کہ ازدواجی زندگی کیا ہوتی ہے۔ کیسی ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ رخ اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی اس حوالے سے وہ وسوسوں کا شکار ہو جاتا۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے مزاج میں بہت فرق ہو اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ سمجھوتا نہیں کر پاتے۔

مگر تصویر کے معاملے سے بھی بڑھ کر تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ ازدواجی زندگی کا تصور کرتا تو اسے ڈاکٹر جبیں نظر آتیں۔ جب مسلسل یہی ہوتا رہا تو وہ پریشان ہو گیا۔ کیونکہ وہ تصور میں آتیں تو اسی طرح' جیسی وہ ہمیشہ انہیں دیکھتا تھا.... پوری پاکیزگی کے ساتھ۔ اس کے اندر' اس کے جذبے میں کوئی کیمیاوی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی یہی سوچتا تھا کہ وہ بے حد محترم.... بلکہ مقدس ہستی ہیں۔ ان کے دل میں جس کسی کے لئے بھی محبت تھی' وہ اب بھی اس کے لئے محترم تھا۔ وہ اب بھی یہی سوچتا تھا کہ وہ کسی کی امانت ہیں بلکہ وہ ان کے لئے دعا کرتا کہ وہ اپنی منزل کو پالیں۔

یہ بات وہ پوری سچائی سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر جبیں سے شادی کے خیال سے دستبردار

ہو چکا ہے۔ اب الجھن یہ تھی کہ وہ تصویر میں انہیں اپنے گھر میں، اپنے ساتھ کیوں دیکھتا ہے۔ یہ کوئی نفاق ہے۔ لیکن نہیں، وہ سوچوں میں، تصور میں ان کے تقدس کا خیال رکھتا ہے۔

یہ الجھن وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ اس پر ابو سے بات کرے۔ لیکن پچھلا تجربہ یاد آتا تو حوصلہ جواب دے جاتا اور کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ اس موضوع پر بات کر سکتا۔ ابو کہتے تھے' والدین سے اچھا دوست کوئی نہیں ہوتا۔

اسے ہمیشہ اس بات کا بہت شدت سے احساس رہا تھا کہ وہ ماں جیسی عظیم نعمت سے محروم ہے۔ مگر اس مرحلے پر ماں کی کمی اسے اور شدت سے محسوس ہوئی۔ اگر اس کی امی ہوتیں تو اس وقت وہ ان سے بات کر سکتا تھا۔ وہ ابو سے کھل کر بات نہیں کر سکتا لیکن آدمی ماں سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور امی ہوتیں تو یقیناً سمجھ جاتیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ سچائی کیا ہے اور مسئلے کا حل کیا ہے۔

وہ پڑھتے پڑھتے اٹھا اور جا کر ابو کے کمرے سے ابو کی شادی کا البم لے آیا۔ وہ البم اس کا بہت پرانا رفیق تھا۔ اسے کوئی پریشانی ہوتی، امی کی کمی محسوس ہوتی تو وہ البم کھولتا اور دلہن بنی امی کی کوئی تصویر سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر وہ ان سے باتیں کرتا رہتا.... اکیلے ہی اکیلے.... پاگلوں کی طرح! اس وقت بھی اس نے سوچا کہ اپنی الجھن امی کو بتا دی جائے۔ کم از کم بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔

البم کھولتے وقت اسے خیال آیا کہ پچھلے دو سال میں ایک بار بھی اس نے امی سے بات نہیں کی۔ اس نے البم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یہ تو مجرمانہ بے نیازی ہے۔ خیر.... ماں کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ اولاد کی بڑی سے بڑی زیادتی کو معاف کر دیتی ہے۔

اس نے البم کھول کر ماں کی تصویر کو دیکھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ تصویر کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال جم گیا.... چھایا اور ساکت ہو گیا تھا۔ اور اسے موہوم سا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ہر الجھن دور ہونے والی ہے۔

وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ یہ وہم ہے، فریب نظر ہے یا حقیقت۔ امی کی تصویر دیکھتے ہی اس کے ذہن میں ڈاکٹر جبیں کا چہرہ ابھرا تھا۔ یہ ویسا معاملہ نہیں تھا، جو دادی کی منتخب کردہ لڑکیوں کی تصویریں دیکھتے وقت ہوتا تھا۔ یہاں امی کی تصویر کسی تبدیلی کے بغیر اس کے

سامنے تھی اور ذہن کی اسکرین پر ڈاکٹر جبیں کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

وہ دونوں کا موازنہ کرتا رہا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ ایسی ہی عجیب اور سنسنی خیز دریافت تھی۔ ڈاکٹر جبیں میں امی کی یقینی' واضح اور بہت زیادہ مشابہت تھی۔

اس نے البم کو بند کیا اور ڈاکٹر جبیں کو تصور میں دیکھا۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ بات فریب نظر کی نہیں۔ ڈاکٹر جبیں درحقیقت اس کی امی سے بہت مشابہ تھیں۔ تو پھر یہ کیوں ہوا کہ اسے پہلے کبھی اس مشابہت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ تو عجیب سی بات ہے۔

اس نے پھر البم کھولا اور امی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ اب وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ عجیب اور غیر معمولی مشابہت تھی۔ ایسی مشابہت جسے سرسری نظر سے دیکھ کر محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دونوں کے نقوش مختلف تھے مگر چہرے کا اوپری حصہ' پیشانی' بھویں' آنکھیں ایک جیسی تھیں اور شاید اس کی بے خبری کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے دو سال سے امی کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔

وہ مشابہت کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اب اسے غور کرنا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ شاید اسی میں اس کی الجھن کا حل موجود تھا۔

اور جواب مشکل نہیں تھا۔ شعوری طور پر اس نے ڈاکٹر جبیں سے وہ محبت کی' جو ایک مرد کو عورت سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا لاشعور شاید مشابہت تلاش کر چکا تھا اور لاشعوری طور پر شاید اس نے ڈاکٹر جبیں کو امی کی جگہ دے دی تھی اور لاشعور کی محبت اتنی طاقت ور تھی کہ اس نے شعور کو' اس محبت کو ستا نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کو پاکیزگی دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ نتیجہ نکالنے کے بعد اسے خود پر شرم آتی۔ کوئی جسے محبوبہ سمجھتا رہا ہو' اسے ماں سمجھنے لگے تو قدرتی عمل یہی ہوگا اور بہت شدید ہوگا۔ خواہ وہ پاکیزہ اور تقدس آمیز محبت ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کا ردعمل برعکس تھا۔ اس کے اندر ایسی خوشی امنڈی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ایک لمحے میں ساری گرہیں کھل گئیں۔ وہ اپنے گھر میں انہیں اپنے ساتھ دیکھتا تھا.... تو وہ ماں کے ساتھ رہنے کی خواہش تھی۔ اسی لئے ڈاکٹر جبیں سے ان کے گھر پر ملاقات کے بعد وہ مایوس اور دل گرفتہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا اس لئے اس نے آسانی کے ساتھ اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔ اس لئے وہ اس کے نزدیک اور محترم....

بلکہ مقدس ہو گئی تھیں۔

تو اس کا تصور.... ڈاکٹر جبیں کو اپنے گھر میں دیکھنے کا تصور اگر حقیقت بن جائے تو؟ اس خیال نے ہی اسے ایکسائیٹڈ کر دیا۔ واہ.... زندگی بدل جائے۔ دادی بھی خوش، ابو بھی اور وہ بھی۔ اور اس کی محرومی کی کیسی بھرپور تلافی ہو جائے گی۔"

اور یہ کیا مشکل ہے۔ وہ ابو سے کہے گا کہ انہوں نے اسے امی لا کر دینے کا جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا کریں۔ وہ کہے گا کہ اس نے خود اپنے لئے امی تلاش کر لی ہے۔ ابو ضرور بحث کریں گے لیکن وہ انہیں منا لے گا اور اگر وہ نہیں مانتے تو دادی تو ہیں۔ وہ انہیں بتائے گا.... اور دادی ان سے یہ بات منوا کر رہیں گی۔

اور اب وہ ڈاکٹر جبیں کے سامنے سر اٹھا کر جائے گا۔ انہیں سب کچھ بتا دے گا۔ وہ ان سے کہے گا کہ وہ اس کی امی بن جائیں۔ اس کے ابو سے شادی کر لیں۔

لیکن پہلے ابو سے.... اور دادی سے بات کر لی جائے۔ وہ ابو کے پاس جانے کے ارادے سے اٹھا۔ اور اسی وقت اس کے اندر ایک آواز ابھری۔ یہ ناممکن ہے۔ ڈاکٹر جبیں اس بار بھی وہی جواب دیں گی۔ وہ کسی سے محبت کرتی ہیں.... اور اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ وہ اس کے علاوہ دنیا کے کسی مرد سے محبت نہیں کر سکتیں۔

اسے لگا، سینے میں کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ یہ جواب اس نے ڈاکٹر جبیں کے منہ سے روبرو سنا تھا تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہی جواب تصور میں ابو کے لئے سننا بے حد اذیت ناک تھا۔ ابھی تو وہ خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ کانچ کا خواب ٹوٹ گیا۔

وہ وہیں کھڑا تھا کہ اس کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اسے چکر آیا۔ بینائی غائب ہوئی اور وہ گرنے لگا۔ یہ وہی تکلیف تھی' جو اسے ہوتی رہتی تھی۔ مگر گرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس بار معاملہ سنگین ہے۔ درد تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا.... اور وہ بھی ایسا شدید اور اذیت ناک درد۔

پھر درد اور بڑھ گیا۔ وہ اپنی چیخ نہیں روک سکا۔

☆

وحید کی اذیت ناک چیخ سن کر حمید احمد اور بلقیس بیگم اس کے کمرے کی طرف لپکے۔ وہ کمرے میں گھسے تو وحید نیچے گرا ہوا تھا اور پوری قوت سے سر کو فرش پر مار رہا تھا۔ بلقیس بیگم

کا تو دل دھک سے رہ گیا۔ حمید احمد بیٹے کے پاس بیٹھے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ "کیا ہوا بیٹے.... کیا بات ہے؟"

وحید ان کے قابو میں نہیں آیا۔ وہ سر فرش سے ٹکرائے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے....؟"

"کوئی چیز.... میرے سر میں.... کاٹ رہی ہے۔ بہت تکلیف...." وحید سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

بلقیس بیگم کچھ پڑھنے لگیں۔ انہوں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سر پٹخے جا رہا تھا۔ وہ پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتی رہیں۔ حمید احمد اسے سر ٹکرانے سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔

کسی کو وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ذرا دیر میں وحید کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ اب وہ فرش سے سر نہیں ٹکرا رہا تھا۔ لیکن اب بھی وہ اپنے سر پر پوری قوت سے گھونسے مار رہا تھا۔

"نہیں کرو بیٹے' ایسا نہیں کرو۔" حمید احمد رونے لگے۔ "میں سر سہلا دیتا ہوں۔ اماں دم کر دیں گی۔"

"بہت تکلیف ہے ابو۔" اب وحید دردناک آواز میں رو رہا تھا۔ "یہاں کوئی موذی دشمن بیٹھا ہے ابو۔" اس نے سر پر گھونسا مارا۔

"ہوا کیا ہے بیٹے؟"

"اچانک درد اٹھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے ابو۔"

حمید احمد اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ تکلیف کم ہونے کے باوجود وہ بہت زیادہ تکلیف میں ہے۔ وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بتاتا رہا۔ اور جو کچھ اس نے بتایا' اسے سن کر حمید احمد کا دل ڈوبنے لگا۔ "تم نے بہت برا کیا بیٹے۔ تمہیں پہلے بتا دینا چاہئے تھا۔" وہ بڑبڑائے۔

بلقیس بیگم نے سہارا دے کر وحید کو بستر پر لٹا دیا۔ اتنی دیر میں وہ بدل کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ تکلیف اب بھی اتنی تھی کہ اس کے جسم کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ پھر درد ختم ہونے کے نتیجے میں یا درد ناقابل برداشت ہونے کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

بلقیس بیگم نے سر اٹھا کر حمید احمد کو دیکھا۔ "یہ کیا ہوا بیٹے؟"

حمید احمد اب بری طرح کانپ رہے تھے۔ "اماں.... خدانخواستہ.... یہ وہی پرانی والی تکلیف...." ان سے بات پوری نہیں کی گئی۔ "اماں.... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" انہوں نے بچوں کی طرح کہا۔

بلقیس بیگم خود بہت پریشان تھیں۔ لیکن اس وقت انہیں دلاسا بھی دینا تھا۔ "پریشان نہ ہو بیٹے۔" انہوں نے حمید احمد کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو۔ اللہ سے اچھی امید رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

حمید احمد بلک بلک کر رونے لگے۔ "اماں.... یہی تو میری نسلوں کا امین ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گا۔ اماں، میں مر جاؤں گا۔"

نہ جانے کہاں سے 'کیسے بلقیس بیگم کے وجود میں طاقت کا ایک سرچشمہ پھوٹ نکلا۔ "ایسا کچھ نہیں ہو گا انشاء اللہ۔" انہوں نے کہا۔ "تم خود کو سنبھالو۔ یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے؟"

حمید احمد جیسے ہوش میں آ گئے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "ہمیں اسے ہسپتال لے کر جانا ہے اماں۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔"

حمید احمد جاتے جاتے پلٹے۔ انہوں نے پر تشویش نگاہوں سے بیٹے کو اور پھر بوڑھی اماں کو دیکھا۔ "اماں.... خدانخواستہ پھر دورہ پڑ گیا....؟ تو آپ کیسے سنبھالیں گی اسے....؟"

"تم جاؤ۔ جاتے ہوئے برابر والوں کو کہتے جانا۔ وہ آ جائیں گے۔"

حمید احمد باہر نکل گئے۔ انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ ٹیکسی بھی آسانی سے نہیں ملی۔ وہ ٹیکسی لے کر آئے۔ ٹیکسی گھر کے سامنے رکی۔ وہ اترے 'گھر کے اندر سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اندر گئے۔ اب اماں بھی ضبط کھو بیٹھی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ پڑوس کی عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ "کیا ہوا اماں؟"

"دورہ پھر پڑا تھا۔ بہت شدید۔" بلقیس بیگم نے اٹک اٹک کر کہا۔

"اب کیا حال ہے؟"

"پھر بے ہوش ہو گیا ہے بچہ۔"

"میں ٹیکسی لے آیا ہوں۔ اب ہسپتال چلتے ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اب

دلاسا دینے کا کام نڈھال حمید احمد نے سنبھال لیا۔

☆

ڈاکٹروں نے جس انداز میں وحید کے کیس کو ہینڈل کیا' اس سے حمید احمد کی تشویش بڑھ گئی۔ انہوں نے اسے فوری طور پر دوا دی' انجکشن لگایا۔ پھر اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسے ایڈمٹ کر لیا۔

وحید ایک علیحدہ کمرے میں تھا۔ وہ بے خبر تھا.... شاید دواؤں کے زیر اثر۔ بلقیس بیگم کو اس کے پاس چھوڑ کر حمید احمد باہر نکلے۔ ان کا رخ ڈاکٹر زاہد کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وحید کا کیس کیا ہے۔ ویسے انہیں اس کا اندازہ تھا۔

ڈاکٹر زاہد نے انہیں سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "وہ آپ کا بیٹا ہے؟"

"جی ہاں ڈاکٹر۔ اس کی کنڈیشن کیا ہے؟"

ڈاکٹر ہچکچایا۔ "بات یہ ہے کہ...."

"آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں پلیز۔ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ 'بیماری بہت بڑھ چکی ہے۔ ابتدائی علامات ظاہر ہوتے ہی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

"اس نے ہمیں بھی نہیں بتایا۔" حمید احمد ہاتھ ملنے لگے۔ "یہ دورہ پڑا تو ہمیں پتہ چلا۔ اس نے معمولی بات سمجھ کر کبھی ہمیں بتایا ہی نہیں۔ بہر حال 'یہ بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟"

"اس کے دماغ میں رسولی ہے۔"

"رسولی تو چودہ سال پہلے بھی اس کے دماغ سے نکالی گئی تھی۔"

"دیکھئے... وہ اور بات تھی۔ یہ مختلف ہے۔ یہ ٹیومر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے 'آپریشن ہو گا؟"

"یہ کہنا بھی آسان نہیں ہے۔ کیونکہ رسولی دماغ کے اندر تک جڑ پکڑ چکی ہے۔ صحیح معنوں میں تو ڈاکٹر جمشید ہی فیصلہ کریں گے۔ میں نے ڈاکٹر جمشید سے فون پر بات کی ہے۔ وہ آج آئیں گے۔ ریفرنس دیکھیں گے۔ رپورٹیں بھی دیکھیں گے۔ حتمی طور پر تو وہی بتا سکیں گے۔"

"آپ کا اندازہ کیا ہے؟"

"میں تو اس پر حیران ہوں کہ یہ دورہ اتنی دیر سے کیوں پڑا۔ ٹیومر اتنا بڑھ چکا تھا مگر بات چند سیکنڈ کے معمولی دردوں پر ٹکی رہی اور وہ بھی درد کے بغیر۔ دیکھا جائے تو یہی نقصان دہ ہوا۔ ورنہ پہلے ہی پتہ چل جاتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پے در پے اتنے دورے پڑے ہیں.... اور وہ بھی بہت شدید۔"

"وہ تو بہت کمزور ہو گیا ہے ڈاکٹر۔"

"قدرتی بات ہے۔ دورے کتنے شدید تھے' آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا تو ایک دورہ بھی آدمی کو تین دن تک توانائی سے محروم کر دیتا ہے۔ نڈھال کر دیتا ہے۔ یہاں تو چند گھنٹے میں تین دورے پڑ چکے ہیں۔ ہلنا تو دور کی بات ہے' مریض کے لئے بات کرنا بھی آسان نہیں۔"

حمید احمد کمرے سے نکل آئے۔ بلقیس بیگم نے ان سے پوچھا۔ مگر وہ کیا بتاتے۔ "بس اماں دعا کریں۔" وہ یہ کہہ کر رہ گئے۔

وہ تینوں کے لئے قیامت کی رات تھی۔ رات کو وحید کو ایک دورہ اور پڑا۔ ڈاکٹر زاہد نے اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا۔

نیوروسرجن جمشید وقت پر نہ آسکے۔ گیارہ بجے وہ آئے۔ دو بجے انہوں نے حمید احمد سے بات کی۔ "میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ٹیومر بہت بڑھ چکا ہے۔ دماغ میں گہرائی میں جڑیں بنا چکا ہے۔ مجھے حیرت ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کے دورے اسے اب سے تین چار سال پہلے سے پڑنے شروع ہو جانے تھے۔ تب معاملہ آسان رہتا۔ اب تو بہت بڑھ چکا ہے۔"

"آپریشن ضروری ہے؟"

"دیکھئے.... بہت پیچیدہ کیس ہے۔ آپریشن واحد حل ہے۔ لیکن آپریشن بہت خطرناک ہے۔"

حمید احمد کا دل ڈوبنے لگا۔ "کامیابی کے امکانات کتنے ہیں؟"

"زیادہ سے زیادہ بیس فیصد اور آپریشن کامیاب ہو بھی گیا تو یہ خطرہ اپنی جگہ ہے کہ رسولی پھر بن جائے گی۔"

"اور آپریشن نہ کرنے کی صورت میں....؟"

"ہر گزرتے دن کے ساتھ دورے شدید تر ہوتے جائیں گے اور ایک وقت آئے گا کہ مریض انہیں جھیل نہیں سکے گا۔ وہ تو اس وقت بھی بہت کمزور ہو چکا ہے۔"

"آپریشن کی کامیابی کے امکانات بیس فیصد ہیں۔" حمید احمد نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ کتنا نازک آپریشن ہے۔ دماغ تو ویسے بھی بہت نازک ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو ٹیومر اندر اترا ہوا ہے۔" ڈاکٹر جمشید نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

حمید احمد چند لمحے سوچتے رہے۔ یا اللہ.... یہ کیسی آزمائش ہے۔ "آپ کی کیا رائے ہے آپریشن کے بارے میں؟"

"فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔"

"آپریشن کب ہونا چاہئے؟"

"جلد از جلد۔" ڈاکٹر نے بے جھجک کہا۔ "اب ذرا سی تاخیر بھی مناسب نہیں ہو گی۔"

حمید احمد کے لئے وہ بڑا مشکل فیصلہ تھا۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہے تھے۔ مشکل یہ بھی تھی کہ فیصلہ انہی کو کرنا تھا۔ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتے۔ اماں کو وہ پوری بات بتاتے تو اماں کا دل ہی پھٹ جاتا۔ ان پر یہ بوجھ ڈالنا زیادتی ہوتی ان کے ساتھ۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا.... اس نے کہا نہیں تھا' مگر اس کا مطلب یہی تھا کہ خدانخواستہ اسی فیصد امکان اس بات کا ہے کہ آپریشن کے دوران میں وحید۔ اس سے آگے ان سے سوچا نہیں گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

"حوصلہ رکھئے حمید صاحب۔" ڈاکٹر نے انہیں دلاسا دیا۔ "اللہ کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہو گا۔"

حمید احمد کے کندھے ڈھلکنے لگے۔ جھکنے لگے۔ اتنا بڑا بوجھ۔ سوچنے سے بچا نہیں جا سکتا۔ اگر وہ آپریشن سے وحید کو بچاتے ہیں تو بھی وہ اسے دردوں کی اذیت سے تو نہیں بچا سکیں گے۔ انہوں نے ان دردوں کی اذیت دیکھی بھی تھی اور محسوس بھی کی تھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ دورے ہر دن گزرنے کے ساتھ شدید تر بھی ہو جائیں گے اور ان کا دورانیہ بھی گھٹتا جائے گا۔ نہیں.... وحید تو کجا، اس پر پڑنے والا ایک دورہ بھی نہ وہ برداشت کر سکیں گے، نہ اماں۔

انہوں نے سر جھکالیا اور آہستہ سے کہا۔ ”آپ آپریشن کب کر سکیں گے ڈاکٹر؟“

”ویسے تو میں بہت مصروف ہوں۔ لیکن اس کیس کی اہمیت کے پیش نظر میں اسے ترجیح دوں گا۔ میں کل آپریشن کر سکوں گا۔“

”میری طرف سے اجازت ہے۔“

”ٹھیک ہے حمید صاحب۔ آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ آپ اجازت نامے کے فارم پر دستخط کر دیجئے گا۔ باقی باتیں آپ کو ڈاکٹر زاہد بتا دیں گے۔“

حمید احمد، بلقیس بیگم کے پاس چلے گئے۔ ان کا برا حال دیکھ کر ان کا دل کٹنے لگا۔ کیسی اجڑی اجڑی، کیسی خوف زدہ لگ رہی تھیں وہ۔

ڈاکٹر نے کیا کہا حمید احمد؟ بلقیس بیگم نے پوچھا۔

”کل آپریشن ہوگا اماں۔ بس اللہ سے دعا کریں۔ وحید کی زندگی مانگیں۔“

”کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔“ اماں کا لہجہ التجا کر رہا تھا کہ وہ جواب نہیں میں دیں گے۔

”اماں... سچ یہ ہے کہ آپریشن بہت خطرناک ہے۔“ حمید احمد نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”بس آپ دعا کرتی رہیں اللہ سے۔“

بلقیس بیگم سہم کر رونے لگیں۔ اے اللہ.... میرے بچے کو امان میں رکھنا اور وہ یوں رو رہی تھیں، جیسے ان کا دل کٹ رہا ہو۔

ذرا دیر بعد بلقیس بیگم نے کہا۔ ”حمید احمد.... یہ ڈاکٹر جبیں کون ہے؟“

حمید احمد چونکے۔ ”میں نہیں جانتا اماں۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”وحید بے ہوشی میں بھی اسے پکارتا رہا ہے۔“

حمید احمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ”اس کا کیا مطلب ہے اماں؟“

”پچھلے دنوں یہ چپ چپ رہنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے قبول کیا، نہ نام بتایا۔ اب اس پکارنے کا یہی مطلب ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔“

”اوہ.... ہاں اماں، بات سمجھ میں آتی ہے۔“

”اور ہو سکتا ہے کہ اس کی طبیعت خراب بھی اسی کی وجہ سے ہوئی ہو۔“

”ہو سکتا ہے اماں۔“ حمید احمد نے کہا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ حمید احمد

جانتے تھے کہ وحید کے معاملے میں دماغ کا ٹیومر ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ لیکن اللہ چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے آس کے اس دھاگے کو تھام لیا۔

”حمید احمد، اگر تم اس لڑکی کو ڈھونڈ لاؤ تو شاید آپریشن کی ضرورت بھی نہ پڑے۔“ بلقیس بیگم نے پر امید لہجے میں کہا۔

حمید احمد خود بھی یہی بات سوچ رہے تھے۔ ”ممکن ہے اماں۔ میں کوشش کرتا ہوں لیکن آپ یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ میں سنبھال لوں گی۔ تم جاؤ۔“

حمید احمد چند لمحے ہچکچائے۔ پھر باہر نکل آئے۔ اس موہوم سے امکان نے انہیں بہت حوصلہ دیا تھا۔ مگر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر جبیں کون ہے.... اور وہ اسے کیسے تلاش کریں گے۔ ڈاکٹر جبیں! یہ ڈاکٹر، وحید کو کہاں ملی ہو گی؟ وہ تو کہیں آتا جاتا بھی نہیں ہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ وہ خود کار انداز میں طب کے حوالے سے سوچ رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈاکٹریٹ والی ڈاکٹر بھی تو ہو سکتی ہے اور اس سے ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی ہو گی۔

ان کے قدم اپنے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ ان کا دل کہہ رہا تھا کہ انہیں اس لڑکی کا سراغ گھر سے.... وحید کے کمرے سے مل سکتا ہے۔

☆

مدیحہ کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی بدلنے والی ہے۔

یہ کیفیت گزشتہ روز سے تھی۔ اور امکان کا یہ دروازہ سمیعہ باجی نے کھولا تھا۔ وہ گزشتہ روز کافی عرصے بعد آئی تھیں۔ اور ان کا آنا بے سبب بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے ایک اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں۔

"باجی.... آپ جانتی ہیں کہ میرا جواب کیا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیوں.... اور کب تک؟" باجی نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا تم شادی ہی نہیں کرو گی؟"

"ہو سکتا ہے کہ کروں۔ لیکن کروں گی تو انہی سے۔"

"اتنے برس تو ہو گئے اس پروفیسر کے نام پر بیٹھے۔ کیا پوری زندگی گزار دو گی؟"

"میرا دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ مجھے ضرور ملیں گے۔"

"دل تو یونہی فریب دیتا ہے۔" باجی نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے یاد ہے ' تم نے بتایا تھا کہ وہ بہت اصول پرست شخص ہے۔ اور تم سے محبت کرنا اس کے اصول کے خلاف ہے۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔"

"مگر مجھے یقین ہے باجی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔"

"بلاوجہ کا یقین ہے۔ احمقانہ بات۔" باجی نے غصے سے کہا۔ "اور مجھے یاد ہے ' میں نے کہا تھا کہ اسے محبت ہو بھی گئی تو وہ اعتراف ہرگز نہیں کرے گا۔ اس ٹائپ کے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"وہ بہت سچے آدمی ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ لیا تھا اس بات کا۔ وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔"

"چلو مان لیا۔ اب اگر تمہارا یقین سچا ہے اور اسے تم سے محبت ہو گئی ہے تو اس نے اعتراف کیوں نہیں کیا تم سے۔"

"کیسے کرتے۔ کوئی ایڈریس ' رابطے کا کوئی امکان چھوڑے بغیر یہاں آ گئی تھی۔ کیا پتہ ' انہوں نے مجھے ڈھونڈا ہو اور ناکام ہو گئے ہوں۔"

"سب خود کو فریب دینے والی باتیں ہیں۔" باجی نے کہا پھر انہیں کچھ خیال آ گیا۔ "تو تمہیں اس کا گھر معلوم ہے۔ جا کر پوچھ لو۔"

"انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ان کے گھر کبھی نہیں آؤں گی۔ وہ خود بلائیں تو الگ بات ہے۔"

"کیسے احمقانہ وعدے ہیں۔ اب وہ تمہیں بلانا چاہے تو مسئلہ یہ ہے کہ تم سے رابطہ کہاں کرے۔" باجی نے بھنا کر کہا۔ پھر اچانک بولیں۔ "ایک اور بات۔ شاید اس نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ جس دن اسے تم سے محبت ہو گئی ' وہ اپنا پروفیشن چھوڑ دے گا۔"

ہاں۔ یہی کہا تھا انہوں گے۔"

"اور وہ بہت سچا بھی ہے؟"

"بالکل۔"

"تو تمہارا یقین سچا ہے تو اس نے لیکچرار شپ چھوڑ دی ہو گی۔"

"یقیناً۔ لیکن آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

باجی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم بڑی آسانی سے چیک کر سکتی ہو کہ تمہارا یقین سچا ہے یا خود فریبی ہے۔ تم اس کے گھر نہیں جا سکتیں۔ مگر یہ تو معلوم کر سکتی ہو کہ انہوں نے استعفا دے دیا.... یا ابھی تک پڑھا رہے ہیں۔"

مدیحہ حیران رہ گئی۔ پچھلے برسوں میں کس کس طرح سوچا تھا اس نے۔ لیکن اسے سامنے کی یہ بات نہیں سوجھی۔ واقعی.... یہ تو بہت آسان ہے۔ اگر انہوں نے استعفادے دیا تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں اس کی محبت کا ادراک ہو چکا ہے۔ یہ تو بہت آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

"بس تم یہ معلوم کرو فوراً۔" سمیعہ باجی نے حکم لگایا۔ "اور تمہارا یقین سچا ثابت ہو جائے تو تم اس کے گھر جا سکتی ہو۔ وہ تم سے وعدہ خلافی پر باز پرس نہیں کرے گا بلکہ تمہارا شکر گزار ہو گا۔ اور یاد رکھو ' اگر وہ اب بھی لیکچرار ہے تو اب میں تمہاری شادی کرائے بغیر نہیں مانوں گی۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی انشاءاللہ۔" مدیحہ نے بڑے یقین سے کہا۔

اور اب.... اگلے روز مدیحہ اپنے گھر میں بیٹھی اپنی زندگی کی اہم ترین فون کال کا انتظار کر رہی تھی۔

صبح یونیورسٹی میں اپنے دفتر سے اس نے ڈائرکٹریٹ آف کالجز میں فون کیا تھا اور حمید احمد صاحب کے بارے میں معلوم کیا تھا۔

"چیک کرنا پڑے گا۔" دوسری طرف سے احترام آمیز لہجے میں کہا گیا۔ "ویسے آپ کے پاس ان کے متعلق آخری معلومات کب کی ہیں؟"

"82ء میں وہ قائد ملت کالج میں پڑھا رہے تھے۔"

"یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ دیکھیں، چیک کرنے میں وقت لگے گا۔"

"مگر آج معلوم ہو جائے گا نا؟" مدیحہ بے تاب ہو رہی تھی۔ اب اسے ایک پل بھی بھاری لگ رہا تھا۔

"جی ہاں۔ امکان تو یہی ہے۔"

"اسے یقینی بنادیں۔ اور میرے گھر کا نمبر نوٹ کر لیں۔"

سو اب وہ اس کال کی منتظر تھی۔ ایسی بے چینی سے کسی چیز کا انتظار اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

بالآخر فون کی گھنٹی بجلی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ کہیں یہ کسی اور کی کال نہ ہو۔ لیکن وہ اس کی مطلوبہ کال ہی تھی۔ "کچھ پتہ چلا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ حمید احمد صاحب نے 86ء میں استعفادے دیا تھا۔" دوسری طرف سے بتایا گیا۔

مدیحہ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ "آپ کو یقین ہے؟"

"جی ہاں۔ ان کی فائل میرے سامنے ہے۔ ان کا استعفا موجود ہے۔ وہ ناظم آباد میں رہتے تھے نا؟"

"ہاں۔ استعفے کی وجہ کیا لکھی ہے انہوں نے؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کلرک نے کہا۔ "غیر معمولی بات ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اب وہ خود کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے۔ اس لئے استعفادے رہے ہیں۔"

"شکریہ دانش صاحب۔" مدیحہ نے بمشکل کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ایسی خوشی اسے زندگی میں کبھی نہیں ملی تھی۔ اس کا یقین سچا ثابت ہوا تھا۔ استعفے کی وجہ منہ سے بول رہی تھی کہ اسے حمید احمد کی محبت مل چکی تھی اور یہ 86ء کی بات ہے۔ اس وقت اسے گھر تبدیل کئے سال بھر سے اوپر ہو چکا تھا۔ حمید احمد نے ایک وعدہ پورا کیا تھا تو دوسرا بھی پورا کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ لیکن اس تک نہیں پہنچ سکے ہوں گے۔

اس کا دل پچھتاوے اور اداسی سے بھر گیا۔ کیسی بھیانک غلطی کی تھی اس نے۔ وہ فارورڈنگ ایڈریس چھوڑ دیتی تو اتنے برسوں کا زیاں نہ ہوتا۔ اف میرے خدا.... نو برس ضائع ہو گئے۔ اور خدا جانے حمید احمد پر کیا گزری ہو گی۔ وہ کس حال میں ہوں گے۔

وہ اپنی خوشی بھول کر پریشان ہو گئی۔ مگر پھر اس نے خود کو سمجھایا۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ ان کے روبرو ہو گی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے ان کے گھر جانے سے نہیں روک سکتی۔ وہ ان کے گھر جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

اس لمحے ایک خوفناک خیال نے اس کے دماغ میں ڈنک مارا۔ اور اگر انہوں نے گھر چھوڑ دیا ہو.... بدل لیا ہو تو۔ یہ تصور بھی اس کے لئے روح فرسا تھا۔ اے اللہ.... میرے معبود نہیں۔ ایسا نہ ہونے دینا.... پلیز۔ اب میں مزید نہیں سہ سکوں گی۔

اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس وقت کون آ ٹپکا۔ اس نے سوچا۔ خیر.... کوئی بھی ہو۔ اس وقت میں رکنے والی نہیں۔ ٹال دوں گی۔ معذرت کر دوں گی۔

"نسیمہ.... دیکھو تو کون ہے۔" اس نے نسیمہ کو پکارا۔ "اور سنو، کوئی بھی ہو۔ میں اس وقت کسی سے نہیں ملوں گی۔"

☆

کمرہ اسی حالت میں تھا، جس میں وہ وحید کو ہسپتال لے جاتے وقت چھوڑ گئے تھے۔ وحید کی کرسی گری ہوئی تھی۔ میز پر اس کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہاں اپنی شادی کا البم رکھا دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ البم تو ان کے کمرے میں رہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وحید لے کر آیا ہو گا۔ اپنی ماں کی تصویریں دیکھ رہا ہو گا۔

وہ میز کی طرف گئے اور غیر ارادی طور پر اس کی کتابوں کو درست کر کے رکھنے لگے۔ وحید کے بارے میں سوچ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیسا زندگی سے بھرپور، جوان اور تندرست لڑکا.... اور ڈاکٹر کہتا ہے۔ نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو اسے بہت کچھ کرنا

ہے۔وہ کچھ بنے گا.... شادی کرے گا.... اس کے بچے ہوں گے۔ان کی نسل آگے بڑھے گی۔

شادی پر انہیں اماں کی بات یاد آئی۔ پھر یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔وہ آخری امید کی ڈوری کا سرا ڈھونڈ رہے ہیں۔ڈاکٹر جبیں کے متعلق کوئی سراغ۔وہ انہیں اس کمرے سے ہی مل سکتا تھا۔وحید کی چیزوں میں کہیں کوئی چیز ہو گی' جو ان کی رہنمائی کرے گی۔انہیں ڈاکٹر جبیں تک پہنچائے گی۔

لیکن ایسی چیزیں چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔انہوں نے سوچا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ان کی نظر الماری پر ٹھہر گئی۔الماری کی درازیں، سیف یا چور دراز۔ بہر حال دیکھتے ہیں۔انہوں نے بڑھ کر الماری کھولی۔ لیکن درازوں میں' سیف میں انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔پریشانی کے عالم میں پوری الماری الٹ پلٹ کرنے کے موڈ میں تھے۔ لیکن انہیں خیال آیا کہ ایسی ایک چیز تو ان کے پاس بھی ہے۔ہاں.... مدیحہ کو لکھا گیا وہ خط ان کا راز محبت تھا۔وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اسے مدیحہ کے سوا کوئی دیکھے۔انہوں نے اسے بہت محفوظ کر کے' چھپا کے رکھ دیا تھا۔کہاں....؟اپنی میز کی مقفل دراز میں!اور وہ اس دراز کو ہمیشہ مقفل رکھتے تھے۔

وہ اضطراری طور پر وحید کی میز کی طرف لپکے۔ان کی توقع کے مطابق اوپر والی دراز مقفل تھی۔انہوں نے نیچے کی درازیں کھکھوڑ ڈالیں۔ لیکن چابی وہاں نہیں تھی۔اب انہیں یہ فکر ہوئی کہ وحید نے چابی کہاں چھپائی ہو گی۔ویسے یہ بات حوصلہ افزا تھی۔دراز میں کچھ نہ ہوتا تو اس کی چابی یقینی طور پر نیچے کے کسی دراز میں موجود ہوتی۔ آدمی چھپاتا تو اہم راز ہی کو ہے۔

چابی تلاش کرتے ہوئے وہ جھلانے لگے۔وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور چابی نہیں مل رہی ہے۔اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ پھر اچانک انہیں خیال آیا کہ وہ چابی کو خواہ مخواہ اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ معمولی سا تالا ہے۔ٹوٹنے میں کیا دیر لگے گی۔

وہ ہتھوڑی اور پیچ کس لے آئے۔ مگر دراز کے قبضے پر پہلا وار کرتے ہوئے انہیں احساس جرم ستانے لگا۔یہ بات اخلاقی اصولوں کے منافی ہے کہ کسی کی پرائیویسی کو مجروح کیا جائے۔ وہ ان کا بیٹا ہے تو کیا۔انہیں بغیر اجازت اس طرح اس کی دراز کھولنے کا حق نہیں۔

پھر انہیں یاد آیا کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔موت کا لفظ ذہن میں گونجا اور وہ تھرا

گئے۔انہوں نے پیچ کس کو قبضے میں پھنسا کر ہتھوڑی سے وار کیا۔ تیسرے وار میں دراز کھل گئی۔

انہوں نے بے تابی سے دراز کا جائزہ لیا۔اس میں کاغذات ہی کاغذات تھے۔وحید کے نوٹس۔انہوں نے سب کچھ باہر نکال لیا۔ لیکن کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں کس چیز کی تلاش ہے۔وہ مایوس ہونے لگے۔اب کیا کریں۔انہوں نے جھنجلا کر کاغذات کو میز پر پٹخا تو ان کے درمیان سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکل کر گرا۔کارڈ دیکھتے ہی ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔کارڈ پر ڈاکٹر جبیں کا نام تھا۔

اس وقت ان کے لئے وہ کارڈ ہی کافی تھا۔ لیکن وہ صرف کارڈ نہیں تھا۔وہ اماں کے اندازے کی حتمی طور پر تصدیق کر رہا تھا۔وہ محبت کا ہی معاملہ تھا۔کارڈ کی پشت پر وحید کی جانی پہچانی تحریر میں لکھا تھا DR.JABEEN, I LOVE YOU. I STILL LOVE YOU انہوں نے کارڈ کو اٹھا کر پڑھا۔ڈاکٹر جبیں یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی ہیڈ تھیں۔

وہ کارڈ کو لے کر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔بات پوری طرح ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔وحید کی بیماری کا سبب یہ ڈاکٹر جبیں.... ان کی محبت تھی.... بلکہ ان کی محبت سے محرومی کہنا چاہئے۔انہوں نے وحید کو' اس کی محبت کو رد کر دیا ہو گا۔ویسے ہی جیسے انہوں نے مدیحہ کی محبت کو رد کیا تھا۔

کیا یہ عمل مکافات؟ان کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔کیا تاریخ نے فریق تبدیل کر کے خود کو دہرایا ہے۔ضرور یہی بات ہے۔انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا' انہیں کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ان کے انکار سے مدیحہ پر کیا گزری ہو گی۔یہ شاید بے رحمی تھی ان کی۔ مگر اب وہ سمجھ سکتے تھے۔کیونکہ اب ان کے بیٹے پر گزر رہی تھی۔

اتنے برسوں میں وہ بدل گئے۔انہیں مدیحہ سے محبت ہو گئی۔ مگر اب سے پہلے انہوں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا۔انہوں نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ مدیحہ پر کیا گزری ہو گی۔اور جب آدمی خود سے کسی کی اذیت کا احساس نہیں کرتا تو قدرت انتقام لیتی ہے۔اسے احساس دلاتی ہے۔

وہ سمجھ سکتے تھے کہ وحید کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔یقیناً وحید کو اس کا صدمہ تھا۔اور ڈاکٹر

جبیں کی محبت مل جائے تو شاید وحید بالکل ٹھیک ہو جائے۔

سوال یہ تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں تھا۔ انہیں ڈاکٹر جبیں سے بات کر کے انہیں قائل کرنا ہے۔ لیکن اس جواب پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ جس چیز کے خلاف رہے تھے' اب انہیں اس کے حق میں بولنا تھا۔ یعنی انہیں نظریاتی طور پر یوٹرن لینا تھا۔

"لیکن یوٹرن تو میں برسوں پہلے لے چکا ہوں۔" انہوں نے خود کلامی کی۔ مگر وہ جانتے تھے کہ وہ اندر سے نہیں بدلے تھے۔ ان کا نظریہ اب بھی وہی تھا۔ وہ استاد اور شاگرد کے درمیان اس طرح کے تعلق کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ لیکچرار شپ کیوں چھوڑتے۔

کچھ بھی ہو' اب انہیں اس تعلق کے حق میں دلیلیں دینی ہیں' ڈاکٹر جبیں کو قائل کرنا ہے۔ مگر وہ کہیں گے کیا۔ جبکہ خود بھی ابھی تک اپنے موقف پر قائم ہیں۔ اچانک انہیں اماں کی دی ہوئی ساری دلیلیں یاد آگئیں۔ وہ یہی کچھ کہیں گے ڈاکٹر جبیں سے۔ وہ سمجھ جائیں گی۔ کیونکہ وہ تو اسلامک اسٹڈیز کی ڈاکٹر ہیں۔ اماں نے تو انہیں بھی لاجواب کر دیا تھا۔ لیکن وہ ایک آخری دلیل کے زور پر نکل گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مدیحہ کو پسند نہیں کرتے۔

اور اگر ڈاکٹر جبیں نے بھی یہی جواب دے کر بساط الٹ دی تو؟ یہ عمل مکافات کا پھیر ہے۔

انہوں نے کندھے جھٹکے۔ یوں سوچتے رہے تو کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ انہیں تو کوشش کرنی ہے۔

وہ دوسرے کمرے میں گئے' ریسیور اٹھایا اور کارڈ پر لکھا ہوا فون نمبر ملانے لگے۔ لیکن انہوں نے پورا نمبر نہیں ملایا۔ اب ایسی باتیں فون پر تو نہیں کی جا سکتیں۔ یہ تو روبرو کی جانے والی بات ہے۔ انہیں ڈاکٹر جبیں کے گھر جانا ہوگا۔

وہ اسی ارادے سے گھر سے نکل آئے۔

☆

مدیحہ نے دروازہ کھولے جانے کی آواز سنی۔ پھر نسیمہ نے کہا۔ "جی.... فرمایئے؟"

"مجھے ڈاکٹر جبیں سے ملنا ہے۔" ایک مردانہ آواز ابھری۔ مدیحہ کو حیرت ہوئی۔ اس سے

ملنے کون آسکتا ہے۔

"آج تو یہ ممکن نہیں۔" نسیمہ کہہ رہی تھی۔ "وہ بہت ضروری کام سے کہیں جانے والی ہیں۔"

مدیحہ کو نسیمہ پر بہت زور کا غصہ آیا۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ دیتی کہ گھر میں نہیں ہیں۔

"یہ بہت ضروری ہے۔" مردانہ آواز نے کہا۔ اس بار وہ آواز مدیحہ کو جانی پہچانی لگی۔

"میں نے کہا نا' بی بی کو کہیں جانا ہے۔ وہ رک نہیں سکتیں۔"

"پلیز.... خدا کے لئے۔ صرف چند منٹ.... یہ میرے بیٹے کی زندگی اور موت...."

مردانہ آواز جملہ پورا نہ کر سکی۔ بکھر گئی۔ اب وہ شخص رو رہا تھا۔

مدیحہ کا دل موم ہو گیا۔ نجانے کیا بات ہے۔ بے چارہ رو رہا ہے۔ چلو... تھوڑی دیر کے لئے... اس نے نسیمہ کو پکارا۔ "بٹھاؤ انہیں۔ میں آتی ہوں۔"

اس نے اپنی تیاری مکمل کی' خود کو چادر میں لپیٹا' چہرے پر حجاب لیا۔ آنکھوں پر چشمہ لگایا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ لیکن ڈرائنگ روم میں گھستے ہی وہ بت بن کر رہ گئی۔ سامنے صوفے پر حمید احمد سر جھکائے بیٹھے تھے۔

وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ وہ ان کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ نسیمہ انہیں کیوں نہیں پہچان سکی۔ اس نے انہیں پہچان لیا تھا، یہی بڑی بات تھی۔

اسے ان کے الفاظ یاد آئے۔ انہوں نے نسیمہ سے کہا تھا... یہ میرے بیٹے کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ برسوں کے انتظار کے بعد ملاقات ہوئی تو انہیں کتنے برے حال میں دیکھا ہے اور کیسی صورت حال... اچانک اسے خیال آیا کہ ان کے بیٹے کا نام وحید تھا۔ وہ مضطرب ہو کر بڑھی اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

حمید احمد کسی فکر میں غلطاں تھے۔ انہیں اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ مگر وہ صوفے پر آ کر بیٹھی تو انہوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر اسے اس قدر باپردہ دیکھ کر فوراً ہی نظر جھکالی۔

ان کی آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر مدیحہ کا دل کٹنے لگا۔ "جی... فرمایئے۔"

"آپ ڈاکٹر جبیں ہیں؟"

"جی ہاں۔" حمید احمد بڑا اعتماد اور حوصلہ ساتھ لائے تھے لیکن اب وہ جواب دینے لگا۔ انہیں خیال آیا کہ انہیں ڈاکٹر جبیں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شادی شدہ ہوں۔ ورنہ وحید کے اور ان کے درمیان عمر کا اتنا فرق تو معلوم نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تو وہ بیٹے کا کیس لڑنے سے پہلے ہی ہار جاتے۔

پھر انہوں نے یہ سوچ کر خود کو سنبھالا کہ جو بیٹا موت سے لڑ رہا ہے' اس کا کیس تو انہیں بہر حال لڑنا ہے۔

ادھر مدیحہ نے اضطراری طور پر چشمہ اتارا اور حجاب بھی گرا دیا۔ اب اسے کہیں جانا نہیں تھا۔ جس کے پاس وہ جا رہی تھی' وہ خود ہی چل کر آ گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ اپنے ساتھ ایک بہت بھیانک مسئلہ لے کر آیا تھا۔ اس کا دل خوف سے لرزنے لگا۔ اب کیا ہوگا اے اللہ....

"میں آپ کے اسٹوڈنٹ وحید کا باپ ہوں۔" حمید احمد نے کہا۔

"جی حمید صاحب' میں جان گئی۔"

حمید احمد نے چونک کر سر اٹھایا۔ مدیحہ ان کے روبرو تھی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"تم... مدیحہ تم... ڈاکٹر جبیں...؟"

"جی میرا پورا نام مدیحہ جبیں ہے۔"

اس بار دماغ میں ایسا بھونچال آیا کہ حمید احمد کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کا ردعمل بھی غیر اختیاری تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔ یوں جیسے ان کے پیچھے بلائیں لگی ہوں۔

"حمید صاحب... سنیے تو..." مدیحہ نے انہیں پکارا۔

مگر حمید احمد کی سماعت ان کے حواس کے ساتھ معطل ہو چکی تھی۔

"حمید صاحب' خدا کے لئے... رکیے تو پلیز۔"

حمید احمد آندھی طوفان کی طرح دروازے سے گزر گئے۔ اس وقت ان تک کوئی صدا نہیں پہنچ سکتی تھی۔

☆

حمید احمد کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ وہ اندھا دھند چل رہے تھے۔ انہیں یہ

بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد ان کی حالت سنبھلی۔ انہوں نے آنکھیں خشک کیں اور ادھر اُدھر دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہیں۔ انہیں اس سے غرض بھی نہیں تھی۔ انہیں تو اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی۔ انہیں سوچنا تھا۔ اس حال میں تو وہ ہسپتال بھی نہیں جا سکتے تھے۔

سامنے ایک پبلک پارک تھا۔ وہ اس میں چلے گئے اور ایک سنسان گوشے میں ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ "ارے اللہ... یہ کیا ہو گیا۔ میں کیا کروں؟" وہ بڑبڑائے۔

ابتدا میں تو وہ یکسوئی کے ساتھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ مگر پھر وہ سنبھل گئے۔ صورت حال جیسی بھی ہو' اس کا سامنا تو کرنا پڑے گا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ڈاکٹر جبیں، مدیحہ ہوگی۔ اور وحید کو مدیحہ سے محبت ہو گئی۔ مدیحہ سے! یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو اتنے دکھ' اتنی اذیتیں دیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا میرے ساتھ۔ مگر وحید کے ساتھ کیوں۔ میرے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں؟

وہ اللہ کے حضور سراپا شکایت بن گئے۔ اب تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟ یہ کیسی آزمائش ہے؟ یہ تو میرے بس کی ہے ہی نہیں؟ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟

اس کیا کروں پر انہوں نے سوچنا شروع کیا تو دل اور دماغ میں جنگ چھڑ گئی.... کھلی جنگ! مدیحہ کے پاس چلو اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔" دماغ نے کہا۔ "یہ تو تمہاری خوش نصیبی ہے کہ وہ مدیحہ نکلی۔ اسے زیادہ آسانی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو مشکل تھا۔"

"کس بات پر قائل کروں مدیحہ کو؟" دل نے کہا۔ "اس پر کہ وہ میرے بیٹے سے محبت کرنے لگے اور اس سے شادی کر لے۔"

"ہاں۔ وحید کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے۔"

"مگر یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں؟"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے.... غیر متزلزل محبت۔ میں اسے کبھی کچھ نہیں دے سکا۔ اس سے اتنی بڑی قربانی کیسے مانگوں؟"

"بیٹے سے محبت ہے تو یہ کرنا پڑے گا۔" دماغ نے کہا۔

"لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ وہ انکار کر دے گی۔"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے تو کبھی انکار نہیں کرے گی۔"

"اس محبت ہی کس وجہ سے وہ انکار کرے گی۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس محبت کے خلاف اس نے کبھی کوئی دلیل نہیں مانی۔"

"تم کوشش تو کرو' یہ تمہارا فرض ہے۔"

"میں کس منہ سے اس سے یہ کہوں کہ وہ بہو بن کر میرے ہی گھر آ جائے۔ جبکہ وہ مجھ سے غیر فانی محبت کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں تو وہ مر جانا بہتر سمجھے گی۔"

"کچھ بھی ہو۔ تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔"

"تم بہت خود غرض ہو۔" دل نے تڑپ کر کہا۔ "سفاکی کی حد تک خود غرض۔"

"اور تم منافق ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"اصل بات یہ ہے کہ اب وہ مل گئی ہے تو تم اس کے خواب دیکھ رہے ہو۔ تمہیں بیٹا اتنا عزیز نہیں۔ اس کی محبت زیادہ عزیز ہے۔ اس حقیقت کو چھپانے کے لئے تم یہ دلیل بازی کر رہے ہو۔ ورنہ اس معاملے میں دلیل بازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

"اتنی گھٹیا بات تم ہی کر سکتے ہو۔ مجھ پر ایسی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ وہ مدیحہ نہ ہوتی تو میں اس کے سامنے بھکاریوں کی طرح جھولی پھیلا دیتا۔ ہاتھ جوڑتا' پاؤں بھی پکڑ لیتا۔ لیکن میں مدیحہ کی محبت کی عظمت کو جانتا ہوں' اس کی توہین کر ہی نہیں سکتا۔"

"چاہے بیٹا مر جائے؟"

حمید احمد پوری جان سے کانپ گئے۔ دل نے بھی دم سادھ لیا۔

دماغ نے لوہا گرم دیکھ کر آخری چوٹ لگائی۔ "یہ سوچو کہ وحید تمہاری نسلوں کا امین ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو تمہاری نسل تم پر ہی ختم ہو جائے گی۔"

یہ آخری وار بہت کاری تھا۔ حمید احمد تڑپ کر اٹھے۔ واقعی.... مدیحہ مانے یہ نہ مانے' مجھے کوشش تو کرنی ہے۔ میں بھیک مانگوں گا اس سے۔

فیصلہ کر کے وہ پارک سے نکل آئے۔ پہلے تو انہیں یہ سمجھنا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ پھر یہ

اندازہ کرنا تھا کہ مدیحہ کا گھر کس طرف ہے۔ اس میں خاصی دیر لگ گئی۔ وہ مدیحہ کے گھر پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ ملازمہ کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔

وہ لٹے ہوئے مسافر کی طرح تھکے تھکے قدموں سے نیچے اترے۔ اب وہ ہسپتال کے سوا کہیں نہیں جا سکتے تھے۔

☆

صورتِ حال ایسی تھی اور سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ مدیحہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ اس نے حمید احمد کو پکارا۔ لیکن وہ تو جیسے حواسوں میں ہی نہیں تھے۔ وہ بہت تیز رفتاری سے فلیٹ سے نکل چکے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ سنبھلی اور باہر گئی۔ لیکن حمید احمد کہیں نظر نہیں آئے۔

واپس آ کر اس نے ذہن میں درست ترتیب کے ساتھ صورتِ حال کی تصویر کشی کی کوشش کی۔ حمید احمد بہت پریشان ہو کر آئے تھے۔ انہیں ڈاکٹر جبیں سے ملنا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہاں انہیں وہ ملے گی۔

اور انہوں نے اپنے بیٹے وحید کا حوالہ دیا تھا۔ اور وحید وہ لڑکا تھا' جس نے ان سے اظہارِ محبت کی کوشش کی تھی' جسے اس نے بڑی خوب صورتی سے ناکام بنا کر اسے قائل کر دیا تھا۔ تو وہ حمید احمد کا بیٹا تھا۔ اور انہی کا بیٹا ہو سکتا تھا۔ کتنا معصوم تھا وہ اور کتنا معقول۔ کتنی آسانی سے قائل ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس نے اپنے رویئے کو یکسر تبدیل کر لیا تھا۔

مگر لگتا تھا کہ وہ تبدیلی وقتی تھی۔ نہ ہوتی تو حمید احمد یہاں نہ آتے اور حمید احمد نے کہا تھا کہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ تو کیا اچانک وحید پر اس کی محبت کا دورہ پڑ گیا.... ایسا کہ اس نے حمید احمد کو بھی بتا دیا۔ اس لئے وہ یہاں چلے آئے۔

اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے... ڈاکٹر جبیں کو اس پر قائل کرنے کے لئے آئے تھے کہ وہ ان کے بیٹے کی محبت کو قبول کر لے' اس سے شادی کر لے۔ یقیناً یہی بات تھی اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی... کتنے حوصلے کی بات ہے۔ وہ اسے اس بات پر قائل کرنے آئے تھے' جس پر برسوں پہلے خود قائل نہیں تھے۔ بیٹے... اور اکلوتے بیٹے کی محبت میں ایسا ہوتا ہے۔

حمید احمد کا ردِ عمل اس کے اندازے کی تائید کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جس طرح اٹھے اور

جس طرح رخصت ہوئے... اس سے بات کئے بغیر... تو وہ اور کیا کرتے۔ وہ اجنبی ڈاکٹر جبیں سے بیٹے کی خاطر محبت کی بھیک مانگ سکتے تھے لیکن اس سے نہیں' وہ اس کی محبت سے واقف تھے اور اب تو انہیں بھی اس سے محبت ہے۔ یہ سوچتے ہوئے مدیحہ کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ بیٹے کی خاطر بھی اس سے وہ بات نہیں کر سکے' جو انہیں کرنی تھی۔

پھر وہ یہ سوچ کر دہل گئی کہ اس وقت حمید احمد پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ان کے لئے تو یہ سانحہ ہو گا کہ ان کا بیٹا اس سے محبت کرتا ہے' جو ان سے محبت کرتی ہے اور جس سے وہ خود محبت کرتے ہیں۔ اب وہ بیٹے کو کیا سمجھائیں گے؟ اس سے کیا کہیں گے؟ اور جس کیفیت میں رخصت ہوئے تھے' وہ اچھی نہیں تھی۔

اس نے سب کچھ سوچ اور سمجھ لیا۔ لیکن دل میں ایک خلش سی تھی کہ کوئی اہم بات... بہت اہم بات وہ نظر انداز کر گئی ہے۔ لیکن اب حمید صاحب کی پریشانی کا سوچ کر وہ اتنی متوحش ہو گئی تھی کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں بس یہ خیال تھا کہ اسے فوراً ان کے گھر جانا ہے۔ اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔

وہ باہر آئی گاڑی نکالی اور ناظم آباد کی طرف چل دی۔

حمید احمد کا مکان بہت بدل چکا تھا۔ انہوں نے نئے سرے سے بنوالیا تھا لیکن دروازے پر تالا دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا وہ نقل مکانی کر چکے ہیں؟ وہ کار سے اتری اور اس نے پڑوس والوں سے پوچھا۔ "حمید صاحب' یہیں رہتے ہیں نا؟"

"ہاں بیٹی!" خاتون نے جواب دیا۔

"تو اس وقت کہاں ہیں یہ لوگ؟"

"ہسپتال میں۔ ان کے بیٹے وحید کو دماغی دورہ پڑا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

اس لمحے مدیحہ کی سمجھ میں اپنی خلش آگئی۔ حمید احمد نے اس کے گھر آکر کہا تھا... یہ میرے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور وہ اتنے پریشان اور لٹے لٹے لگ رہے تھے۔ اسے پہلے ہی سمجھ جانا چاہئے تھے۔ پھر اسے اپنے گھر میں وحید کا چکر آنے سے لڑکھڑانا یاد آیا۔ اس کا ذہن تشویش سے بھر گیا۔ "وہ کون سے ہسپتال میں ہے؟"

خاتون سے پوچھ کر وہ ہسپتال کی طرف چلی تو اس پر لرزہ طاری تھا۔ حمید احمد ملے تو کس

حال میں۔ یہ تو بڑی پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ وہ اس سے کیسی توقع کر رہے ہوں گے... اور وہ ان کی توقع پوری بھی نہیں کر سکتی اور خدانخواستہ وحید کو کچھ ہو گیا تو...؟ حمید صاحب اسے کبھی نہیں ملیں گے۔

ہسپتال پہنچ کر اس نے وحید کے متعلق معلوم کیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سے ملی۔ اسے پتہ چلا کہ وحید کی حالت بہت خطرناک ہے۔

"آپ مریض کی کون ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر جبیں ہوں... ان کی دور کی رشتے دار۔"

ڈاکٹر نے چونک کر دیکھا۔ "آپ کو تو وہ بے ہوشی میں بھی پکارتا رہا ہے اور اب ہوش میں بھی دادی سے یہی کہے جا رہا ہے کہ آپ کو بلا دیں۔"

مدیحہ کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہ وحید کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا عجیب حال تھا۔ کمرے میں گھس کر اسے بلقیس بیگم بھی نظر نہیں آئیں۔ وہ سیدھی وحید کی طرف بڑھی۔ وحید کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی۔ چہرے اور آنکھوں سے وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اٹھ نہ سکا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ "لیٹے رہو آرام سے۔"

بلقیس بیگم اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ یہ تو وہی لڑکی مدیحہ ہے... یہ یہاں کیسے...

"یہ تم نے کیا حال بنالیا اپنا پاگل لڑکے۔" مدیحہ نے وحید کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر جبیں... میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔ شکر ہے' آپ آگئیں۔"

وحید کے منہ سے ڈاکٹر جبیں سن کر بلقیس بیگم کے ہوش اُڑ گئے۔ یااللہ... یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ تو مدیحہ ہے... حمید احمد والی۔ اور یہ ڈاکٹر جبیں ہے... وحید والی۔ الٰہی یہ کیا معما ہے۔ یہ کیا اسرار ہے۔

"مجھے کیوں یاد کر رہے تھے تم؟" مدیحہ نے وحید سے پوچھا۔

بلقیس بیگم گھبرا کر کمرے سے نکل گئیں۔ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں۔

"آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔" وحید نے کمزور آواز میں کہا۔ "مجھے آپ سے معذرت کرنی ہے۔ میں آپ کے لئے اپنی محبت کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا۔ سمجھ میں آیا تو.... تو یہاں پہنچ گیا۔"

مدیحہ پریشان ہو گئی۔ پیچیدگی اور بڑھنے والی تھی۔ "تم بات مت کرو، تمہیں کمزوری ہے۔"

"نہیں۔ مجھے کہنے دیں۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔" وحید کی آواز بھرا گئی۔ "میں سمجھ نہیں سکا۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں آپ سے ماں جیسی محبت کرتا ہوں۔"

وہ دھماکہ تھا مدیحہ کے لئے... لیکن خوش کن۔ وہ مسکرا دی۔ "تم نہیں جانتے... یہ بہت بڑی خوش خبری ہے میرے لئے۔ اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

"مجھے ایک اور بات کہنی ہے آپ سے۔ مجھے معلوم ہے، آپ انکار کر دیں گی۔ لیکن میں کہوں گا ضرور۔ کم ظرف ہوں نا، میڈم...! میں آپ کو سچ مچ اپنی امی بنانا چاہتا ہوں۔ آپ پلیز میرے ابو سے شادی کر لیں۔"

مدیحہ ہنس دی۔ "یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم کہ میں انکار کر دوں گی۔ میں تمہاری بات مان سکتی ہوں... مگر ایک شرط پر۔"

وحید کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ مگر اس کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ "اس کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"بس تمہیں زندہ رہنا ہوگا۔"

وحید اداس ہو گیا۔ "یہ میرے اختیار میں کب ہے؟"

"تم جینے کی خواہش کرو گے، زندگی کے لئے لڑو گے، یہ وعدہ کرو۔"

"اتنی سی بات۔ یہ تو پکا وعدہ ہے میڈم!" وحید نے کہا پھر رونے لگا۔ "آپ نہیں جان سکتیں کہ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

"اب نہیں ہو گی انشاء اللہ۔ آؤ، اپنی امی سے لپٹ کر سو جاؤ۔" مدیحہ بولی۔ "اور ایک راز کی بات بتاؤں، تمہارے ابو ہی وہ شخص ہیں جن کا میں انتظار کر رہی تھی۔"

☆

حمید احمد ہسپتال پہنچے تو اماں کمرے کے باہر ٹہلتی ملیں۔ حمید احمد بہت پریشان تھے۔ اماں انہیں اور زیادہ پریشان نظر آئیں۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے اماں۔ وحید کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اماں نے کہا۔ "سنو حمید احمد، وہ مدیحہ آئی ہے۔ وحید کے پاس بیٹھی ہے۔"

حمید احمد حیران رہ گئے۔ "مدیحہ آئی ہے؟"

"ہاں۔ اور وہی ڈاکٹر جبیں بھی ہے۔"

"میں جانتا ہوں اماں۔"

اماں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"مگر آپ باہر کیوں نکل آئیں؟"

"میں وہ سب کچھ نہ دیکھ سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی۔"

"دیکھیں اماں، سمجھنے کی کوشش کریں۔ وحید کی تو بہتری ہے اس میں... اور ہماری بھی۔"

"تو تم مدیحہ کو سمجھا کر لائے ہو۔" اماں نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

حمید احمد نظریں چرانے لگے۔ "نہیں اماں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اچھا... اب چل کر دیکھیں تو، مجھے یقین ہے کہ وحید بہتر محسوس کر رہا ہوگا۔"

وہ اماں کو لے کر وحید کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ اماں یوں چل رہی تھیں جیسے بادل ناخواستہ جا رہی ہوں۔

انہوں نے دروازے میں رک کر اندر کا منظر دیکھا۔ اور دیکھتے رہ گئے۔ وحید، مدیحہ کے زانو پر سر رکھے سو رہا تھا اور مدیحہ اس کا سر سہلا رہی تھی۔ وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھی۔ پھر اس نے وحید کے سر پر دم کیا۔ اسے ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

حمید احمد بڑی آہستگی سے پلٹ گئے۔ ان کا دل اطمینان سے بھر گیا۔ خدا کا شکر ہے۔ اتنی سی دیر میں اتنا بڑا فرق۔ وحید خود سے سو رہا ہے۔ اب انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر کہیں گہرائی سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ مدیحہ ان کے سمجھانے پر بھی نہیں مانے گی۔ مگر وہ تو بغیر سمجھائے ہی مان گئی۔ کیا وہ وحید سے.... انہوں نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وحید سے زیادہ اہم تو کچھ بھی نہیں۔ اس سے تو ان کی نسل آگے بڑھے گی۔

وہ واپس چل دیئے۔ لابی کی طرف۔

بلقیس بیگم نے ان کا کرب سمجھ لیا تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئیں۔ "اب کیا ہوگا حمید احمد؟"

"اب انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اماں۔" حمید احمد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مگر تم...؟"

"وحید سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے اماں۔ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔ یوں سمجھ لیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"لیکن تم....؟"

وحید احمد مسکرائے۔ "مجھے تو سچ مچ کچھ یاد ہی نہیں ہے.... وحید کے سوا۔"

"تو پھر تم کمرے میں جانے کی بجائے پلٹ کیوں آئے؟"

"ابھی ہمت نہیں ہے اماں۔ وحید کی طرف سے پریشانی ہے نا۔ وہ دور ہو جائے گی تو میں سامنا بھی کرلوں گا۔ آپ کمرے میں جائیں۔ میں کچھ دیر باہر بیٹھوں گا۔"

بلقیس بیگم چلی گئیں۔ حمید احمد لابی میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ ایک طرف انہیں خوشی تھی کہ اتنا بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا تو دوسری طرف ایک بے نام سی اذیت انہیں اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی۔

محبت بھی تمہیں بڑائی اور ظرف نہیں دے سکی۔ انہوں نے خود کو ملامت کرتے ہوئے جھڑکا۔ کیسے باپ ہو۔ بیٹے سے رقابت محسوس ہو رہی ہے تمہیں اور وہ بھی زندگی اور موت کے درمیان معلق بیٹے سے۔ تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پرسکون ہو گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اٹھے اور کمرے کی طرف گئے۔ انہیں وحید کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ ٹھیک تو ہے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے اندر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ مدیحہ جانماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ وحید سو رہا تھا اس کے چہرے پر سکون تھا اور اماں ایک طرف بیٹھے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

حمید احمد نے ایک بار پھر وحید کے چہرے کو دیکھا.... اے اللہ اسے شفا عطا فرمائیں اور ایسا ہی خوش اور پرسکون رکھیں۔ وہ دروازے سے ہٹ آئے۔ دیکھو.... اماں نے بھی قبول کر لیا اس صورتِ حال کو۔ کتنی خوش ہیں۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تم ایسے خوش نہیں ہو سکتے۔

پھر انہیں خیال آیا کہ پورا دن ہو گیا۔ انہوں نے نماز نہیں پڑھی ہے۔ نماز کا خیال انہیں مدیحہ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آیا تھا۔ وہ نیچے ہسپتال کی مسجد میں چلے گئے۔ نماز پڑھ کر انہیں

گہرے سکون کا احساس ہوا۔ وہ اوپر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ وحید کی طبیعت خراب نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اس کے دورے سے ڈرنے لگے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے دعا کی تھی کہ اللہ وحید کو دوروں سے محفوظ رکھیں۔

رات کے بارہ بجے... ایک بجا۔ انہیں کئی بار خیال آیا کہ جا کر.... وحید کو دیکھیں لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سر اٹھایا۔ وہ مدیحہ تھی اور انہی کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "خیریت تو ہے؟ وحید ٹھیک ہے نا؟"

مدیحہ مسکرائی۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ سکون سے سو رہا ہے۔ بے فکر رہیں۔ انشاءاللہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کتنی محبت اور یقین سے کہہ رہی ہے۔ کاش ایسا یقین انہیں بھی مل جائے مگر انہیں تو ڈاکٹر کی بات یاد تھی۔ ڈاکٹر تو امید کبھی نہیں چھوڑتے اور کوئی ڈاکٹر کہے کہ آپریشن ناگزیر ہے اور آپریشن کی کامیابی کے امکانات بیس فیصد ہیں تو کیس تو سنگین ہوا نا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" مدیحہ نے انہیں چونکا دیا۔

"مدیحہ.... میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ تمہارے احسانات کا صلہ تو میں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"فضول بات۔ میں نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں۔"

"تمہیں نہیں معلوم۔ تمہارے بڑے احسانات ہیں مجھ پر اور یہ احسان.... یہ تو۔"

"آپ پر کیا گزری ہے' یہ میں اماں سے سن چکی ہوں۔" مدیحہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

حمید احمد بری طرح بھڑکے۔ "اماں بھی کمال کرتی ہیں۔ ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں تھیں۔" انہوں نے چڑ کر کہا۔

"آپ نے بہت اذیت سہی ہے میری خاطر۔ لیکن اپنی وجہ سے۔"

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم وہی کرو، جو کر رہی ہو، جو تمہیں کرنا چاہئے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"تمہیں وحید کا خیال رکھنا ہے۔" حمید احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں رکھ رہی ہوں اور انشاء اللہ رکھوں گی۔"

"اور اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔" حمید احمد نے کہا۔ "اب تم جاؤ میں نہیں چاہتا کہ تم اسے اکیلا چھوڑو۔"

"میں اسے اکیلا چھوڑوں گی بھی نہیں۔" مدیحہ نے کہا اور چلی گئی۔

☆

صبح ہو گئی۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔ وحید ایک بار بھی نہیں جاگا۔ سکون سے سوتا رہا۔ یہ بہت اچھی علامت تھی لیکن حمید احمد جانتے تھے کہ سب سے سخت وقت اب آنے والا ہے جب وحید کو آپریشن تھیٹر لے جایا جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتے رہے۔

پھر بلقیس بیگم آئیں۔ "حمید احمد.... وحید تمہیں بلا رہا ہے۔"

وہ گھبرا گئے۔ "لیکن اماں.... پھر انہوں نے پوچھا۔ "مدیحہ کہاں ہے؟"

"وہیں.... وحید کے پاس۔"

"تو پھر میں کیسے جاؤں اماں؟" انہوں نے بے بسی سے کہا۔

پاگل ہوئے ہو۔ بچہ آپریشن سے پہلے تم سے بات کرنا چاہتا ہے اور تم نجانے کس پھیر میں پڑے ہو۔" بلقیس بیگم نے سخت لہجے میں کہا' پھر لہجہ نرم کر کے بولیں۔ "اچھا میں مدیحہ کو ہٹا دیتی ہوں۔ تم دو منٹ میں آجاؤ۔"

دو منٹ بعد وہ وحید کے کمرے میں گئے تو مدیحہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وحید کے چہرے پر مسکراہٹ اور زندگی دیکھ کر ان کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"ابو.... آپ پریشان نہ ہوں۔" وحید نے کہا۔

"نہیں ہوں گا بیٹے۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

"مجھے آپ سے کچھ مانگنا ہے ابو۔"

"تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو بیٹے۔"

"آپ نے ایک وعدہ کیا تھا مجھ سے۔ وہ پورا نہیں کیا۔"

حمید احمد الجھ گئے۔ "کون سا وعدہ تھا؟"

"آپ نے میرے لئے امی لانے کا وعدہ کیا تھا۔"

حمید احمد کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "بیٹے.... اب تو تمہاری شادی کروں گا میں۔"

"نہیں ابو۔ مجھے امی چاہئے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔"

"مگر میں نے اپنے لئے امی خود تلاش کر لی ہے' بس آپ کو شادی کرنی ہے۔"

"بیٹے.... یہ ممکن نہیں...."

"آپ انکار کر رہے ہیں۔" وحید روہانسا ہو گیا۔

حمید احمد کا دل کٹنے لگا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ وحید نے کسے پسند کیا ہو گا ان کے لئے؟ کیسی عجیب بات ہے۔ اب اس صورت حال میں وہ بیٹے کا دل بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ "اچھا بیٹے' ٹھیک ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ وہ کون ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے ابو۔"

"اچھا بتا دو بیٹے۔"

"وہ ڈاکٹر جبیں ہیں ابو.... میری ہونے والی امی۔ اور وہ بہت اچھی ہیں۔

حمید احمد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "وہ تو تمہارے لئے.... تم اسی سے...."

وحید نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کچھ نہ کہیں ابو۔ میں ان سے اسی حوالے سے محبت کرتا ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں' وہ میری امی سے کتنا ملتی ہیں۔"

حمید احمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بہرحال انہیں یہ یاد آگیا کہ ایک روز انہیں بھی اسی مشابہت کا احساس ہوا تھا۔ "اب تو تم خوش ہو بیٹے۔"

"بہت۔ آپ بھی خوش ہو جائیں۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو میں بھی بہت خوش ہو جاؤں گا.... خوش رہوں گا۔"

وحید نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب میری طرف سے بے فکر ہو جائیں ابو۔ میں انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تو امی کے ساتھ بہت وقت گزارنا ہے' جس کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔ "اللہ مجھے اس سے محروم نہیں کرے گا ابو۔"

حمید احمد کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ انہوں نے بیٹے کو لپٹا لیا۔ اماں مسکرا رہی تھیں۔ انہوں

نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

☆

کسی کا آپریشن ہو رہا ہو..... بے حد خطرناک آپریشن۔ تو اس کے چاہنے والے ہسپتال میں اکٹھے ہوتے ہیں لیکن وہ سب اپنی اپنی جگہ تنہا ہوتے ہیں۔ کسی کا کسی سے رابطہ نہیں ہوتا۔ سب کے دل میں خوف اور ہونٹوں پر دعائیں ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دلاسا دیتے ہیں... حوصلہ بندھاتے ہیں لیکن درحقیقت ہر ایک کا دلاسا اپنے لئے ہی ہوتا ہے۔

آپریشن تھیٹر سے بند دروازے کے پیچھے ایک بے حد نازک آپریشن ہو رہا تھا اور باہر تین افراد موجود تھے۔ تینوں کی دعائیں اور خوف مشترک تھے لیکن ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ کبھی نگاہیں اٹھتی بھی تو ان میں خالی پن ہوتا۔ وہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ تینوں اپنی سوچوں میں تنہا تھے۔ تینوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

ان تینوں کی سوچیں ایک ہی نکتے پر مرتکز تھیں.... وحید کا آپریشن۔ ان کے ذہنوں میں اور کوئی خیال نہیں تھا۔ حمید احمد اور مدیحہ برسوں کی اذیت ناک دوری کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ لیکن مل کر بھی نہیں مل سکے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے بہت کچھ پوچھنا، بہت کچھ کہنا سننا تھا لیکن وہ ایسے حالات میں ملے تھے کہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور انہیں اس وقت اس کا خیال بھی نہیں تھا۔

ایسے جان لیوا انتظار کے تو پانچ منٹ بھی کم نہیں ہوتے۔ جب کہ ان کا انتظار اب تک پانچ گھنٹے پر پھیل چکا تھا۔ بلقیس بیگم میں تو اتنی جان نہیں تھی۔ وہ بینچ پر بیٹھی تھیں اور پہلو بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ حمید احمد اور مدیحہ کو کسی کل چین نہیں تھا۔ وہ اٹھتے، ٹہلتے، پھر . . ے۔ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلتا تو وہ تینوں نگاہوں میں امید اور خوف کی ملی جلی کیفیت لئے دروازے کی طرف دیکھتے لیکن ڈاکٹر کو نہ دیکھ کر نگاہوں میں مایوسی جھلکتی اور وہ نظریں جھکا لیتے۔

اس دوران میں تینوں نے ظہر کی نماز ادا کی تھی!

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر جمشید کو دیکھتے ہی حمید احمد اٹھ کر ان کی طرف لپکے۔ بلقیس بیگم اور مدیحہ سے ہلا بھی نہیں گیا۔

"ڈاکٹر صاحب، میرا بیٹا..." حمید احمد کی آواز بکھرنے لگی۔

"مبارک ہو جناب! آپ لوگوں کی دعائیں رنگ لائیں۔ آپریشن کامیاب رہا ہے۔" ڈاکٹر جمشید نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" حمید احمد نے کہا۔ بلقیس بیگم اور مدیحہ میں بھی طاقت آ گئی۔ وہ اٹھ کر اس طرف لپکیں۔

"لیکن یاد رکھئے گا، رسولی پھر بن سکتی ہے۔" ڈاکٹر جمشید نے کہا۔ "آپ کو بہت محتاط اور چوکنا رہنا ہوگا۔ اس بار بے پروائی نہیں کیجئے گا۔ معمولی سی علامت بھی نظر آئے تو ہم سے رجوع کیجئے گا۔"

"مجھے آپ کا مشورہ یاد رہے گا ڈاکٹر۔"

پہلے ان کی دعائیں مشترک تھیں اور اب سجدۂ شکر مشترک تھا۔ اس کے بعد تنہائی ختم ہو گئی۔ وہ یکجا ہو گئے۔

☆

وہ برسوں کے بچھڑے ہوؤں کے ملن کی رات تھی!

حمید احمد نے دلہن بنی مدیحہ کا گھونگھٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مدیحہ کے مہندی لگے ہاتھ نے انہیں روک دیا۔ "آپ کچھ بھول رہے ہیں جناب۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ رہا تمہارا منہ دکھائی کا تحفہ۔" حمید احمد نے ایک لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"خود دیکھ لینا۔" حمید احمد نے کہا اور اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ پھر وہ سحر زدہ سے اسے دیکھتے رہے۔

مدیحہ نے لفافہ چاک کیا تو اس میں سے ایک اور لفافہ نکلا۔ اس لفافے پر ڈاک خانے کی مہر بھی تھی اور شکستہ تحریر میں کچھ لکھا تھا۔ لفافے پر اس کا نام اور پرانے گھر کا پتہ تھا۔ "یہ تو بے ایمانی ہے آپ کی۔" مدیحہ نے کہا۔ "یہ تو قرض تھا آپ پر۔ یہ منہ دکھائی میں نہیں چلے گا۔"

"لفافے میں کچھ اور بھی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

مدیحہ نے بڑے لفافے کو ٹٹولا۔ اس میں سے ایک لاکٹ برآمد ہوا۔ "شکریہ۔ اب پہنا

بھی دیجئے۔"

حمید احمد اسے لاکٹ پہنانے لگے۔ اس نے دوسرے لفافے کو چاک کر کے خط نکالا اور پڑھا۔ پھر بولی۔ "اتنا مختصر سا خط.... اتنے برسوں کے بعد!"

"مجھے خط لکھنے کا تجربہ تو تھا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھوں۔" حمید احمد نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

"لیکن اتنا بھرپور۔ آپ نے کمال کر دیا۔" مدیحہ نے داد دی۔ "اچھا ہوا' یہ خط مجھے اس وقت نہیں ملا۔ ورنہ میں خوشی سے مر ہی جاتی۔"

حمید احمد متجسس ہو گئے۔ وہ اس خط کو بھول ہی چکے تھے۔ انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ انہوں نے کیا لکھا تھا۔ "مجھے پڑھواؤ۔"

مدیحہ نے خط ان کے آگے کر دیا۔ وہ پڑھنے لگے....

"مدیحہ حامد'

آج میں ہار گیا۔ ایک سچے اور دیانت دار انسان کی حیثیت سے اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ جاب چھوڑ دی ہے اور تمہارے سامنے اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر میں عام سا' ادھیڑ عمر اور بے روزگار شخص ہوں۔ جو بھی ہوں تمہارا ہو گیا۔ اب تم میرے ساتھ جو چاہو کرو۔ ویسے میں کسی اچھے سلوک کا مستحق نہیں ہوں۔"

تمہارا حمید احمد!"

حمید احمد محجوب ہو گئے۔ "اب پھاڑ دو اسے۔"

"جی نہیں۔" مدیحہ نے خط کو چوم لیا۔ "کتنی بڑی بات لکھی آپ نے۔ جو بھی ہوں، میں تمہارا ہو گیا۔" پھر وہ ہنس دی۔ "اب میری مرضی، میں جو چاہوں کروں آپ کے ساتھ۔"

"بے شک، یہ تمہارا حق ہے۔ مگر ایک بات بتا دو۔ یہ تم مدیحہ حامد سے ڈاکٹر جبیں کیسے ہو گئیں؟"

"اوہ۔ میرا پورا نام مدیحہ جبیں ہے۔ میں کالج میں مدیحہ حامد لکھتی تھی۔ لیکن آپ سے تعلق کے حوالے سے مدیحہ حامد مجھے راس نہیں تھا۔ آپ کے نام کے تمام حروف کٹ جاتے تھے۔"

حمید احمد کو کچھ یاد آ گیا۔ "ایک منٹ۔ انہوں نے کہا۔ وہ اٹھ کر گئے اور اپنی دراز سے ایک بہت پرانا کاغذ نکال لائے۔ "اسے دیکھو۔ یہ تم نے ٹیسٹ دیا تھا کبھی۔"

"جی ہاں۔" مدیحہ انہیں سمجھانے لگی۔

"لیکن ڈاکٹر جبیں بن جانے سے کیا ہوا؟" حمید احمد نے حیرت سے کہا۔

"ذرا پین دیجئے۔" پین ملا تو اس نے اسی کاغذ پر دو نام الگ الگ حروف میں لکھے۔

ح م ی د ا ح م د۔ م د ی ح ہ ج ب ی ن۔ "اب دیکھئے۔" اس نے کہا۔ "ہم مشترک حروف کاٹتے ہیں...."

~~ح~~ ~~م~~ ~~ی~~ ~~د~~ ~~ا~~ ح م د ..... ~~م~~ ~~د~~ ~~ی~~ ~~ح~~ ہ ج ب ی ن

"اب گنیں.... HATE LIKE LOVE اور یہ ADORE۔ تو اب آپ مجھے ADORE کرتے ہیں اور میں آپ کو LOVE کرتی ہوں۔"

حمید احمد بہت محظوظ ہوئے۔ "عجیب توہم پرستی ہے.... بچگانہ سی۔"

"جی نہیں۔ آپ نتیجہ دیکھ لیں۔"

"مگر سنو۔ تم تو ADORE سے LOVE پر آ گئیں۔ تمہارا درجہ کم ہو گیا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر اسے چھیڑا۔ "میں نے مان لیا' یہ درست ہے۔"

"مجھے معلوم تھا۔ میرا اختیار تھا۔ میں نے درجہ کم نہیں ہونے دیا۔ مگر آپ کو جیت بھی لیا۔"

"مان گئے بھئی۔"

"اچھا.... اب یہ بتائیں کہ ان تیرہ برسوں میں آپ پر کیا گزری؟"

"اب کوئی بات نہیں ہو گی۔ تیرہ برس کی روداد تیرہ برس میں ہی سناؤں گا۔ فی الحال تو میں شکر کے نفل پڑھوں گا۔"

"وہ تو مجھے بھی پڑھنے ہیں۔"

"تو چلو۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

سہاگ رات شروع ہو گئی تھی۔

(ختم شد)